توجیہ الأخبار فی شرح مشکل الآثار



جلد سوم

مرتبین

طلبۂ شعبۂ تخصص فی الحدیث



اضافات وتنقیحات

قاضی محمد حسن ندوی مدھوبنی

(استاذ حدیث وفقہ: دارالعلوم ماٹلی والا)

حسب حکم وارشاد

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب

(شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا)

کتاب کے متعلق ضروری معلومات

کتاب کا نام	:	توجیہ الأخبار فی شرح مشکل الآثار
مرتبین	:	طلبۂ شعبۂ تخصص فی الحدیث
اضافات وتنقیحات	:	قاضی محمد حسن ندوی مدھوبنی
		(استاذ حدیث وفقہ: دار العلوم ماٹلی والا)
حسب حکم وارشاد	:	حضرت مولانا اقبال صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم
		(مہتمم وشیخ الحدیث دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ)
صفحات	:	٣٠٨
سن طباعت	:	جمادی الثانی ١٤٤٥ھ مطابق جنوری ٢٠٢٤ء

ملنے کا پتہ

مکتبہ: ابوبکر ربیع بن صبیح بصری

دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عیدگاہ روڈ، بھروچ

گجرات، انڈیا۔ ٣٩٢٠٠١

MO.A.Rashid Manubari: 7984541604

Mo.Jakir Parkheti : 9723930541

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین توجیہ الاخبار فی شرح مشکل الآثار (جلد سوم)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین توجیہ الآخبار فی شرح مشکل الآثار (جلد: سوم)

(ابواب کے اعتبار سے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ ''توجیہ الاَخبار شرح مشکل الآثار'' کی تیسری جلد طبع ہوکر آپ کے ہاتھوں میں آچکی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ امام طحاویؒ کی ''شرح مشکل الآثار'' میں حدیثی رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے، خاص طور پر یہ معنی اس کتاب کے ترجمۃ الباب، حدیث الباب اور ہر باب میں ''**قال أبو جعفر**'' سے اور زیادہ آشکارہ ہوتا ہے، اس پہلو سے توجیہ الاَخبار کی پہلی جلد میں حضرت مولانا مفتی اقبال صاحب دامت برکاتہم (مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم ماٹلی والا) کے مقدمہ میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

لیکن یاد رہے کہ امام طحاویؒ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو تفسیری خدمات ہے، جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان میں اس پہلو پر بہت کچھ نہیں لکھا گیا ہے، تو مبالغہ نہیں ہوگا، اس بنا پر میرے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس کتاب کے شروع میں ان کی تفسیری خدمات ونکات کو اجاگر کروں کہ شرح مشکل الآثار میں امام طحاویؒ نے نہ صرف قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں مشکل الفاظ حدیث کے معنی کی توضیح کی ہے؛ بلکہ کتاب سے مراجعت اور استفادہ کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک ہزار دو (۱۰۰۲) ابواب میں سے بیاسی (۸۲) ابواب میں مشکل آیات کو ترجمۃ الباب بنایا ہے، شیخ شعیب ارناؤوط کے نسخہ کے اعتبار سے ہر جلد میں کچھ ابواب آیات قرآنیہ سے متعلق ہیں، (جس کی تفصیل اس طرح ہے: جلد اول میں گیارہ ابواب، ثانی میں چار، تیسری جلد میں گیارہ، چوتھی میں سات، پانچویں میں پانچ، چھٹی میں چار، ساتویں میں ایک، آٹھویں میں چھ، نویں میں دو، اور دسویں میں چار، گیارہویں میں چار، بارہویں میں چھ، تیرہویں میں پانچ، اور چودہویں میں نو، پندرہویں میں تین، ابواب ہیں۔

اس مناسبت سے ذیل میں امام طحاویؒ کی تفسیری خدمات پر روشنی ڈالی جارہی ہے، تاکہ اہل علم، مخصصین کو حدیثی، فقہی خدمات کی طرح تفسیری کارناموں سے استفادہ کا موقع ملے۔

یقیناً امام ابوجعفر الطحاویؒ کی شخصیت کثیر الجہات خوبیوں کی حامل تھی، جامع الکمالات تھے، علم وفضل میں وہ یکتائے زمانہ تھے، وہ بیک وقت محدث، فقیہ اور ایک بہترین مفسر بھی تھے، سب سے بڑھ کر ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے، جہاں آپ حدیث وفقہ کے شہہ سوار تھے، وہیں مشکلات القرآن کی تفسیر وتاویل میں یکتائے روزگار تھے، جس طرح فن حدیث میں آپ کی کتاب شرح معانی الآثار اور شرح مشکل الآثار، مشکل احادیث کی تشریح میں اور مختلف الحدیث کی تطبیق وترجیح میں شاندار اور شاہکار ہیں، تو وہیں شرح مشکل الآثار کے ہر باب کے تحت الفاظ حدیث کی توجیہ میں آیات قرآنیہ سے استشہاد، اور آیات قرآنیہ کی تفسیر کے لئے احادیث کی روشنی میں شان نزول پیش کرنا امام طحاویؒ کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔

اسی بنا پر آپ کو جہاں محدثین حافظ اور امام گردانتے ہیں، فقہاء مجتہد منتسب تو وہیں مفسرین آپ کو اہل تفسیر کے زُمرے میں شامل کرتے ہیں، اس کے علاوہ آپ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، یہاں طوالت سے بچتے ہوئے صرف دو محققین کی رائے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

شیخ شعیب ارناؤوط امام طحاوی کی تفسیری خدمات بالخصوص مشکلات القرآن کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

امام طحاویؒ قرآن کریم کے حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے احکام ومعانی کے بھی حافظ تھے، قرآن پاک اور احادیث نبویہ سے احکام ومسائل کے استنباط میں ان کا کوئی ثانی نہیں

تھا، اسی طرح صحابہ کرام ،تابعین عظام سے آیات کی تفسیر اور سبب نزول سے متعلق آثار وروایات پر امام طحاوی کو بڑی دسترس حاصل تھی، سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ احادیث نبویہ کی طرح ناسخ ومنسوخ آیات کا تفریق وامتیاز میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

كان الطحاوى حافظا لكتاب الله عارفا بأحكامه ومعانيه، وبما اثر عن الصحابة والتابعين من تفسير آية واسباب نزوله، له ثقافة ممتازة بعلم القراءات۔۔۔۔ ويميز الفروق الدقيقة بين الروايات ويدون ذلك فى مصنفاته. (شرح مشكل الآثار: ۱/ ۵۵، ۵٦)

اسی طرح شیخ مصباح اللہ الباقی نے اپنی کتاب "**الامام ابو جعفر الطحاوى واثره فى نقد الحديث**" میں امام طحاویؒ کی علمی تصنیفی کاوشوں پر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی مختصر ہے، لیکن جامع ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ آپ ایک عظیم زبردست مفسر تھے، اس بنا پر اہل طبقات نے مفسرین کے زمرے میں شامل کیا ہے، بالخصوص تفسیر کی تصنیف میں آپ کا اسلوب اپنے معاصرین کے اسلوب سے زیادہ مشابہ تھا، یعنی امام ابن جریر طبریؒ، اور ابن ابی حاتمؒ کی تفسیر کا نہج آپ کی تفسیر میں نمایاں ہے، اس کے علاوہ آپ کی تفسیر کی انفرادی خصوصیات یہ ہے کہ آپ سلف کے اقوال کو جمع کرنے کے بعد ایک مفسر کے قول کو دوسرے مفسرین کے اقوال پر ترجیح دیتے ہیں۔

كان الامام الطحاوى مفسرا عظيما ، ذكره اهل الطبقة فى طبقات المفسرين وكان المنهج المسائد فى تلك الفترة هو التفسير بالمأثور وجميع الروايات المتعلقة بالآية المطلوب تفسيرها كما هو واضح من منهج تفسير ابن جرير الطبرى وابن ابى حاتم ۔۔۔۔ الخ۔۔ (الامام ابو جعفر الطحاوى واثره فى نقد الحديث : ۱/ ٦۱، ط: دار الإسلام)

احکام القرآن:

یہ فن تفسیر میں امام طحاوی کی بہت منفرد کتاب ہے، گرچہ شیخ ارناؤوط اور شیخ مصباح کی تحقیق سے یہ بات عیاں ہوئی کہ آپ نہ صرف ایک عظیم محدث، اور بے بدل فقیہ تھے، بلکہ ایک عظیم مفسر بھی تھے، اس کی شاندار مثال آپ کی تحریر کردہ تفسیر (احکام القرآن) ہے؛ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب اب تک زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر نہیں آسکی ہے، بلکہ مخطوطہ کی شکل میں ترکی کے ایک کتب خانہ میں محفوظ ہے، جبکہ قاضی عیاضؒ نے اپنی کتاب (اکمال) میں لکھا ہے کہ فن تفسیر میں امام طحاوی کے ہزاروں اوراق ہیں، جس کا ایک حصہ سورہ انفال ہے، جس کی طباعت آٹھویں صدی ہجری میں ہوئی، اور وہ اس وقت اسکندریہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (مستفاد شرح مشکل الآثار: ۱/۹۱)

اس کے علاوہ صاحب تاج التر جمہ شیخ ابن قطلو بغا کا نظریہ یہ ہے کہ فن تفسیر میں امام طحاویؒ کی دو کتابیں ہیں، احکام القرآن، دوسری تفسیر القرآن، دونوں آپ کی مستقل کتاب ہیں۔

اما تفسیر القرآن واحکام القرآن فهما کتابان مستقلان کما یظهر من کلام ابن قطلوبغا... (شرح مشکل الآثار: ۱/۶۳)

احکام القرآن کا منہج:

اس سلسلہ میں اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ اس تفسیر میں امام ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم کے اسلوب اور نہج کا عنصر غالب ہے، البتہ شیخ ارناؤوط نے دکتور فاضل عبداللہ نذیر احمد کی کتاب ''ابو جعفر الطحاوی المحدث الفقیه'' کے حوالہ سے کچھ باتیں ذکر کی ہیں، جو ان کی تفسیر کو معاصرین کی تفسیر سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) کتاب کی ترتیب اور ابواب کے قیام میں آیات کے موضوع کا لحاظ کیا گیا ہے، مثلاً جب امام صاحب نے کتاب الطہارۃ کا عنوان قائم کیا ہے تو اس سے متعلق پوری قرآن پاک میں جو آیات ہیں، سبھوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے، پارہ اور سورہ کا خیال نہیں کیا ہے۔

(۲) آیات کی تفسیر و تاویل کے ساتھ ساتھ مسائل کا بھی استنباط کیا ہے۔

(۳) تفسیر قرآن کریم میں عرف و عادت کا خاص خیال رکھا ہے۔

(۴) آیات کی تفسیر کے لئے صحابہ اور تابعین کے اسی قول کو امام طحاوی ماٴخذ بناتے ہیں، جو قرآن کریم سے زیادہ موافق ہو۔

(۵) اگر کسی آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں صحابہ اور تابعین دونوں سے روایت ہوتی ہے تو آپ صحابہ کی تفسیر کو تابعی کی تفسیر پر ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ سورہ اسراء آیت:۵۸ ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ۝﴾ کے شان نزول کے تحت حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے ایک روایت ہے کہ بعض لوگ کچھ جنوں کی پوجا کرتے تھے، تو وہ جن مسلمان ہوگئے، مگر یہ اپنے شرک پر قائم رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان ہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔

روایة عن ابن مسعود بسنده أنه قال: کان نفر من الانس یعبدون نفرا من الجن فاسلم الجنیون، وثبت الانسیون علی عبادتهم هم الذین قال الله تعالیٰ فیهم.

(الامام ابو جعفر الطحاوی وأثره فی نقد الحدیث: ص: ۶۲)

دوسری روایت حضرت مجاہدؒ سے ہے جس میں ''یبتغون الی ربهم الوسیلة'' کا فاعل

حضرت عیسی ،حضرت عزیر علیہم السلام اور ملائکہ کو تسلیم کیا ہے،اس اعتبار سے دونوں روایتوں میں اختلاف ہے۔

ثم نقل عن مجاهد بسنده انه قال: "يبتغون الى ربهم الوسيلة عيسى وعزير والملائكة عليهم السلام".

لیکن مذکورہ دونوں روایتوں میں امام طحاوی نے اپنے اصول کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کو حضرت مجاہدؒ کی روایت پر ترجیح دی ہے۔

ثم رجح الامام الطحاوی ماقاله ابن مسعود فی ذلك علی ما قاله مجاهد فيه لمكانته من رسول الله. (حواله سابقه: ۶۲)

متشابہ آیات اور امام طحاویؒ کا نقطۂ نظر:

یہ بات مسلّم ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو طرح کی ہیں، محکم اور متشابہ، اور محکم وہ آیات ہیں جن کا معنی واضح ہے اور تفسیر وتاویل میں اتفاق ہے، اور زیادہ تر آیات محکم ہیں، جہاں تک متشابہ آیات کے معنی کا تعلق ہے، تو جمہور کی رائے یہی ہے کہ اس کا معنی صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ (آل عمران:۷)

لیکن امام طحاویؒ کا نقطہ نظر اس سلسلہ میں بالکل منفرد ہے، چنانچہ ان کی رائے یہ ہے کہ متشابہ آیات کی تاویل وتوجیہ محکم آیات کی روشنی میں کی جائے گی، اور اس کے لئے تگ ودو کی جائے گی، اگر عمل کا پہلو واضح ہو جائے گا تو اس پر عمل محکم آیات کی طرح واجب اور ضروری ہوگا، ہاں! اگر اس کا معنی واضح نہیں ہوسکا، تو اس پر صرف ایمان لانا ضروری ہوگا، ظن وگمان کا استعمال درست نہیں ہوگا، بلکہ متشابہ آیات کو اللہ تعالیٰ کے علم پر موقوف رکھیں گے، جیسا کہ شیخ مصباح اللہ

عبدالباقی نے اس کی صراحت کی ہے:

وكان يرى أن المتشابهات هي الآيات المختلف في تاويلها، والآيات المحكمات هن المتفق على تاويلها، ويلتمس تاويل المتشابهات من المحكمات وذكر أحاديث في تفسير قوله تعالى ﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾(آل عمران:۷) فهكذا يكون اهل الحق في المتشابه من القرآن يردونه الى عالمه وهو الله ثم يلتمسون تاويله من المحكمات، فإن وجدوه فيه عملوا له كما يعملون بالمحكمات، ولم يجدوه فيها لنصر علومهم عنه لم يتجاوزوا في ذلك الايمان به وردوا حقيقته الى الله ولم يستعملو في ذلك الظنون. (الامام ابوجعفر الطحاوي واثره في نقد الحديث، مطبع :دارالسلام : ص:۶۳)

بہر حال پہلی اور دوسری جلد کی طرح تیسری جلد میں درجہ ذیل باتیں زیر بحث لائی گئی ہیں۔

[۱] ترجمہ باب اور باب کی پہلی حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے ابتداء میں مختصراً اردو میں تمہیدی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے، تاکہ ترجمہ باب اور حدیث کی غرض اور خلاصہ واضح ہو جائے۔

[۲] ہر باب میں ''قال ابوجعفر'' سے مصنف کی غرض اور مقصد کو نمایاں کیا گیا ہے، اور دو روایتوں میں جو تعارض یا اشکال ہے، دونوں کی وضاحت کی گئی ہے پھر ''فکان جوابنا، فقیل له'' کے ذریعہ امام طحاوی نے جو اس کا جواب دیا ہے، اسے قلم بند کیا گیا ہے۔

[۳] امام طحاوی کی تطبیق اور جمع کی صورت قلم بند کرنے کے بعد دیگر محدثین کی

رائے مع حوالہ ذکر کی گئی ہے۔

[۴]　عام طور پر دیگر محدثین کے وہی اقوال پیش کئے گئے ہیں، جو امام طحاوی کی رائے کے مخالف ہیں۔

[۵]　بعض ابواب کی احادیث میں نہ کوئی تعارض ہے اور نہ کوئی اشکال، تو وہاں نفس مسئلہ کو ترجمۃ الباب اور حدیث الباب کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

[۶]　کتاب کے آغاز میں دو فہرست دی گئی ہیں، پہلی امام طحاویؒ کی کتاب ''شرح مشکل الآثار'' کے مطابق ہے؛ لیکن دوسری فہرست سہولت و آسانی کے لیے ابواب کے مطابق دی گئی ہے۔

کلمات تشکر:

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر دار العلوم ھٰذا کے باوقار مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا و مفتی اقبال صاحب ٹنکاروی کا شکریہ نہ ادا کروں، جنہوں نے میری کم علمی اور بے بضاعتی کے باوجود طلبہ تخصص فی الحدیث کے ذریعہ امام طحاویؒ کی شہرہ آفاق کتاب ''شرح مشکل الآثار'' کا اردو میں خلاصہ کرنے کا حکم دیا، اتنا ہی نہیں بلکہ آنجناب اپنی مصروفیات کے باوجود مفید مشورے اور رہنمائی کے ساتھ ساتھ مسودہ کو دیکھا، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کے علم و ہنر میں خوب خوب برکت عطا کرے، اور آپ کے سایہ کو تادیر قائم رکھے، آمین۔

اسی طرح تخصص فی الحدیث دار العلوم ماٹلی والا کے استاذ حضرت مولانا عبد اللہ صاحب لاجپوری اور ان طلبہ کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں بالخصوص مولوی ذیشان میواتی جنہوں نے

راقم کی نگرانی میں اس کتاب پر کام کیا، اور اس کتاب کی تصحیح اور حوالہ جات کی تلاش و تحقیق میں ہماری مدد کی، اور حدیثی ذوق کا ثبوت دیا، اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں مزید ترقیات سے ہمکنار کرے، آمین۔

اسی طرح مولوی یوسف صاحب (سُند راوی) کا بھی ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے حضرت مہتمم صاحب کے ایما پر پوری کتاب کی کمپوزنگ اور سیٹنگ کی، نوک و پلک کو سنوار کر کتاب کو مہذب و منقح کیا، اللہ تعالیٰ موصوف کو اجر جزیل عطا کرے، آمین۔

اخیر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو قبول فرما کر عوام وخواص کے لئے نفع بخش بنائے اور اس خدمت کو راقم اور والدین اور اساتذہ کے لئے صدقۂ جاریہ اور نجات اخروی کا ذریعہ بنائے آمین۔

محمد حسن ندوی مدھوبنی
استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ماٹلی والا، بھروچ، گجرات

❁❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب:۱۴۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ حَدِيثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي تَرْكِهِ أَخْذَ مِيرَاثِ مَوْلَاهُ الَّذِي سَقَطَ مِنْ نَخْلَةٍ فَمَاتَ فَأَمَرَهُ بِدَفْعِ مِيرَاثِهِ إِلَى أَهْلِ قَرْيَتِهِ.

﴿لاوارث کے مال کا مصرف﴾

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ مَوْلًى لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُوُفِّيَ فَقَالَ: "هَاهُنَا أَحَدٌ مِنْ أَهْلِ قَرْيَتِهِ "فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ". (شرح مشكل الآثار: ۵/۳، ورواه الطيالسي: (۱۴۶۵)، وأحمد: (۱۷۴/۶-۱۷۵) وابوداود: (۲۹۰۲) والترمذي: (۲۱۰۵) والبيهقي: (۲۴۳/۶) وابن ماجه: (۲۷۳۳)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام میں علم فرائض کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اسے نہ صرف ایک فن کا درجہ حاصل ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم کو نصف علم قرار دیا ہے، **"تعلموا الفرائض وعلموه فانه نصف العلم"** (سنن ابن ماجه: رقم الحديث: ۲۷۱۹) رقم: ۲۷۱۹) علم فرائض کو سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیوں کہ وہ نصف علم ہے)، انسان کی دو حالتیں ہیں، ایک حیات، دوسری موت، علم میراث کے علاوہ جتنے علوم ہیں، ان کی ضرورت اس کی حیات میں پیش آتی ہے، اور علم فرائض وہ علم ہے جس کی ضرورت مرنے کے بعد پڑتی ہے، اس لحاظ سے اس حدیث میں اس علم کو دیگر علوم کی بہ نسبت آدھا علم قرار دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآن مجید سورۂ نساء کی کئی آیات میں اس کے اصول وضوابط اجمالاً بیان کئے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث شریف میں پوری وضاحت کی ہے، پھر فقہاء نے اسباب ارث کو واضح کیا ہے کہ مجموعی اعتبار سے اسباب ارث تین ہیں، قرابت، زوجیت اور ولاء، چوں کہ حدیث الباب کا تعلق ولاء سے ہے، اس لئے اس کی وضاحت یہاں پیش کی جارہی ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آزاد شدہ غلام کے وصال کے بعد اگر اس کا کوئی نسبی وارث نہیں ہے، تو اس کا مولیٰ وارث ہوتا ہے، لیکن اگر مورث کا مولیٰ نبی ہو تو نبی وارث نہیں ہوگا؛ بلکہ اس کا مال اس کے قریبی رشتہ دار کے حوالہ کردیا جائے گا، اس لئے کہ نبی نہ کسی کے مال کا وارث ہوتا ہے نہ کسی کو وارث بناتا ہے، **إن الأنبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما، ورثوا العلم.** (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۱، ابوداود شریف: ۲/۵۱۳، حدیث نمبر: ۳۶۴۱) اس لئے حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد شدہ غلام کے وصال کے بعد پوچھا "**هاهنا أحد من أهل قريته**" اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہے؟ لیکن جب اس کا کوئی سراغ نہیں لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی جائداد اس کے گاؤں والوں کو دینے کا حکم فرمایا۔

اشکال:

جیسا کہ حدیث الباب میں اس بات کا تذکرہ آیا کہ مورث (آزاد شدہ غلام) کے وارث حقیقی (مولی العتاقہ ہونے کی وجہ سے) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حصہ نہیں لیا، بل کہ مورث کی جائداد کو اس کے گاؤں والوں میں تقسیم کردیا، سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حصہ کیوں نہیں لیا؟

فَقَالَ قَائِلٌ: مَا كَانَ مَعْنَى تَرْكِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِيرَاثَ هَذَا الْمُتَوَفَّى وَهُوَ مَوْلَاهُ الَّذِي مِنْ سَبَبِهِ وُجُوبُ مِيرَاثِ مَوْلَى النِّعْمَةِ وَدَفْعُهُ إِلَى أَهْلِ الْمَدِينَةِ الَّذِينَ لَيْسُوا

مِنْ مِيرَاثِهِ فِي شَيْءٍ؟. (شرح مشکل الآثار:۹/۳)

جواب:

امام طحاویؒ نے اولاً دو باتیں ذکر کی ہیں، ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عزت وشرافت کے بلند مقام پر فائز کیا ہے، وہیں دوسری طرف اعلیٰ اخلاق فاضلہ اور صفات حمیدہ سے بھی متصف فرمایا ہے، قرآن مجید میں بھی اس کی عکاسی کی گئی ہے۔

"وانّك لَعَلى خُلُق عَظِيم" (قلم:۴) یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجہ پر ہو) دوسری بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ان باتوں سے منزہ فرمایا جو رغبت فی الدنیا پر دال ہوں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مورث کے مال میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ ان کی جائداد ان کے گاؤں والوں میں تقسیم کردی۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقٍ مِنَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ: أَنَّ اللهَ تَعَالَى شَرَّفَهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَفَعَ مَنْزِلَتَهُ، وَجَعَلَهُ فِي أَعْلَى مَرَاتِبِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَأَخْرَجَهُ مِنْ أَخْلَاقِ مَنْ سِوَاهُ مِنْ أَهْلِ الرَّغْبَةِ فِي الدُّنْيَا وَكَانَ فِيمَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ: ﴿كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ فَوَصَفَهُمْ بِذَلِكَ بِأَخْلَاقٍ لَا يَحْمَدُهَا، وَجَعَلَهُمْ بِذَلِكَ فِي مَنْزِلَةٍ سُفْلَى، وَأَخْرَجَهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ ذَلِكَ إِلَى أَرْفَعِ الْمَنَازِلِ وَجَعَلَ حُكْمَهُ مِمَّا أَخْرَجَهُ إِلَيْهِ أَعْلَى الْأَحْكَامِ، فَلَمْ يَجْعَلْهُ مِمَّنْ يَرِثُ مَنْ سِوَاهُ مِنْ ذِي نَسَبٍ، وَلَا ذِي وَلَاءٍ، وَلَا مِنْ ذَوَاتِ تَزْوِيجٍ، وَخَالَفَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ سَائِرِ أُمَّتِهِ فِي ذَلِكَ زِيَادَةً فِي فَضْلِهِ، وَفِي تَشْرِيفِهِ إِيَّاهُ وَفِي رِفْعَةِ مَنْزِلَتِهِ فِيهِ فَأَمَرَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذَلِكَ فِي مِيرَاثِ مَوْلَاهُ الَّذِي ذُكِرَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ لَمَّا لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَلَا حَمِيمٌ يَسْتَحِقُّ مِيرَاثَهُ أَنْ يُدْفَعَ مِيرَاثُهُ إِلَى أَهْلِ قَرْيَتِهِ كَمَا يَكُونُ لِلْأَئِمَّةِ فِي الْأَمْوَالِ الَّتِي لَا مَالِكَ لَهَا

أَنْ تُدْفَعَ إِلَى مَنْ يَرَوْنَ دَفْعَهَا إِلَيْهِ مِنَ النَّاسِ. (شرح مشکل الآثار:۳/۹)

اشکال:

امام طحاویؒ کے سابقہ جواب پر اعتراض ہوتا ہے کہ انبیاء میں سے بعض نبی وارث ہوئے ہیں، اور انہوں نے دوسروں کو وارث بنایا ہے، مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے وارث کی درخواست کی، جیسا کہ سورۂ مریم میں ہے ﴿ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا○ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ﴾ (مریم:۶-۵) اے اللہ! ایسا ولی عطا فرما جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے، (بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی درخوست قبول کر کے یحییٰ علیہ السلام کو عطا کیا۔)

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: فَقَدْ كَانَ أَنبياء اللّٰهُ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ يَرِثُونَ وَيُورَثُونَ، مِنْ ذَلِكَ مَا حَكَى عَزَّ وَجَلَّ فِي كِتَابِهِ عَنْ نَبِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَرِيَّا مِنْ سُؤَالِهِ إِيَّاهُ أَنْ يَهَبَ لَهُ مِنْ لَدُنْهُ وَلِيًّا يَرِثُهُ وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنْ يَجْعَلَهُ نَبِيًّا وَمِنْ أَهْلِ إِجَابَتِهِ عَزَّ وَجَلَّ إِيَّاهُ إِلَى ذَلِكَ وَهِبَتِهِ لَهُ يَحْيَى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِصْلَاحِهِ لَهُ زَوْجَهُ.

(شرح مشکل الآثار:۳/۱۰)

جواب:

امام طحاویؒ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ حصرت زکریا علیہ السلام نے اپنی دعا میں جس چیز کے لئے وارث کا سوال کیا ہے وہ مال ودولت کے قبیل سے نہیں ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کے پاس زیادہ مال نہیں تھا، آپ تو زاہد تھے، اور بڑھئی تھے، اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں مذکور ہے:

"كَانَ زَكَرِيَّا عَلَيْهِ السَّلَامُ نَجَّارًا." (شرح مشکل الآثار:۱۰/۳)

اس لئے یہ بات واضح ہوئی کہ انہوں نے دعا میں جس چیز کے وارث بنانے کا سوال کیا وہ چیز مال کے علاوہ اور کوئی چیز تھی، اور وہ چیز نبوت ہے، جیسے انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کو وارث بنانے کی بھی درخواست کی ہے، اور آل یعقوب کی وراثت وہ دعوت اور تعلیم وتعلم کا کام ہے، اور نبوت کا کام ہے، اسی طرح تمام انبیاء علیہ السلام کی حالت ہے کہ وہ درہم ودینار کے وارث نہیں بنائے، ہاں! وہ علم کے وارث بنائے جیسا کہ حضرت ابو درداءؓ کی روایت میں ہے:

"إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَوَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ". (شرح مشکل الآثار:۱۱/۳)

(یقیناً علماء انبیاء کے وارث ہیں اور وہ دینار ودرہم کے وارث نہیں بناتے، ہاں! البتہ وہ علم کے وارث بناتے ہیں۔)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَلَمَّا كَانَ نَجَّارًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنْ ذَوِي الْأَمْوَالِ، عَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ الَّذِي سَأَلَ رَبَّهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يَرِثَهُ عَنْهُ مَنْ يَهَبُ لَهُ غَيْرَ الْأَمْوَالِ وَهِيَ النُّبُوَّةُ كَمَثَلِ الَّذِي سَأَلَهُ أَنْ يَرِثَهُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَذَلِكَ سَائِرُ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ فَلَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ. (شرح مشکل الآثار:۱۰/۳)

اشکال:

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ (النمل:۱۶) یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داوٗد علیہ السلام کے وارث ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوئے ہیں، اور انبیاء دوسروں کو وارث بناتے بھی ہیں

جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے۔

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾، فَإِنَّ ذٰلِكَ عِنْدَنَا - وَاللّٰهُ أَعْلَمُ - هُوَ مَا كَانَتِ الْأَنْبِيَاءُ تُوَرِّثُهُ مِمَّا هُوَ سِوَى الْأَمْوَالِ. (شرح مشکل الآثار:۱۲/۳)

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام مال کے وارث نہیں ہوئے؛ بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی حکمت اور علم کے وارث ہوئے۔

قِيلَ لَهُ: وَرِثَ عَنْهُ حِكْمَتَهُ وَمَا يُورَثُ عَنْ مِثْلِهِ، وَكَانَ ذٰلِكَ مُضَافًا إِلَى نُبُوَّتِهِ الَّتِي كَانَتْ مَعَهُ قَبْلَ ذٰلِكَ. (شرح مشکل الآثار:۱۲/۳)

سوال:

کوئی یہ کہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے والدین کے وارث بنے ہیں، جیسے گھر، اور باندی ام ایمن اور غلام شقران ان کے جن کو موالات کے ذریعہ آزاد کیا تھا، ان سب کے آپ وارث ہوئے۔

فَإِنْ قَالَ: فَقَدْ وَرِثَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَوَيْهِ، فَوَرِثَ عَنْ أَبِيهِ مَنْزِلَهُ وَمَمْلُوكَتَهُ أُمَّ أَيْمَنَ وَشُقْرَانَ اللَّذَيْنِ أَعْتَقَهُمَا مَوْلَيَيْنِ لَهُ. (شرح مشکل الآثار:۱۲/۳)

جواب:

یہ معاملہ اس وقت کا ہے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت نہیں ملی تھی، نبوت ملنے کے بعد نہ آپ کسی کے مال کے وارث ہوئے ہیں اور نہ مورث۔

قِيلَ لَهُ: إِنَّمَا كَانَ ذَلِكَ قَبْلَ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ النُّبُوَّةَ فَلَمَّا آتَاهُ إِيَّاهَا أَعَادَ أَحْكَامَهُ إِلَى الْأَحْكَامِ الَّتِي تَوَفَّاهُ عَلَيْهَا مِنْ مَنْعِهِ الْمِيرَاثَ عَنْ غَيْرِهِ، وَمِنْ مَنْعِ غَيْرِهِ الْمِيرَاثَ عَنْهُ، وَإِنَّمَا يَرِثُ النَّاسُ مِنْ حَيْثُ يَرِثُونَ، فَإِذَا كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرَ مَوْرُوثٍ كَانَ غَيْرَ وَارِثٍ.
(شرح مشکل الآثار:۱۲/۳)

اقوال المحدثین:

(۱) ملا علی قاریؒ نے قاضی عیاضؒ کے حوالہ سے لکھا ہے: انبیاء نہ کسی کے وارث بنتے ہیں اور نہ وہ کسی کو وارث بناتے، اس لئے مولیٰ کے وصال کے بعد مال گاؤں والوں کو بطور صدقہ کے دینے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا، کیونکہ وہ مال بیت المال کا تھا، اور اس کا مصرف مصالح المسلمین ہے۔

وقال القاضی: إنما أمر أن يعطى رجلا من قريته تصدقا منه أو ترفعا أو لأنه كان لبيت المال ومصرفه مصالح المسلمين وسدحاجاتهم فوضعهم فيهم لما رأى من المصلحة، فإن الأنبياء كما لا يورث عنهم لا يرثون عن غيرهم. (المرقات المفاتیح:۲۱۷/۶)

(۲) البتہ بعض شراح حدیث نے ایک دوسری وجہ تحریر کی ہے کہ انبیاء کا مقام ومرتبہ سب سے عالی اور برتر ہے، اس لئے ان کا مال کا وارث بننا اور اس میں مشغول ہونا ان کے مقام عالی کے خلاف ہے، اس لئے انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ کسی کو وارث بناتے ہیں۔

وقال بعض الشراح: الأنبياء عليهم الصَّلوة والسَّلام لا يرثون ولا يورث عنهم لارتفاع قدرهم عن التلبس بالدنيا الدَّنِيَّة وانقطاع أسبابهم عنها. (المرقات المفاتیح:۲۱۷/۶)

(۳) صاحب تحفۃ الأحوذی مولانا عبدالرحمن مبارکپوریؒ ابن الملک کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ انبیاء کو درہم ودینار کا وارث اس لئے نہیں بناتے کہ دنیا فانی ہے، اس میں کوئی بقا نہیں،

ہاں! بقدر ضرورت لیتے ہیں، اسی طرح وہ کسی کو وارث بھی نہیں بناتے تا کہ کسی کے دل میں یہ وہم پیدا نہ ہو کہ مال اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ ان کے بعد اپنی اولاد کو وارث بنائیں گے۔

قاله ابن الملك: (لم يورثوا) بالتشديد من التوريث (دينارا) ولا (درهما) أى شيئاً من الدنيا وخُصّا لأنهما أغلب أنواعها وذلك إشارة الى زوال الدنيا وانهم لم يأخذوا منها الا بقدر ضرورتهم فلم يورثوا شيئا منها لئلا يتوهم انهم كانوا يطلبون شيئا منها يورث عنهم. (تحفة الأحوذی: ج۷، ص:۳۷۶، کتاب العلم، حدیث نمبر: ۲۶۸۲)

یہی بات محدث کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بھی لکھی ہے:

وانّ الانبياء لم يورثوا (من التوريث) دينارا ولا درهما، أى شيئا من الدنيا، لئلا يتوهم أنهم كانوا يطلبون شيئا منها يورث عنهم. (بذل المجهود: ج ۱۱، ص:۳۷۶، كتاب العلم، حديث: ۳۶۴۱)

ترجیح اور وجہ ترجیح:

انبیاء علیہم السلام نہ کسی کو وارث بناتے ہیں اور نہ مورث، اس تعلق سے جو وجہیں محدثین کے اقوال اور آراء کی روشنی میں اوپر ذکر کی گئی ہیں ان میں سے دوسری وجہ راقم کے نزدیک زیادہ راجح ہے، اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ نبی کی شان شرافت، عزت و رفعت میں نرالی ہے، ان کا دل اخلاق رزیلہ سے پاکیزہ و منزہ ہوتا ہے، نیز دنیا اور دنیا کی نعمتوں سے مستغنی بھی، اس لئے وہ نہ کسی کو وارث بناتے ہیں اور نہ مورث، جیسا کہ امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے۔

أَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى شَرَّفَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَفَعَ مَنْزِلَتَهُ، وَجَعَلَهُ فِي أَعْلَى مَرَاتِبِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَأَخْرَجَهُ مِنْ أَخْلَاقِ مَنْ سِوَاهُ مِنْ أَهْلِ الرَّغْبَةِ فِي الدُّنْيَا. (شرح مشكل الآثار: ۳/۹)

باب:۱۵۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: ”مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ أَهْلِي وَنَفَقَةِ عَامِلِي فَهُوَ صَدَقَةٌ“

﴿حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ترکہ کا بیان﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”لَا تَقْسِمُ وَرَثَتِي دِينَارًا، مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ أَهْلِي وَمُؤْنَةِ عَامِلِي فَهُوَ صَدَقَةٌ“. (شرح مشکل الآثار: ۱۳/۳، وأخرجه البخاری (۲۷۷۶) ومسلم (۱۷۰۶) وأبو داود: (۲۹۷۴) والبیهقی: (۳۰۲/۶)

خلاصۃ الحدیث:

یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ حقوق العباد کو حقوق اللہ پر نہ صرف ترجیح حاصل ہے بلکہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی پر بڑی وعید آئی ہے، مورث کے مال میں اس کے وارثان کو قرابت کے اعتبار سے حصہ دینا اور بیوی بچوں کی کفالت کے لئے ماہانہ نفقہ دینا حقوق العباد کی ادائیگی کے قبیل سے ہے، اس لئے وارث ہونے کے جو اسباب ہیں وہی نفقہ کے اسباب ہیں، یعنی قرابت، زوجیت اور ولاء، یہ تینوں میراث کے اسباب ہیں، اسی طرح نفقہ کے وجوب کے بھی یہی اسباب ہیں،- یہاں یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نفقہ میں پہلے روٹی، کپڑا اور مکان کا شمار ہوتا تھا، اب نفقہ میں خاصی وسعت آ چکی ہے، علاج اور تعلیم بھی اس میں شامل ہے، بل کہ اس میں والدین کا نفقہ اور قریبی رشتہ داروں کا بھی نفقہ ہے، یہاں تک کہ شریعت میں جانوروں کے نفقہ کا بھی ذکر ملتا ہے، بہر حال حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امہات المؤمنین سے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ میری موت کے بعد ازواج مطہرات اور خلیفۃ المسلمین کے خرچ کے بعد جو بھی مال بچے وہ صدقہ ہے اور میرے مال میں سے ایک دینار بھی کسی کو نہ دیا جائے۔

سوال:

حدیث الباب میں "ما ترکت بعد نفقة أھلی" میں "أھلی" سے امہات المومنین مراد ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد ان سے رشتہ نکاح منقطع ہوگیا، اور جب رشتہ زوجیت منقطع ہوگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد ان پر انفاق اور خرچہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ وہ انقطاع زوجیت کے بعد شوہر کے ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے۔

فَسَأَلَ سَائِلٌ عَنْ مَعْنَى قَوْلِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ أَهْلِي وَمُؤْنَةِ عَامِلِي فَهُوَ صَدَقَةٌ قَالَ: وَأَهْلُهُ الْمُرَادُونَ هَاهُنَا هُنَّ أَزْوَاجُهُ، وَالتَّزْوِيجُ الَّذِي بَيْنَهُ وَبَيْنَهُنَّ يَنْقَطِعُ عَنْهُنَّ بِوَفَاتِهِ فَمَا مَعْنَى النَّفَقَةِ عَلَيْهِنَّ؟. (شرح مشکل الآثار:۱۴/۳)

جواب:

یہ بات تمام کے نزدیک مسلّم ہے کہ بہت سے امور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں، اس بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد گرچہ ازواج مطہرات سے رشتہ نکاح منقطع ہوجاتا ہے؛ لیکن اس کے بعد بھی وہ تمام ازواج مطہرات دوسرے کے لئے حرام ہیں (یعنی وہ معتدہ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں ہیں) اور وہ سب جنت میں بھی ازواج کے زمرے میں ہوں گیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ازواج کے جو حقوق واجب تھے وہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بھی۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حدیث الباب میں ازواج کے نفقہ کے بعد باقی مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ عَنْ ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ وَعَوْنِهِ: أَنَّ أَزْوَاجَهُ بَعْدَ وَفَاتِهِ مَحْبُوسَاتٌ عَلَيْهِ

مُحرَّمَاتٌ عَلَى غَيْرِهِ لِيَكُنَّ أَزْوَاجَهُ فِي الْجَنَّةِ، وَلَمَّا كُنَّ كَذَلِكَ كَانَ جَمِيعُ الْوَاجِبِ لَهُنَّ كَانَ عَلَيْهِ فِي حَيَاتِهِ بِحَقِّ التَّزْوِيجِ الَّذِي كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُنَّ وَاجِبًا لَهُنَّ عَلَيْهِ بَعْدَ وَفَاتِهِ كَوُجُوبِهِ كَانَ لَهُنَّ عَلَيْهِ فِي حَيَاتِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۴/۳)

سوال:

یہاں یہ بات عیاں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح کسی کے مال کے وارث نہیں بنے، اسی طرح نہ آپ نے کسی کو اپنے مال کا وارث بنایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث الباب میں "لَا تَقْسِمُ وَرَثَتِي دِينَارًا" (میرے وارث میرے ترکہ میں سے ایک دینار تقسیم نہ کریں) کیوں فرمایا؟

فَإِنْ قَالَ: فَمَا مَعْنَى قَوْلِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا تَقْسِمُ وَرَثَتِي دِينَارًا" وَفِي ذَلِكَ إِثْبَاتُهُ أَنَّ لَهُ وَرَثَةً وَهُوَ لَا يُورَثُ وَمَنْ كَانَ لَا يُورَثُ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَرَثَةٌ. (شرح مشکل الآثار: ۱۴/۳)

جواب:

یہ فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے؛ بلکہ یہ استعارہ اور فرض کے طور پر ہے، کہ اگر میں ایک دینار چھوڑ کر جاؤں تو میرے مرنے کے بعد اس کو تقسیم نہ کرے؛ بلکہ اس کو صدقہ کر دے۔

قِيلَ: ذَلِكَ عِنْدَنَا - وَاللّٰهُ أَعْلَمُ - عَلَى الِاسْتِعَارَةِ بِمَعْنَى: لَا يَقْسِمُ مَنْ كَانَ يَرِثُنِي لَوْ كُنْتُ مُوَرِّثًا دِينَارًا مَا تَرَكْتُ فَهُوَ صَدَقَةٌ لِأَنِّي لَا أُورَثُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۴/۳)

اقوال المحدثین:

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حضرت سفیان بن عیینہؒ کے حوالہ سے رقم طراز ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد امہات المؤمنین معتدہ کے حکم میں ہوگئیں، چوں کے ان پر

دوسری شادی کرنا حرام ہوگیا، اس لئے حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی نفقہ ان کے لئے جاری رکھا گیا، جیسا کہ امام بغوی کی ''شرح السنہ'' میں ذکر کیا گیا ہے، اور خلفائے راشدینؓ آپ ﷺ کے وصال کے بعد ان پر آپ ﷺ کے نفقہ کا مال خرچ کرتے تھے۔

قال سفیان بن عیینة عن قوله: بعد نفقة نسائی: کان ازواج النبی ﷺ فی معنی المعتدات، اذ کن لا یجوز لهن أن ینکحن، فجرت لهن النفقة کذا فی شرح السنة. (۱۴/ ۵۲)

وکان الخلفاء بعده صلّی اللّٰه علیه وسلّم، ینفقون علیهم من صدقات رسول اللّٰه ﷺ. (فتح الملهم: ۹/ ۹۵)

(۲) اسی طرح محدث کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد ازواج مطہرات معتدات کے حکم میں ہیں، اس لئے ان سے کسی کا نکاح درست نہیں، اسی وجہ سے آپ ﷺ کے مال متروکہ میں ان کا نفقہ بھی واجب ہوتا ہے۔

"ما ترکت بعد نفقة نسائی" قال ابن عیینة: أزواج النبی ﷺ فی حکم المعتدات إذ لا یجوز أن ینکحن، فلهذا وجبت النفقة لهن فیما ترکه رسول اللّٰه ﷺ.

(بذل المجهود: ۱۰/ ۱۶۱)

(۳) اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ازواج مطہرات کے نفقہ کے تعلق سے دو باتیں لکھی ہیں:

(۱) اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں تو ان کی ازواج کا نفقہ اللہ کے مال سے متعلق ہوگا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ازواج نے دنیا پر آخرت اور اللہ ورسول کو ترجیح دی تو ان کا

نفقہ اللہ کے مال میں لازم ہوگا۔

قال : ما ترك النبیﷺ إلا سلاحه وبغلته البيضاء وارضا تركها صدقة " قال الكشميری) أما نفقتهن فإن شئت قلت: إن الأنبياء اذا كانوا أحياء فی قبورهم، فنفقة أزواجهم تكون فی مال الله لا محالة، وإن شئت قلت: إنهن إذا اخترن الله ورسوله عادت نفقتهن إلى ماله تعالىٰ. (فيض الباری: كتاب فرض الخمس، باب نفقة نساء النبیﷺ: ۲۵۸/۴، دار الكتب العلمية بيروت، لبنان)

ترجیح اور وجہ ترجیح:

مذکورہ بالا مسئلہ کے تعلق سے حضرت سفیان بن عیینہ کے حوالہ سے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور محدث کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی رائے ذکر کی گئی ہے، لیکن عاجز کے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد ازواج مطہرات کی حرمت اور ان کا نفقہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مال متروکہ سے واجب ہونے کی وجہ انکے حقوق کی برتری، ہجرت میں سبقت، اور امہات المومنین کی سعادت ہے، چنانچہ شیخ زرقانیؒ نے ''شرح الموطا'' (۴۵۱/۴) میں قول رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "ما ترکت بعد نفقة نسائی" پر تعلیقاً ذکر کیا ہے۔

ويدخل فيه كسوتهن وسائر اللوازم كالمساكن، لانهن محبوسات عن الزواج بسببه، أو لعظم حقوقهن لفضلهن، وقدم هجرتهن وكونهن أمهات المومنين. (حاشية شرح مشكل الآثار: ۱۴/۳)

باب: ۱۵۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمُرَادِ بِقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ ﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ الْآيَةَ [الأنبياء:۹۸]

﴿ اللہ کے علاوہ کی عبادت کرنا موجب جہنم ہے ﴾

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: "لَمَّا نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ: ﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ الْآيَةَ [الأنبياء:۹۸]. قَالَ الْمُشْرِكُونَ: فَإِنَّ عِيسَى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْبَدُ وَعُزَيْرٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَئِكَ﴾ [الأنبياء :۱۰۱] عِيسَى وَعُزَيْرٌ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِمَا ". (شرح مشکل الآثار: ۱۵/۳، وأخرجه الطبری فی جامع البیان: ۹۷/۱۷، الدر المنثور: ۶۷۹/۵)

خلاصۃ الحدیث:

فتح مکہ سے قبل اہل عرب خاص طور پر کفار ومشرکین کی تاریخ دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہ لوگ شرک کے بڑے دلدادہ ہی نہیں تھے؛ بلکہ ان کی گھٹیوں میں شرک اور بت پرستی رچی بسی تھی، ایک خدا وحدہ لاشریک کی عبادت کے بجائے ہزاروں معبودان باطلہ کی پرستش کرتے، جس چیز سے ذرہ برابر فائدہ کی امید ہوتی اس کو معبود کا درجہ دیدیتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۸ھ میں فاتحانہ انداز میں حرم میں داخل ہوئے، کعبۃ اللہ میں تقریباً تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبۃ اللہ کو اس سے پاک کیا، صفا اور مروہ کے پاس دو پتھر نصب کئے ہوئے تھے، کفار مکہ جن کی نہ صرف تعظیم کرتے بلکہ ان دونوں جگہوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے، ان کے نام سے نذر ونیاز کرتے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے حکم سے دونوں کے درمیان سعی کو شعائر حج میں شمار کیا، لیکن بعض صحابہ کے دلوں میں گناہ کا شبہ ہونے لگا، تو بالآخر

قرآن کی آیت :﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ﴾ نازل ہوئی، تب صحابہ کے دلوں سے گناہ کا خلجان زائل ہوا۔

فلما أسلموا، سألوا رسول الله ﷺ عن ذلك قالوا: يا رسول الله، إنا كنا نتحرج أن نطوف بين الصفا والمروة، فأنزل الله الآيَة ﴿إن الصفا والمروة من شعائر الله﴾. (بقرة: ۱۵۸) (نفحات العبير: ۱/۹۹)

الغرض کفار مکہ نے لات، عزیٰ اور مناۃ کی طرح ہزاروں چیزوں کو خدا کا مقام اور رتبہ عطا کیا تھا، لیکن جب سورۂ انبیا کی آیت ﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ [الأنبياء: ۹۸] . (بلا شبہ تم اور جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤں گے) نازل ہوئی تو کفار مکہ پر بڑا شاق اور گراں گذرا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا کہ یہ وعید ہمارے معبودان کے ساتھ خاص ہے، یا ہر اس شخص کے لئے ہے جو اللہ کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو پوجتا ہے؟ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا یہ وعید ہر اس شخص کے لئے ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے۔

فَقَالُوا: يَا مُحَمَّدُ هَذَا شَيْءٌ لِآلِهَتِنَا خَاصَّةً أَمْ لِكُلِّ مَنْ عُبِدَ مِنْ دُونِ اللهِ؟ قَالَ: بَلْ لِكُلِّ مَنْ عُبِدَ مِنْ دُونِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ . (شرح مشكل الآثار: ۱۶/۳)

اعتراض:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مذکورہ جواب ملنے کے بعد کفار مکہ نے یہ اعتراض کیا کہ آپ لوگوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت عزیر علیہ السلام اور فرشتے نیک بندے ہیں، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کیوں نہیں؟ پھر کفار مکہ نے کہا نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں، یہود عزیر علیہ السلام کی، اور بنو ملیح فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں،

اگر یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔ تو کیا آیت أنبیاء ''﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ [الأنبیاء: ۹۸] (بلا شبہ تم اور جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤں گے)'' کی بنیاد پر یہ سب نیک بندے دوزخ کے ایندھن بنیں گے؟

قَالَ: فَهَذِهِ النَّصَارَى يَعْبُدُونَ عِيسَى وَهَذِهِ الْيَهُودُ تَعْبُدُ عُزَيْرًا وَهَذِهِ بَنُو مَلِيحٍ تَعْبُدُ الْمَلَائِكَةَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۶/۳)

جواب:

لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے ان نیک بندوں سے محبت تھی، اس کی محبت کی وجہ سے عذاب جہنم سے نجات کی بشارت اس آیت میں دی، ''﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَئِكَ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۱]'' (جن کے لئے پہلے سے ٹھہر چکی ہماری طرف سے نیکی وہ اس سے دور رہیں گے)، یعنی سورہ انبیاء آیت / ۹۸ کے حکم اور وعید سے انبیاء اور ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے مستثنی کیا ہے۔

قَالَ: فَضَجَّ أَهْلُ مَكَّةَ فَنَزَلَتْ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى﴾ [الأنبیاء: ۱۰۱] عِيسَى وَعُزَيْرٌ وَالْمَلَائِكَةُ ﴿أُولَئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۱]

اشکال:

''من'' اور ''ما'' حروف استفہام ہیں، ''من'' کا استعمال عام طور پر ذوی العقول کے لئے ہوتا ہے، جب کہ ''ما'' کا استعمال غیر ذوی العقول کے لئے، اور اہل عرب فصیح وبلیغ زبان بولنے اور ''من''، ''ما'' کے استعمال کے مواقع سے پورے طور پر واقف تھے، پھر جب آیت انبیاء ''﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾'' نازل ہوئی تو کفار مکہ زور سے

ہنسنے لگے اور شور مچایا اس کی کیا وجہ ہے؟

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَقَالَ قَائِلٌ: فَفِي هَذِهِ الْآثَارِ أَنَّ الْمُشْرِكِينَ عِنْدَ نُزُولِ الْآيَةِ الْأُولَى مِنْ هَاتَيْنِ الْآيَتَيْنِ اللَّتَيْنِ فِي هَذَا الْحَدِيثِ ضَجُّوا مِنْ ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۹/۳)

جواب:

امام طحاویؒ نے اس اشکال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ عام ضابطہ وہی ہے جیسا کہ آپ نے اعتراض میں ذکر کیا ہے، یعنی ''من'' ذوی العقول کے لئے اور ''ما'' غیر ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ بات یاد رہے کہ کوئی اصول وضابطہ کلی نہیں ہوتا، بلکہ اکثری ہوتا ہے، اس لئے اس سے بعض صورتیں مستثنی ہوتی ہیں، چنانچہ یہاں بھی قاعدہ سے ہٹکر ''ما'' ذوی العقول کے لئے استعمال ہوا ہے، اس کی نظیر قرآن مجید میں ملتی ہے:

﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (نساء: ۲۴) ﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (الحدید: ۱)

ان دونوں آیات میں ''ما'' ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی طرح ﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ آیت میں ''ما'' کا استعمال ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کے لئے ہوا ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں۔

فكان جوابنا له في ذلك بتوفيق الله تعالىٰ وعونه: أنّ (مَن) وَ(مَا) في الأكثر من كلام العرب يخرجان على ما ذكر، وقد تستعمل العرب أيضا في كلامها في بني آدم (ما) كما تستعمل (مَنْ) وإن كان ذلك مما لا تستعمله فيهم كثيرا كما تستعمل فيهم (مَنْ)، ومن ذلك قول الله تعالىٰ: ﴿والمحصنات من النساء إلا ما ملكت أيمانكم﴾ [النساء: ٢٤]

مكان إلا من ملكت أيمانكم، وقوله تعالیٰ:﴿سبح لله ما في السموات والأرض﴾ ﴿ويسبح لله مافي السموات ومافي الأرض﴾، وقوله: ﴿ووالد وما ولد﴾ [البلد:۳] يعني آدم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وما ولد. (شرح مشکل الآثار:۱۹/۳)

تعارض:

حضرت ابن عباسؓ کی حدیث جو صفحہ ۱۸ پر گذری ہے اس میں یہ بات ذکر ہے کہ سورۂ اَنبیاء کی آیت ﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ﴾ [الأنبياء:۱۰۱] . حضرت عیسیٰ وعزیر علیہما السلام اور ملائکہ کی شان میں نازل ہوئی ہے، لیکن حضرت علیؓ کی حدیث سَمِعْتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يَخْطُبُ، وَتَلَا هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ﴾ [الأنبياء:۱۰۱] . قَالَ: " نَزَلَتْ فِي عُثْمَانَ وَأَصْحَابِهِ أَوْ قَالَ: عُثْمَانُ مِنْهُمْ" اس بات پر دال ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس اعتبار سے دونوں احادیث میں تعارض پایا جارہا ہے۔

فَقَالَ قَائِلٌ: فَقَدْ رُوِيَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّ نُزُولَ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ﴾ [الأنبياء:۱۰۱] فِي خِلَافِ الْمَعْنَى الَّذِي رَوَيْتُمْ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ نُزُولَهَا كَانَ فِيهِ وَذَكَرَ مَا حَدَّثَنَا بَكَّارُ بْنُ قُتَيْبَةَ وَيَزِيدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَا: حَدَّثَنَا أَبُو دَاوُدَ الطَّيَالِسِيُّ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي بِشْرٍ، عَنْ يُوسُفَ بْنِ سَعْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حَاطِبٍ قَالَ: سَمِعْتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يَخْطُبُ، وَتَلَا هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ﴾ [الأنبياء:۱۰۱] . قَالَ: " نَزَلَتْ فِي عُثْمَانَ وَأَصْحَابِهِ أَوْ قَالَ: عُثْمَانُ مِنْهُمْ". (شرح مشکل الآثار:۲۱/۳)

جمع و تطبیق:

امام طحاویؒ نے اس تعارض کا حل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس آیت میں دونوں معانی کا احتمال ہے، یعنی جہاں یہ معنی لینا درست ہے کہ ''﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ﴾ [الأنبياء: ١٠١] '' والی آیت حضرت عیسیٰ وعزیر اور ملائکہ کی شان میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے، وہیں اس سے یہ معنی لینا بھی درست ہے کہ وہ آیت حضرت عثمانؓ اور ان کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ کی حدیث میں مروی ہے، اس توجیہ کے بعد دونوں احادیث میں تعارض ختم ہو جاتا ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللهِ وَعَوْنِهِ أَنْ قَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَرَادَ بِمَا رُوِيَ عَنْهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ عُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مِمَّنْ سَبَقَتْ لَهُ الْحُسْنَى الْمَذْكُورِينَ فِي هَذِهِ الْآيَةِ؛ لِأَنَّ الْآيَةَ نَزَلَتْ فِي مَنْ سَبَقَتْ لَهُ الْحُسْنَى مِنَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، فَمِنْهُمْ عِيسَى وَمِنْهُمْ عُزَيْرٌ وَمِنْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَمِنْهُمْ مَنْ سِوَاهُمْ مِمَّنْ سَبَقَتْ لَهُمُ الْحُسْنَى مِنَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، مِنْهُمْ عُثْمَانُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَأَصْحَابُهُ، فَبَانَ بِحَمْدِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَنِعْمَتِهِ أَنَّ جَمِيعَ مَا رَوَيْنَاهُ فِي هَذَا الْبَابِ لَا يُضَادُّ شَيْءٌ مِنْهُ شَيْئًا. (شرح مشکل الآثار: ۲۲/۳)

اقوال المفسرین:

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں وہ تمام مومنین داخل ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی اور سعادت کا وعدہ پہلے سے ہو چکا ہے، یہ سب جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ (مدارک، الأنبیاء: ۲۷، صاوی، الأنبیاء تحت الآیة: ۱۰۱، ۱۳۲۰/۴)

باب: ۱۵۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "لَا تَدَعُ مُضَرُ عَبْدًا لِلّٰهِ إِلَّا فَتَنُوهُ أَوْ قَتَلُوهُ"

﴿قبیلہ مضر کی خصوصیت کا بیان﴾

عَنْ عَمْرِو بْنِ حَنْظَلَةَ، قَالَ: قَالَ حُذَيْفَةُ: "لَا تَدَعُ مُضَرُ عَبْدًا لِلّٰهِ مُؤْمِنًا إِلَّا فَتَنُوهُ أَوْ قَتَلُوهُ أَوْ يَضْرِبُهُمُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَالْمَلَائِكَةُ وَالْمُؤْمِنُونَ حَتَّى لَا يَمْنَعُوا ذَنَبَ تَلْعَةٍ"، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ تَقُولُ هَذَا وَأَنْتَ رَجُلٌ مِنْ مُضَرَ، فَقَالَ: "أَلَا أَقُولُ مَا قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". (شرح مشکل الآثار: ۲۳/۳، ورواہ أحمد: ۳۵۹/۵، ورواہ الحاکم: ۴۷۰/۴)

خلاصۃ الحدیث:

عرب میں بے شمار قبائل آباد تھے، ہر قبیلہ کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات ومیزات تھیں، ان میں ایک قبیلہ قبیلۂ مضر تھا، جس کا شجرہ نسب اس طرح ہے مضر بن نزار بن معد بن عدنان، اہل عرب اس کو ابیض کہتے تھے، ایک قول یہ ہے کہ اس کو مضر الحمراء کہتے تھے۔

یہ لوگ زیادہ تر حجاز میں آباد تھے، اور مکہ میں ان کی ایک ریاست تھی، اس کے دو شاخ تھی، خندف اور قیس۔ (معجم قبائل العرب: ۱۱۰۷/۳)

بہر حال امام طحاویؒ نے یہاں اس سے متعلق ترجمۃ الباب قائم کیا ہے، اور اس باب میں متعدد طرق سے احادیث کو جمع کیا ہے، لیکن اس سے مقصد قبیلۂ مضر کی ایک خاص صفت کو بیان کرنا ہے، وہ صفت یہ ہے کہ جیسے ہی اس قبیلہ کے لوگ اللہ کے کسی بندے پر قابو پاتے اس کو یا تو کسی فتنہ میں مبتلاء کر دیتے یا اس کو قتل کر دیتے، یہاں تک کہ اس کے بارے میں یہ بات ضربُ

المثل کے طور پر مشہور ہوگئی تھی، ''لا یمنعوا ذنب تلعة'' پہاڑ کے برابر گناہ ہو اس کو کرنے سے عاجز نہیں آتے۔

اعتراض:

حدیث الباب میں قبیلۂ مضر کی خصوصیت کو حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے بیان کیا ہے، جب کہ ان کا تعلق بھی اسی قبیلۂ مضر سے ہے، اشکال یہ ہے کہ حضرت حذیفہؓ اسی قبیلہ کے ایک فرد تھے، پھر اس قبیلہ کی منفی صفت کو کیوں بیان کیا؟

فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: أَتَقُولُ هَذَا وَأَنْتَ مِنْ مُضَرَ فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ فَقَالَ: "أَلَا أَقُولُ مَا قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". (شرح مشکل الآثار: ۲۳/۳)

جواب:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قبیلہ مضر سے تعلق رکھنے والے سب بُرے نہیں تھے، اور نہ سب میں یہ عادت تھی، اس لئے حدیث الباب میں مضر سے وہ لوگ مراد ہیں جن میں یہ صفت تھی، یعنی جن میں ظلم اور قتل وقتال کا وصف تھا وہ مراد ہیں۔

اور حضرت حذیفہؓ نے بھی یہ جواب دیا کہ کیا میں وہ بات نہیں کہوں گا جو بات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہی ہے۔

فَقَالَ: "أَلَا أَقُولُ مَا قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". (شرح مشکل الآثار: ۲۳/۳)

سوال:

حدیث الباب میں مضر کا لفظ مطلقاً آیا ہے، کیا اس لفظ کے عموم کی وجہ سے تمام لوگ مراد

ہوں گے جن پر مضر کا اطلاق ہوتا ہے یا بعض لوگ؟

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَسَأَلَ سَائِلٌ عَنْ وَجْهِ عُمُومِ مُضَرَ مِمَّا عَمَّتْ بِهِ فِيمَا رَوَيْنَاهُ مِنْ هَذِهِ الْآثَارِ؟. (شرح مشکل الآثار:۲۳/۳)

جواب:

امام طحاویؒ نے اس سوال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ گرچہ حدیث شریف میں قتل وقتال کی بات مضر کے بارے میں ذکر کی گئی ہے، مگر اس سے تمام مضر قبیلہ کے لوگ مراد نہیں، بلکہ اس سے بعض اہل مضر مراد ہیں، جو اس صفت سے متصف تھے۔

اس کی نظیر اہل عرب کا استعمال ہے۔

اہل عرب بھی اس طرح کلمہ کو پوری قوم کی طرف منسوب کر کے استعمال کرتے، لیکن اس سے بعض قوم مراد لیتے ہیں۔

مثلاً:۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تکذیب رسول کی نسبت پوری قوم کی طرف کی ہے، لیکن اس سے بعض قوم مراد ہے۔

﴿وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ﴾ [الأنعام:٦٦]

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فجر کی نماز میں قبیلۂ مضر پر قنوت نازلہ میں بددعا کی، یہاں پر بھی پورا قبیلۂ مضر مراد نہیں، بلکہ وہ اشخاص مراد ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات تھیں، اسی طرح حدیث الباب میں مضر سے بعض اہل مضر مراد ہیں۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ أَنَّ ذَلِكَ الْكَلَامَ وَإِنْ كَانَ مُطْلَقًا

فِي مُضَرَ لَمْ يُرِدْ مِنْهَا إِلَّا مَنْ كَانَ مِنْهُ السَّبَبُ الَّذِي مِنْ أَجْلِهِ قِيلَ ذَلِكَ الْقَوْلُ دُونَ مَنْ سِوَاهُ مِنْهَا، وَالْعَرَبُ تَفْعَلُ ذَلِكَ فِي الْأَشْيَاءِ الْوَاسِعَةِ تَقْصِدُ ذِكْرَ مَا كَانَ مِنْ بَعْضِ أَهْلِهَا إِلَى جُمْلَةِ أَهْلِهَا، وَإِنَّمَا تُرِيدُ مَنْ كَانَ مِنْهُ ذَلِكَ الشَّيْءُ مِنْ أَهْلِهَا دُونَ مَنْ سِوَاهُ مِمَّنْ لَمْ يَكُنْ مِنْهُ الشَّيْءُ، وَمِنْهُ قَوْلُ اللهِ لِنَبِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ﴿وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ﴾ [الأنعام: ٦٦] لَمْ يُرِدْ بِذَلِكَ إِلَّا مَنْ كَذَّبَ بِهِ مِنْ قَوْمِهِ دُونَ مَنْ سِوَاهُ مِنْهُمْ. (شرح مشکل الآثار: ۲۶/۳)

باب: ۱۵۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي اسْمِ الصَّلَاةِ التَّالِيَةِ لِصَلَاةِ الْمَغْرِبِ مِنَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ

﴿عشاء کی نماز کو عتمہ کہنا﴾

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تَغْلِبَنَّكُمُ الْأَعْرَابُ عَلَى اسْمِ صَلَاتِكُمْ، إِنَّمَا هِيَ الْعِشَاءُ وَلَكِنَّهُمْ يُعْتِمُونَ عَنْ إِبِلِهِمْ". (شرح مشکل الآثار: ۲۷/۳، ورواه أبو عوانة فی مسنده: ۳۶۹/۱)

خلاصۃ الحدیث:

یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں ہیں، امت کے حق میں جہاں آپ شارع تھے وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصلح بھی، اس لئے زمانۂ جاہلیت کی روایات ورسومات کو بدلنے اور عبادات کو بُرے ناموں کے بجائے معروف ناموں کے ساتھ متصف کر کے اسلامی معاشرہ میں رواج دینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہم رول رہا ہے۔

چنانچہ بعض اعراب مغرب کی نماز پر عشاء کا اطلاق اور عشاء کی نماز پر عتمہ کا اطلاق کرتے

تھے، دراصل ''عتمہ'' کے معنی ظلمت اور تاریکی کے ہیں، ''دخل فی العتمة'' یعنی اندھیرے میں داخل ہوا، چوں کہ اعراب جانوروں کا دودھ شام کو تاخیر سے نکالتے، جب اندھیرا ہو جاتا، اور یہی وقت عشاء کی نماز کا بھی تھا، اس لئے وہ اس کے لئے بجائے عشاء کے ''عتمہ'' لفظ کا اطلاق کرتے، جیسا کہ حاشیہ ابوداؤد شریف میں امام خطابیؒ کے حوالہ سے مذکور ہے: ''ومن بعد صلاة العشاء ثلاث عورات لکم'' (نور: ۵۱) حالانکہ قرآن میں عشاء کا لفظ وارد ہوا ہے، نہ کہ عتمہ۔ (معناه يؤخرون حلب الابل ويسمون صلاة العتمة)۔

الغرض اعراب نے ایک دنیوی کام کے پیش نظر عشاء کے بجائے عتمہ کا لفظ استعمال کیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعراب کی اتباع کرنے سے منع فرمایا اور یہ فرمایا: ''لا تغلبنكم الأعراب على اسم صلاتكم الا وانماهي العشاء ولكنهم يعتمون بالإبل'' یہ اعراب تم پر غالب نہ آجائیں کہ جس طرح وہ اس کو عتمہ کہتے ہیں تم بھی عتمہ ہی کہنے لگو۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس باب کی پہلی حدیث میں عرب کے اعراب (دیہاتی) کے غلط اصطلاح سے امت کو متنبہ کیا ہے، کہ وہ تمہاری نماز (عشاء) کے نام پر غالب نہ آجائیں، اور تم بھی عشاء کے بجائے عتمہ کہنے لگو۔

الغرض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعراب کے اس نام پر اعتراض کیا اور صحابہ کرام کو تاکید کی کہ مغرب کی نماز کو مغرب اور عشاء کو عشاء کہو، مغرب کو عشاء اور عشاء کو صلوۃ العتمہ نہ کہو، شریعت نے جس چیز کا جو نام مقرر کیا ہے، مسلمان کو اسی نام کا احترام کرنا چاہئے، بلاوجہ اس نام سے عدول کرنا پسندیدہ نہیں؛ بلکہ قرآن وحدیث میں جس نماز کے لئے جو نام ہے اسی سے پکارو، اس لئے عشاء کی نماز کو عشاء ہی کہو۔

تعارض:

حدیث الباب سے یہ معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز کا نام دیہاتیوں نے عتمہ رکھا تھا، جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو عشاء کہا، لیکن حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عشاء کی نماز کو "اعتموا بهذه الصلاة" سے تعبیر کیا، کہ یہ نماز تاخیر سے ادا کرو، اس اعتبار سے دونوں احادیث میں تعارض واقع ہے۔

فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَعْتِمُوا بِهَذِهِ الصَّلَاةِ فَإِنَّكُمْ قَدْ فُضِّلْتُمْ بِهَا عَلَى سَائِرِ الْأُمَمِ، لَمْ تُصَلِّهَا أُمَّةٌ قَبْلَكُمْ" فَقَالَ قَائِلٌ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ تَسْمِيَةُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيَّاهَا الْعَتَمَةَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۸/۳)

جمع وتطبیق:

"اِعْتَمَ" کا معنی تاخیر کرنا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث معاذ میں "اِعتموا" کے لفظ سے عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھنے کا حکم دیا، نہ کہ نماز عشاء کو عتمہ کا نام مقرر کیا، لہذا اس نماز کا نام عشاء ہی رہا، نہ کہ عتمہ۔

مثلاً کسی نے عصر کی نماز تاخیر سے غروب سے پہلے ادا کی تو آپ نے یہ جملہ "أمسيت بصلاة العصر" کہا، اس سے صلاۃ العصر کا نام "مساء" نہیں ہو جائے گا، بلکہ اس جملہ کا مقصود ہوگا کہ آپ نے عصر کی نماز تاخیر کر کے ادا کی۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ وَعَوْنِهِ: أَنَّهُ لَيْسَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ تَسْمِيَةُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيَّاهَا الْعَتَمَةَ، وَإِنَّمَا الَّذِي فِيهِ أَمْرُهُ إِيَّاهُمْ بِالْعِتَامِ بِهَا، أَيْ: بِالتَّأَخُّرِ بِهَا، وَإِنْ كَانَ اسْمُهَا هُوَ الْعِشَاءُ لَا الْعَتَمَةُ كَمَا تَقُولُ: أَمْسَيْتُ بِصَلَاةِ الْعَصْرِ، لَا لِأَنَّ الْمَسَاءَ

اسْمٌ لَهَا وَلَكِنْ إِخْبَارٌ مِنْكَ أَنَّكَ أَمْسَيْتَ بِهَا، وَاسْمُهَا غَيْرُ مُشْتَقٍّ مِنَ الْمَسَاءِ بِهَا. (شرح مشکل الآثار:۳/۲۸)

اقوال المحدثین:

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ صلاۃ العشاء کو "عتمہ" سے تعبیر کرنے کی دو وجہیں ہیں:

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ عتمہ کا استعمال بیان جواز کے لئے ہوا ہے، اور حدیث میں اس کی ممانعت تنزیہی کے طور پر ہے؛ نہ کہ حرام کے طور پر۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ عتمہ کے ذریعہ عرب میں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا جو عشاء کو نہیں جانتے تھے، اس لئے عشا کے بجائے عتمہ سے مخاطب کیا۔

والجواب عنه من وجهين: احدهما انه استعمل لبيان الجواز والنهى عن العتمة للتنزيه لا للتحريم، والثانى: يحتمل أنه خوطب بالعتمة من لا يعرفه بالعشاء فخوطب بما يعرفه واستعمال لفظ العتمة: لأنه أشهر عند العرب. (فتح الملهم:۴/۲۷۷)

سوال:

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ والی حدیث کے علاوہ کئی احادیث میں "عتمہ" کا لفظ "عشاء" کے لئے استعمال ہوا ہے تو اس کا کیا جواب ہوگا، جبکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے: "وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَالصُّبْحِ لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا." (شرح مشکل الآثار:۳/۲۹)

جواب:

امام طحاویؒ نے اس سوال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ یہی مضمون حضرت عبد اللہ بن

مسعودؓ سے مروی ہے لیکن اس میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث کے خلاف ''عتمہ'' کے بجائے ''عشاء'' کا لفظ ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا: أَنَّ هٰذَا الحَدِيثِ قَد رَوَاه عَبدُاللّٰهِ عَنِ النَّبِیِّ بِخِلَافِ ذٰلِک. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۰)

عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا صَلَاةٌ أَثْقَلَ عَلَى الْمُنَافِقِينَ مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ وَصَلَاةِ الْفَجْرِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِيهِمَا مِنَ الْفَضْلِ لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۰)

اس اعتبار سے دونوں احادیث بظاہر متعارض ہیں، حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ''عشاء'' کے لئے ''عتمہ'' کا لفظ مستعمل ہے، مگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں عتمہ نہیں بلکہ عشاء ہی کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔

جمع و تطبیق:

صحیح بات یہی ہے کہ اہل عرب پہلے عشاء کی نماز کو عتمہ سے جانتے تھے، جب آیت: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَكُمْ﴾ [النور: ۵۸] نازل ہوئی تو سب لوگ رات کی نماز کو عشاء سے پکارنے لگے، اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت ابن مسعود نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس حدیث کو نقل کرتے وقت عشاء کا نام لیا جب کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس کو پہلے کے مطابق عتمہ سے تعبیر کیا۔

فَصَارُوا إِلَى اسْمِهَا الَّذِي سَمَّاهَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ بِهِ فِي هَذِهِ الْآيَةِ، وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا قَالَهُ فِي حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ الَّذِي رَوَيْنَاهُ. وَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ الَّذِي حَكَاهُ ابْنُ مَسْعُودٍ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي اسْمِهَا الَّذِي ذَكَرَهَا بِهِ فِي حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ وَهُوَ الْعَتَمَةُ - وَاللّٰهُ أَعْلَمُ - . (شرح مشکل الآثار:۳/۳۱)

وَتَصْحِيحُ هَذَيْنِ الْحَدِيثَيْنِ أَنَّ الْأَمْرَ الَّذِي كَانَتْ الْعَرَبُ تَعْرِفُهُ فِي اسْمِ هَذِهِ الصَّلَاةِ أَنَّهُ الْعَتَمَةُ لَا الْعِشَاءُ. (شرح مشکل الآثار:۳/۳۱)

سوال:

اگر کوئی یہ سوال کرے اس نام (عشاء) کا کیا مطلب ہے:

فَقَالَ قَائِلٌ فَمَا مَعْنَى هَذَا الِاسْمِ، يَعْنِي: الْعِشَاءَ؟. (شرح مشکل الآثار:۳/۳۱)

جواب:

امام طحاویؒ نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ عشاء کا لفظ "ظلمة" سے ماخوذ ہے، جو نگاہوں کو رتوندھے میں مبتلاء کردے، (یعنی رات کو نہ دیکھنے والا بنانا) الغرض لفظ عشاء بھی بقیہ چاروں اوقات کے ناموں کی طرح نام رکھا گیا ہے، صبح کی نماز کو صلاۃ الصبح اس لئے کہتے ہیں کہ وہ صبح کے وقت میں پڑھی جاتی ہے، صلاۃ الظہر پر ظہر کا اطلاق کیا گیا ہے، کیوں کہ وہ وقت ظہر میں پڑھی جاتی ہے، اسی طرح عصر کی نماز کا حال ہے، کہ دن کے اخیر وقت میں تاخیر کر کے پڑھی جاتی ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ: أَنَّ ذَلِكَ أُخِذَ مِنَ الظُّلْمَةِ الَّتِي تُعْشِي الْأَبْصَارَ، وَرَدَّ اسْمَ هَذِهِ الصَّلَاةِ إِلَى مِثْلِ أَسْمَاءِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ سِوَاهَا؛ لِأَنَّ الصُّبْحَ سُمِّيَتْ بِالصُّبْحِ لِأَنَّهَا تُصَلَّى عِنْدَ الْإِصْبَاحِ، وَسُمِّيَتْ صَلَاةُ الْفَجْرِ صَلَاةَ الْفَجْرِ لِأَنَّهَا تُصَلَّى بِقُرْبِ الْفَجْرِ،

وَسُمِّيَتْ صَلَاةُ الظُّهْرِ صَلَاةَ الظُّهْرِ لِأَنَّهَا تُصَلَّى عِنْدَ الظَّهِيرَةِ، وَسُمِّيَتْ صَلَاةُ الْعَصْرِ صَلَاةَ الْعَصْرِ لِأَنَّهَا تُصَلَّى بَعْدَ الْإِعْصَارِ وَهُوَ التَّأَخُّرُ، وَكَذٰلِكَ رُوِيَ عَنْ أَبِي قِلَابَةَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۱)

اقوال المحدثین:

امام بخاریؒ، امام نوویؒ، اسی طرح ابن منذرؒ نے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کو راجح کہا ہے کہ عشاء کو عتمہ کہنا خلاف اولیٰ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف بیان جواز کے طور پر فرمایا اور بہتر یہی کہ عشاء کے لفظ کو استعمال کیا جائے کیونکہ قرآن میں یہی لفظ ہے، اور اکثر احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشاء کا لفظ وارد ہے۔

ومنهم من جعله خلاف الأولى وهو الراجح وسيأتي للمصنف وكذلك نقله ابن المنذر عن مالك والشافعي واختاره. قال ابو عبدالله (هو المصنف الإمام البخاری) والاختيار أن يقول العشاء لقوله تعالى ﴿ومن بعد صلوة العشاء﴾ وانما صار عنده أولى لموافقته لفظ القرآن ويترجح أيضا بأنه أكثر ما ورد عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. (فتح الباری: ۲/۵۶، رقم: ۵۶۴)

ملا علی قاریؒ نے ایک جواب یہ دیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس کو لفظ عشاء ہی سے سنا تھا اور نہی کی روایت ان کے پاس نہیں پہنچی تھی، تو انہوں نے روایت بالمعنی کیا، اور ابن مسعودؓ کی روایت میں اصل روایت کے الفاظ ہے یعنی ''عشاء کا لفظ'' ہے۔

قال الطيبی واما ما جاء فی حديث أبی هريرة ما فی العتمة قبل ذلک کان قبل نزول الآية التی فيها ذكر صلاة العشاء، وفيه بحث لأن نزول الآية مقدم على ما تقرر فی التاريخ، والوجه أنه كان فی صدر الاسلام جائزا، فلما كثر اطلاقهم وجرت ألسنتهم نهاهم، لئلا

يغلب لسان الجاهلية يعنى فرواه أبوهريرة على ماجمعه قبل النهى، ومحتمل انه جمعه بلفظ العشاء ولم يبلغه النهى فرواه بالمعنى. (مرقاۃ المفاتیح: ۲/۳۲۶، رقم: ۶۳۳)

باب: ۱۵۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ حَدِيثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا وَإِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيلُ اللهِ"

﴿ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیل اور دوست بنانا ﴾

عَنْ عَبْدِ اللهِ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:" لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا ". (شرح مشكل الآثار: ۳/۳۵، ورواه احمد فى المسند: ۱/۴۱۲، و مسلم (۲۳۸۲) والترمذى: ۳۶۵۵)

خلاصۃ الحدیث:

اس میں کوئی شک نہیں ہے دوست کسی بھی انسان کی شخصیت کو سنوارنے، بگاڑنے اور اسے جہت دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، انسان فطری طور پر ایک اجتماعی مخلوق ہے، یہ اکیلا زندگی بسر نہیں کرسکتا، بلکہ اسے ہر آن دوسروں کے تعاون کی ضرورت رہتی ہے، کسی دوست اور ہم نشین کی صحبت اختیار کرنا اس صدائے فطرت پر لبیک کہنے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔

یقیناً انسانی زندگی پر دوست کے اچھے یا بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جہاں صالح دوست کی بنا پر زندگی اسلامی سانچے میں ڈھلتی ہے، وہیں برے دوست کی وجہ سے انسان تعلیمات اسلامی سے روگردانی اختیار کرتا ہے، ؎

صحبت صالح ترا صالح کند = صحبت طالح ترا طالح کند

یعنی نیک اور صالح فرد کی صحبت اور دوستی صالحیت اور پرہیزگاری کا باعث بنتی ہے اور بُرے افراد کی صحبت بُرائی کی طرف لے جاتی ہے، عرب کہتے ہیں: "المرء علی دین خلیله" انسان اپنے دوست کے مسلک ومشرب پر ہوتا ہے۔

اسی لئے مذہب اسلام نے روز اول ہی سے دوستی کا صحیح اصول ہمیں عطا فرمایا، اللہ رب العزت نے اپنے مقدس قرآن میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وکونوا مع الصادقین﴾ [توبہ: ۱۱۹] اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

اسلام نے ہمیں دوستی کا جو ضابطہ واصول فراہم کیا ہے وہ صداقت پر مبنی ہے، کیونکہ نیک اور صالح دوست کی دوستی دنیا میں بھی سودمند ہوتی ہے، نیز قبر میں بھی، نیکوں کار کی صحبت عذاب میں تخفیف اور درجات کی بلندی کا باعث ہوتی ہے۔

یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس باب کی پہلی حدیث میں یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ اگر میں کسی کو دوست اور خلیل بناتا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا دوست بناتا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر ہجرت میں ساتھ تھے، "إذھما فی الغار" کے مصداق تھے، حضرت ابوبکر وہ صحابی تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج کے سفر میں پیش آنے والے تمام حالات کی بسر وچشم تصدیق کی، حضرت ابوبکر وہ صحابی ہیں جو خلفائے راشدین اور عشرہ مبشرہ میں شمار ہیں، جن کی صداقت وصالحیت پر امت کا اتفاق ہے، اور جن کے تقوی اور پرہیزگاری پر کسی کو شبہ نہیں؛ بلکہ امام سیوطیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ سورہ لیل کی آیت نمبر: (۱۷-۱۸) وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿۱۷﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ﴿۱۸﴾ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اور امام رازیؒ سورہ حجرات آیت: ۳ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ سے استدلال کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے افضل

انسان تھے۔

قال الامام السیوطی انها نزلت فی أبی بکر الصدیق بالإجماع، وقد استدل بها الامام الرازی مع قوله "ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقکم" علی انه افضل الناس بعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم". (نفحات العبیر فی مهمات التفسیر: ۱/۱۱۲)

الغرض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی صالحیت اور حسن خلق کی بنیاد پر ان کو اپنا خلیل اور دوست بنانے کا ارادہ ہی نہیں کیا بلکہ دونوں کے مابین تاحیات دوستی برقرار رہی، اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دوستی کا حق ادا کیا، جو پوری امت کے لئے مشعل راہ ہے۔

تعارض:

حدیث الباب سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ کوئی دوست نہیں تھے؟ جبکہ یہ دعویٰ حضرت ام عطیہ کی روایت کے خلاف ہے، جس سے یہ معنی مترشح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضرت ابوبکر کے علاوہ بھی کئی دوست تھے۔

عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ فَتَقُولُ: حَدَّثَنِي خَلِيلِي يَعْنِي النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۷) ام عطیہؓ کہتی ہیں کہ مجھ سے میرے خلیل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کیا۔

اس اعتبار سے ام عطیہ کی حدیث حضرت عبداللہ کی حدیث کے خلاف پڑتی ہے۔

جواب:

حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیل و دوست حضرت ابوبکرؓ تھے، جہاں تک کہ ام عطیہ کا یہ کہنا "حدثنی خلیلی" (مجھ سے میرے خلیل نے بیان کیا)، یہ قول دراصل حضرت ام عطیہ کی خوش فہمی اور حسن ظن کا نتیجہ ہے، جیسا کہ امام شعبیؒ کے قول سے یہ معنی مترشح ہوتا ہے، جس کو امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے: "فقال الشعبی: هذا من عقول النساء". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۷)

تعارض:

حدیث الباب سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوست ابوبکرؓ تھے، جبکہ عامر شعبیؒ کی روایت میں اس کے خلاف معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری جس سے دوستی ہے میں اس کی تردید کرتا ہوں، اس طرح دونوں روایتوں میں تعارض واقع ہے۔ من كانت بيني وبينه خُلّةٌ فقدرددتها عليه. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۸)

جواب:

امام طحاویؒ نے اس تعارض کا جواب اس طرح دیا ہے کہ لفظ ''خلیل'' کلام عرب میں دو معانی میں مستعمل ہے، اگر لفظ ''خلیل'' ''خلۃ'' سے مشتق ہوتا ہے تو اس سے صداقت اور دوستی کا معنی مراد ہوتا ہے، لیکن اگر ''اختلال'' سے مشتق ہوتا ہے تو اس کا معنی احوال کا خراب ہونا مراد ہوتا ہے۔

بہرحال حدیث الباب میں خلیل سے دوست وصدیق مراد ہے اور ایمانی دوستی مراد ہے، لیکن عامر شعبی کی حدیث میں خلیل کا لفظ اختلال سے مشتق ہے، جو اختلال الأحوال کے معنی میں ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا:

''مَنْ كَانَتْ بَيْنِي وَبَيْنَهُ خُلَّةٌ فَقَدْ رَدَدْتُهَا عَلَيْهِ''. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۸)

میرے اور جس شخص کے درمیان دوستی تھی میں نے اس کی تردید کردی۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: ثُمَّ كَشَفْنَا عَنِ الْخَلِيلِ فِي هَذَا مَا هُوَ إِذْ كَانَ الْخَلِيلُ فِي كَلَامِ الْعَرَبِ قَدْ يَكُونُ مِنَ الْخُلَّةِ الَّتِي هِيَ الصَّدَاقَةُ وَقَدْ يَكُونُ مِنِ اخْتِلَالِ الْأَحْوَالِ . (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۸)

الغرض حدیث الباب میں لفظ ''خلیل'' سے خالص دوست کا معنی مراد ہے، جیسا کہ بکار بن قتیبہ کے طریق سے حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں مروی ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی صداقت کی وجہ سے ہر دوست سے بیزار ہوں اور اگر میں کوئی خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا، اور بے شک تمہارا ساتھی اللہ کا خلیل ہے۔ ۔(شرح مشکل الآثار:۳۹/۳)

عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَبْرَأُ إِلَى كُلِّ خَلِيلٍ مِنْ خُلَّتِهِ وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ". (شرح مشکل الآثار:۳۹/۳)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث جو ابوامیۃ اور بکار بن قتیبہ کے طریق سے آئی ہے دونوں حدیث الباب کے برعکس ہیں۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ، عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا وَلَكِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيلُ اللهِ". (شرح مشکل الآثار:۴۰/۳)

اس حدیث میں ''وَلَكِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيلُ اللهِ'' کا اضافہ ہے اور اس حدیث میں ''صَاحِبَكُمْ'' سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں، چنانچہ بکار بن قتیبہ کی طرف سے حضرت عبداللہ کی حدیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ ''صَاحِبَكُمْ'' سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ فِي قَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَاتَّخَذَ اللهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ [النساء:۱۲۵]

"أَلَا وَإِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيلُ اللهِ يَعْنِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْرَمُ الْخَلَائِقِ عَلَى اللهِ وَتَلَا عَبْدُ اللهِ: ﴿عَسَى أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا﴾ [الإسراء:۷۹] (شرح مشکل الآثار:۴۱/۳)

پھر امام طحاویؒ نے ''خَلِيلُ اللهِ'' کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے وہ محب و خلیل مراد ہیں جو اپنے فقر و فاقہ اور محتاجگی کا اظہار اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی مخلوق کے

پاس نہیں کرتے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَاحْتَجْنَا إِلَى الْوُقُوفِ عَلَى مَعْنَى مَا أُضِيفَ مِنْ ذَلِكَ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ. فَوَجَدْنَا قَائِلًا قَدْ قَالَ: الْمُرَادُ بِخَلِيلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ فِي هَذَا فَقِيرُ اللهِ الَّذِي لَمْ يَجْعَلْ فَقْرَهُ وَفَاقَتَهُ إِلَّا إِلَيْهِ لَا إِلَى أَحَدٍ مِنْ خَلْقِهِ. (شرح مشکل الآثار: ٣/ ٤١)

جبکہ امام طحاوی نے یہ بھی قلم بند کیا ہے کہ ''خَلِيلُ اللهِ'' سے دوسرے لوگوں نے وہ محب مراد لیا ہے جو اپنی محبت اپنے محبوب کے ساتھ خاص کرے، کیوں کہ لفظ خلیل سے اس معنی کا بھی احتمال ہے۔

وَوَجَدْنَا غَيْرَهُ قَدْ قَالَ: هُوَ الْمُخْتَصُّ بِالْمَحَبَّةِ دُونَ غَيْرِهِ مِنَ النَّاسِ، وَكُلُّ هَذِهِ التَّأْوِيلَاتِ مُحْتَمَلَاتٌ لِمَا تُؤُوِّلَتْ عَلَيْهِ. (شرح مشکل الآثار: ٣/ ٤١)

بعض علماء نے خلیل سے موالات کا معنی مراد لیا ہے، یہاں تک کہ ان لوگوں نے اس سے وہ ولایت تصور کیا ہے جس سے برتر اور کوئی ولایت نہیں، اور حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کی حدیث سے اس پر استدلال کیا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُلَاةً مِنَ النَّبِيِّينَ، وَإِنَّ وَلِيِّي مِنْهُمْ أَبِي خَلِيلُ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ إِبْرَاهِيمُ"، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ [آل عمران:٦٨] الْآيَةَ. (شرح مشکل الآثار: ٣/ ٤٢)

نیز امام طحاویؒ نے اس روایت کو ولایت الٰہی کے مساوی قرار دیا ہے، اور اس کا استدلال قرآن مجید کی تین آیات سے کیا ہے۔

پہلی آیت سورہ مائدہ آیت: ۵۵ میں ہے:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ [المائدة:٥٥] الْآيَةَ

دوسری آیت سورہ اعراف آیت:۱۹۶ میں ہے:

﴿إِنَّ وَلِيِّيَ اللهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ﴾ [الأعراف:۱۹۶]

اور تیسری آیت سورہ یوسف آیت:۱۰۱ میں ہے:

﴿أَنْتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ [یوسف:۱۰۱]

ان آیات کونقل کرنے کے بعد امام طحاویؒ نے یہ ثابت کیا ہے ''خلة'' ولایت کے معنی میں ہے، جسے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کونوازتے ہیں۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَمِمَّا اسْتُدِلَّ بِهِ عَلَى اسْتِوَاءِ الْوِلَايَةِ مِنَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ خَلْقِهِ وَمَعْنَى مَنْ يَتَوَلَّى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ خَلْقِهِ أَنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ [المائدة:۵۵] الْآيَةَ وَقَالَ: ﴿إِنَّ وَلِيِّيَ اللهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ﴾ [الأعراف:۱۹۶] وَقَالَ: ﴿أَنْتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ [یوسف:۱۰۱] وَقَالَ: ﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [یونس:۶۲] فِي أَشْبَاهٍ لِذَلِكَ قَدْ ذَكَرَهَا عَزَّ وَجَلَّ فِي كِتَابِهِ، وَكَانَتِ الْوِلَايَةُ فِيهَا مِنَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ لِمَنْ يَتَوَلَّاهُ مِنْ عِبَادِهِ كَالْوِلَايَةِ الَّتِي يَتَوَلَّى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ مَنْ يَتَوَلَّاهُ لَا غَيْرَ ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار:۴۳/۳)

سوال:

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ جب کہ خلیل کا معنی صداقت وسچائی ہے، نیز ولایت بھی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا خلیل کیوں نہیں بنایا۔

وَسَأَلَ سَائِلٌ عَنِ الْمَعْنَى الَّذِي مِنْ أَجْلِهِ لَمْ يَتَّخِذْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا. (شرح مشکل الآثار:۴۳/۳)

جواب:

چوں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مقام ومرتبہ خلیل سے بہتر اور برتر ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیل نہیں بنایا۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللهِ وَعَوْنِهِ وَهُوَ مَا بَيَّنَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَدِيثِ يَعْلَى بْنِ حَكِيمٍ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ الَّذِي رَوَيْنَاهُ فِي هَذَا الْبَابِ أَنَّهُ أَفْضَلُ مِنْهُ وَهُوَ خُلَّةُ الْإِسْلَامِ، وَلِمَا أَخْبَرَ بِهِ فِي حَدِيثِ أَبِي الْمُعَلَّى مِنْ وُدِّ الْإِيمَانِ وَكَانَتِ الْخُلَّةُ إِنَّمَا تَتَّخِذُ نَسَبَهَا بِالْمَوَدَّةِ الَّتِي قَدْ تَكُونُ وَلَا إِسْلَامَ مَعَهَا وَكَانَ مَا لَا يَكُونُ إِلَّا بِالْإِسْلَامِ أَوْ بِالْإِيمَانِ أَفْضَلَ مِنْ ذَلِكَ فَرَدَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَانَ أَبِي بَكْرٍ مِنْهُ إِلَى ذَلِكَ الْمَعْنَى وَجَعَلَهُ فَوْقَ الْخَلِيلِ وَاللهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار:٤٣/٣)

اقوال المحدثین:

ملا علی قاریؒ نے قاضی خلیل صاحب کے حوالہ سے ایک نئی بات لکھی ہے کہ خلیل ''خُلَّةٌ'' سے مشتق ہے، اس صورت میں خلیل اس کو کہا جائے گا جس کے پاس حاجت ظاہر کی جائے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام امور میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے تھے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو خلیل نہیں بنایا۔

قال القاضی: الخلیل الصاحب الوادّالذی یفتقر الیه ویعتمد فی الأمور علیه، فان أصل الترکیب من الخلة بالفتح وهی الحاجة، والمعنی: لو کنت متخذا من الخلة خلیلا أرجع الیه فی الحاجات وأعتمد الیه فی المهمات "لاتَّخذت ابابکر خلیلاً ولکن الذي ألجأ الیه وأعتمد علیه فی جملة الأمور ومجامع الأحوال هو اللّٰه تعالیٰ. (مرقاة: ١٦٤/١١)

اسی طرح ملا علی قاریؒ رقم طراز ہیں کہ:

حدیث الباب بھائی چارگی کی ذمہ داری پر محمول ہے، اور اس محبت کے بندھن پر محمول

ہے جو عرب میں مروج تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں مخلوق میں سے کسی کو خلیل بنا تا تو حضرت ابوبکر کو بناتا لیکن اخوت اسلامی اور اس کی محبت شاملہ ان کو اور دوسرے لوگوں کے لئے کافی ہے یا اس وجہ سے افضل ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا پر موقوف ہے۔

ویمکن ان یکون الحدیث محمولا علی ماکان تعاھد العرب فی عھد الأخوّة وعھد الخلة والمحبة فیما بینھم فقال لو کنت متخذ اخلیلا من الخلق لفقد الخلة وعھد المحبة لأتخذت ابابکر خلیلا من بین أصحابی، ولکن أخوّة الإسلام ومودته الشاملة له ولغیره کافیة أو افضل حیث انه خالص لله وعلی وفق رضاه ومن غیر ملاحظة من سواه. (مرقاۃ المفاتیح: ۱۱/۱۶۵)

باب: ۱۵۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "لَا تُخَيِّرُونِي عَلَى مُوسَى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" لِلسَّبَبِ الَّذِي ذَكَرَهُ فِي الْحَدِيثِ الَّذِي رُوِيَ ذٰلِكَ عَنْهُ فِيهِ

﴿حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کسی نبی کی برتری اور ترجیح دینے سے ممانعت﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تُخَيِّرُونِي عَلَى مُوسَى فَإِنَّ النَّاسَ يُصْعَقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَكُونُ أَوَّلَ مَنْ يُفِيقُ، فَإِذَا مُوسَى بَاطِشٌ بِجَانِبِ الْعَرْشِ فَلَا أَدْرِي أَصَعِقَ فِيمَنْ كَانَ صَعِقَ فَأَفَاقَ قَبْلِي أَوْ كَانَ فِيمَنِ اسْتَثْنَى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۴۴، رقم الحدیث: ۱۰۱۰، أخرجه البخاري (۲۴۱۱) ومسلم (۲۳۷۳) وأبوداود (۴۶۷۱)

خلاصۃ الحدیث:

مقام نبوت سب سے اعلیٰ اور افضل مقام ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے منتخب اور

برگزیدہ بندوں میں سے بعض کا انتخاب کرتے ہیں، پھر انہیں منصب نبوت سے سرفراز کرتے ہیں، نبوت کا یہ سلسلۃ الذہب حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوا، جس طرح جمیع انبیاء کرام کو کل کائنات پر برتری حاصل ہے، اسی طرح بعض اُنبیاء کو دوسرے اُنبیاء پر جزوی طور پر فضیلت حاصل ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ [سورہ: بقرہ: ۲۵۳] یہ پیغمبر ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔

البتہ نبی آخر الزمان جو (لولاك لما خلقت الافلاك) کے مصداق ہیں وہ ان تمام انبیاء و رسل میں اعلیٰ و افضل ہیں؛ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انا سیّد ولدآدم ولا فخر. (ابن ماجہ: رقم الحدیث: ۴۳۰۸)

لیکن ان فضائل کے اعتراف میں اعتدال وتوازن کو اختیار کرنا اور افراط وتفریط سے سے پرہیز کرنا نہایت ضروری ہے، لہذا کسی ایک نبی کے لئے اتنے فضائل ثابت نہ کئے جائیں کہ اس سے دوسرے نبی کی تنقیص لازم آئے، چونکہ تنقیص انبیاء موجب کفر ہے۔ اس لئے یہ ناجائز ہے، چنانچہ اسی بنا پر حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان وارد ہے "لا تخیرونی علی موسی علیہ السلام" یعنی مجھے حضرت موسی علیہ السلام پر فضیلت نہ دو (یعنی ایسی فضیلت نہ دو کہ جس سے حضرت موسی علیہ السلام کی تنقیص لازم آئے۔)

علامہ عینیؒ نے حدیث الباب کے سلسلے میں پانچ تاویلات بیان کی ہیں۔

(۱) حدیث الباب میں تفضیل رسول کی ممانعت کا واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ آپ کو افضل البشر ہونے کا علم نہیں ہوا تھا۔ ہاں! جب علم ہو گیا تو فرمایا: "انا سیّد ولدآدم ولا فخر".

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی فضیلت کا انتساب کرنے سے منع فرمایا ہے کہ جس سے دوسرے نبی کی تنقیص لازم آئے کیونکہ تنقیص انبیاء کفر ہے۔

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح کی تفضیل سے منع فرمایا جو مفضی الی النزاع ہو؛ جیسے کہ حدیث الباب کے شان ورود میں مذکور ہے کہ ایک مسلمان نے ایک یہودی کو طمانچہ مار دیا تھا۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول تواضع وانکساری پر محمول ہے۔

(۵) نفس نبوت میں تمام انبیاء برابر ہیں اس لئے اس میں تفضیل سے منع فرمایا ہے۔ اس سے اس بات کی نفی لازم نہیں آتی کہ کسی ایک نبی کو دوسرے نبی پر خاص باب میں فضیلت وبرتری حاصل ہے، جیسے حضرت موسیٰ ؑ کو کلیم اللہ، اور حضرت ابراہیم ؑ کو خلیل اللہ اور حضرت عیسیٰ ؑ کو روح اللہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حبیب اللہ ہونے میں امتیاز حاصل ہے۔

لا تخيروني أي لا تفضلوني على موسى - فإن قلت: نبينا محمد صلى الله عليه وآله وسلم افضل الانبياء والمرسلين وقال: "أنا سيد ولد آدم ولا فخر" فما وجه قوله لا تخيروني - قلت الجواب عنه من أوجه. الاول: أنه قبل ان يعلم انه افضلهم، الثاني انه نهى عن تفضيل يؤدي إلى تنقيص بعضهم فانه كفر، ثالث: أنه نهى عن تفضيل يؤدي إلى الخصومة كما في الحديث، الرابع: أنه قال تواضعا، الخامس: أنه نهى عن التفضيل في نفس النبوة لا في ذوات الانبياء. (عمدة القاري ۱۲/ ۳۵۱)، رقم الحديث (۲۴۱۱)

ترجیح وجہ ترجیح:

مذکورہ بالا اقوال میں چوتھا قول راجح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول تواضع اور انکساری پر محمول ہے۔ (الرابع: أنه قال تواضعا) (حوالہ سابقہ)

باب: ۱۵۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ نَهْيِهِ أَنْ يُقَالَ: هُوَ خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتَّى

﴿ کوئی صحابی یہ نہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یونس بن متی سے بہتر ہیں ﴾

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَقُولَ: أَنَا خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتَّى". (شرح مشكل الآثار: ۴۶/۳،رواه الطيالسی(۲۶۵۰) واحمد: ۲۴۲/۱، ۲۵۴۰و۳۴۲، وابن أبي شيبة: ۵۴۱/۱۱، والبخاری(۳۳۹۵))

خلاصۃ الحدیث:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نبوت کا مقام سب سے اعلی وارفع ہے، اور تمام انبیاء اور رسل فضائل وخصائل کے اعتبار سے یکساں نہیں، بل کہ بعض کو بعض پر اللہ تعالی نے فضیلت وبرتری عطافرمائی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾[سورہ: بقرہ: ۲۵۳] یہ پیغمبر ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطافرمائی ہے، ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالی نے کلام فرمایا، لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے افضل ہیں، جیسا کہ صحیحین میں ہے:"انا سید الناس یوم القیامۃ" میں قیامت کے دن تمام لوگوں کا سردار ہوں۔ (بخاری شریف: ج:۲، کتاب التفسیر)

مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تمام تر خصوصیات کے باوجود صحابہ کرام کو منع کیا تھا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں، جیسا کہ اس باب کی پہلی حدیث میں مذکور ہے۔

سوال:

جب متفقہ طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں تو پھر آپ نے صحابہ کو کیوں منع کیا کہ وہ یہ نہ کہیں کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں؟

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَاحْتَجْنَا أَنْ نَقِفَ عَلَى الْمَعْنَى الَّذِي مِنْ أَجْلِهِ قِيلَ مَا قِيلَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ فَطَلَبْنَا ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۴۷/۳)

جواب: (۱)

بلاشبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوبِ دو جہاں، خاتم النبیین اور تمام انبیاء کرام کے سردار اور سب سے افضل و برتر ہیں، اس پر تمام امت کا اجماع ہے، نیز دیگر انبیاء کرام میں سے بعض کو بعض پر اللہ تعالیٰ نے بعض اعتبار سے فضیلت عطا فرمائی ہے، لیکن ہمارے لئے یہ حکم ہے کہ ہم انبیاء کرام کی صفات و خصوصیات کا ذکر مثبت انداز میں کریں، اسی بنا پر ایک نبی کو دوسرے نبی پر اس طرح فضیلت دینا جس سے دوسرے کی تنقیص لازم آئے درست نہیں، ورنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی فضیلت واضح الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں۔

جواب: (۲)

امام طحاویؒ نے ایک جواب یہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت یونسؑ کے تعلق سے اس وقت یہ بات فرمائی جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو جمیع انبیاء و رسل پر فوقیت نہیں عطا کی تھی۔

وَاحْتُمِلَ أَنْ يَكُونَ ذَلِكَ الْقَوْلُ كَانَ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ تَفْضِيلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ إِيَّاهُ عَلَى جَمِيعِ خَلْقِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۴۷/۳)

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت یونسؑ کی تعظیم میں یہ بات فرمائی ہے چوں کہ حضرت یونس علیہ السلام جب مچھلی کے پیٹ میں تھے اس مدت میں اللہ کی تسبیح و تکبیر ”لا إله إلا أنت سبحانك انی كنت من الظّالمين“ کے ذکر سے رطب اللسان تھے۔

يُحَدِّثُ عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ، كَأَنَّهُ عَنِ اللهِ فَذَكَرَ مِثْلَهُ. وَزَادَ "قَدْ سَبَّحَ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ فِي الظُّلُمَاتِ". (شرح مشکل الآثار: ۴۷/۳)

محدثین کے اقوال:

(۱) علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ذکر کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات تواضعاً ذکر کی ہے۔

قال العلماء انما قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ذلك تواضعا. (فتح الباری: ۱۱۶/۷)

(۲) بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سدّ ذریعہ کے طور پر "انا خیر من یونس بن متی" کہنے سے منع فرمایا، مبادا اس سے کسی کے دل میں حضرت یونس علیہ السلام کا مقام و مرتبہ کم نہ ہو جائے۔

(۳) مفتی تقی عثمانیؒ نے بھی لکھا ہے کہ اس اندیشہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ بالا جملہ کہنے سے منع فرمایا کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت بیان کرنے سے دوسرے نبی کی تنقیص لازم نہ آئے۔

واجاب عنه بعض العلماء بانه صلى الله عليه وسلم انما قال ذلك قبل ان يعلم فضيلة على سائر الانبياء وقيل انما قال تواضعا، والأحسن عندى ما ذكرناه فى النهى عن التفضيل بين الأنبياء وهو ان المعنى عنه تفضيل يستلزم تنقيص احدمنهم هو كان مفاخرة بدون حاجة أما لبيان العقيدة مثلاً فلا بأس، لقوله تعالىٰ تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض. (تکملۃ فتح الملہم: ۲۹/۱۱، رقم الحدیث: ۲۱۱۱)

ترجیح اور وجہ ترجیح:

ان اقوال میں تیسرا قول ناچیز کے نزدیک زیادہ راجح اورر پسندیدہ ہے جیسا کہ مفتی تقی

عثمانی صاحب مدفیوضہم نے ذکر کیا ہے کہ ضرورۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برتری وتفوق کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، ہاں! بغیر ضرورت کے ذکر کرنا درست نہیں، کیونکہ بسا اوقات تفضیل بین الانبیاء عقیدہ کے بگاڑ کا سبب ہوتا ہے۔

قال الخطابی: معنی هذا ترک التخییر بینهم علی وجه الإزْراء ببعضهم فانه ربما أدی ذلک الی فساد الاعتقادفیهم. (عون المعبود:۱۲/۴۲۵)

باب: ۱۵۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ جَوَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلَّذِي قَالَ لَهُ: يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ، بِقَوْلِهِ: "ذَاكَ إِبْرَاهِيمُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"

﴿ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خَيْرَ الْبَرِيَّةِ کہنے کا بیان ﴾

، عَنِ الْمُخْتَارِ بْنِ فُلْفُلٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا، يَقُولُ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ، فَقَالَ: "ذَاكَ أَبِي إِبْرَاهِيمُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". (شرح مشکل الآثار:۳/۴۸، ورواہ احمد:۳/۱۸۴-۱۷۸، ومسلم(۲۳۶۹)والترمذی(۳۳۵۲)

خلاصۃ الحدیث:

اس سے پہلے باب میں یہ بات واشگاف ہوچکی ہے کہ بعض نبی کو دوسرے نبی پر جزوی طور پر فوقیت اور برتری حاصل ہے، بشرطیکہ اس سے دوسرے نبی کی تنقیص کا مستلزم نہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ م﴾ [سورہ: بقرہ:۲۵۳] یہ پیغمبر ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔

لیکن مجموعی اعتبار سے علی الاطلاق کسی نبی اور رسول کو دوسری نبی پر اگر برتری حاصل ہے تو وہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہیں، جنہیں جمیع انبیاء ورسل پر فضیلت وبرتری حاصل ہے، یہ اجماعی مسئلہ ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، ایک شاعر نے بھی اس بات کا اظہار کیا ہے ؎

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل خاص بنایا تو وہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت کی دولت سے سرفراز کرنے کے بعد اپنا خلیل ومحمود بھی بنایا، اس کے علاوہ پوری کائنات کی مخلوق کے لئے رحمت بنا کر بھیجا، ”وما ارسناك إلا رحمة للعالمين“ (الأنبياء:۱۰۷)

فَكَانَتْ هَذِهِ مَنْزِلَةً فُضِّلَ بِهَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى سَائِرِ النَّبِيِّينَ صَلَّى الله عَلَيْهِمْ فِي الدُّنْيَا وَأَعْطَاهُ فِي الْآخِرَةِ الْمَقَامَ الْمَحْمُودَ الَّذِي لَمْ يُعْطِهِ غَيْرَهُ.(شرح مشكل الآثار:۳/۵۰)

لیکن غور کرنے کا مقام ہے کہ جب ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ (اے مخلوق میں سب سے بہتر) سے خطاب کیا اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جواب کیوں دیا؟ کہ مخلوق میں سب سے بہتر وہ میرے والد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) تھے، جیسا کہ اس باب کی پہلی حضرت مختار بن فلفل کی روایت میں مذکور ہے۔

اشکال:

حدیث الباب سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف خلیل اللہ ہیں بل کہ سید الانبیاء اور خیر البشر بھی ہیں۔

دوسری طرف حدیث الباب کے آخری جزء سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خلیل بنانے کا عمل جس وقت پیش آیا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت نہیں ہوئی تھی، اور فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد میں آیا، چوں کہ ''خلت'' خاص دوستی کو کہتے ہیں، جس کے اوپر کوئی محبت نہ ہو، اسی لئے جب حدیث الباب میں حضور کو "یَا خَیْرَ الْبَرِیَّةِ" کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنے لیے محال سمجھا، اور فوراً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا خیر البریہ تو میرے والد حصرت ابراہیم (علیہ السلام) تھے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خلیل بنایا اور مقام خلت سے سرفراز فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے مستحق ہوئے، الغرض خلت میں دونوں برابر ہو گئے۔

مگر اس کے علاوہ کئی نعمتوں سے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مالا مال کیا ہے جو آپ ہی کی شایان شان ہیں، ان میں کسی ولی اور کسی نبی کی شرکت درست نہیں، مثلاً آذان وتکبیر کے کلمات میں اللہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کا ذکر ہے اشھد ان لا إله إلا الله، واشھد ان محمدًا رسول الله یہ خصوصیت وفضیلت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، پھر آپ کو آخرت میں حوض کوثر کا ملنا، اور مقام محمود بھی آپ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ مُحْتَمَلًا عِنْدَنَا وَاللهُ أَعْلَمُ أَنْ يَكُونَ كَانَ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَذَا الْقَوْلُ قَبْلَ أَنْ يَتَّخِذَهُ اللهُ خَلِيلًا ...... فَكَانَتْ هَذِهِ مَنْزِلَةً فُضِّلَ بِهَا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى سَائِرِ النَّبِيِّينَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِمْ فِي الدُّنْيَا وَأَعْطَاهُ فِي الْآخِرَةِ الْمَقَامَ الْمَحْمُودَ الَّذِي لَمْ يُعْطِهِ غَيْرَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۴۹/۳)

مقام محمود کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پانچ اور خصوصیتیں عطا کی گئیں ہیں جن میں کسی اور نبی کی شرکت ممکن نہیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ذکر ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي: جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ، وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ، وَأُرْسِلْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَبْيَضِ، وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ". (شرح مشکل الآثار: ۵۳/۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں:

(۱) میرے لئے زمین کو مسجد اور پاکی کا ذریعہ بنا دیا گیا۔

(۲) مجھے رعب کے ذریعہ مدد کی گئی۔

(۳) میرے لئے غنائم حلال کئے گئے،

(۴) مجھے سرخ اور گورے کی جانب مبعوث کیا گیا۔

(۵) اور مجھے شفاعت عامہ عطا کی گئی۔

اشکال:

حضرت ابو ہریرۃؓ کی حدیث اور حضرت حذیفہؓ کی حدیث (جو اوپر شرح مشکل الآثار میں ذکر ہے) سے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت تمام انبیاء ورسل سے برتر اور افضل ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ذلك أبی ابراهيم" "لا تخيرونی علی موسی" اور لا ينبغی لعبد أن يقول: أنا خير من يونس بن متی" کیوں کہا؟

جواب:

امام طحاویؒ نے اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ باتیں اس وقت فرمائی ہیں جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فضیلتیں نہیں عطا کی گئی تھیں، جیسا کہ امام طحاویؒ نے قلم بند کیا ہے۔

إِنَّمَا كَانَ ذَلِكَ قَبْلَ إِعْطَاءِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ إِيَّاهُ مَا ذَكَرْنَا مِنْ إِعْطَائِهِ إِيَّاهُ فِي هَذَا الْبَابِ الْعَطَايَا الَّتِي فَضَّلَهُ بِهَا عَلَى جَمِيعِ خَلْقِهِ حَتَّى صَارَ بِذَلِكَ فَاضِلًا لِأَوَّلِهِمْ وَلِآخِرِهِمْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَاللهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۵۵/۳)

محدثین کے اقوال:

امام احمد بن حنبلؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کو تواضع پر محمول کیا ہے، فقال الإمام احمد هو على وجه التواضع. (فتح الباری شرح صحیح البخاری: ۴۳/۱)

صاحب تکملۃ فتح الملہم شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے یہ جواب دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ "سید ولد آدم" ہیں، یا ایک احتمال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال دیگر انبیاء کے سلسلہ میں علی وجہ التواضع ہیں۔

اور علامہ قرطبی قلم بند کرتے ہیں:

قول رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی وجہ التواضع نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تواضع خلاف واقعہ چیز کی خبر دینے میں نہیں ہوتا، بل کہ تواضع اس بات کے اطلاق کرنے سے رکنے میں ہے، گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمایا کہ اس لفظ کو میرے اوپر اطلاق مت کرو، بلکہ اس کو حضرت ابراہیمؑ پر اطلاق کرو۔

قاله قبل ان يعلم انه سيد ولد آدم" (وليس هو من الفسخ فى الاخبار بل هما خبران صادقان حسب علم القائل فى زمانين) اما ان يكون قاله تواضعا وادبًا ، مع ابراهيم عليه السلام.

احسن ما أجاب عنه المارزى قابل يحتمل انه قاله تواضعا واستثقالا أن ينادى بذلك وابراهيم عليه السلام من أبائه ويكره التطاول على الآباء وقد يكون فهم هٰذا المعنى

ممن ناداه بذالك وقد قال فی موضع آخر "أنا سيد ولد آدم" غير قاصدا التطاول والتعاظم بل ليبين ما أمر تبليغه من ذلك ولذا عقبه بقوله ولا فخر.

وقال القرطبی: ان التواضع ليس فی الاخبار عن الشيئ بخلاف ما هو عليه وانما التواضع فی منع الاطلاق فكانه قال لا تطلقوا هذا اللفظ عليَّ واطلقوه على ابراهيم تأدّباً معه، اوصرح بهذا الكان صحيحا عقلا وشرعاً. (تکملہ فتح الملہم: ۱۱/۸)

ترجیح وجہ ترجیح:

ان اقوال میں راقم کے نزدیک امام احمد بن حنبلؒ کا قول زیادہ راجح ہے جیسا کہ ان کے قول کو حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے۔

فقال الإمام احمد هو على وجه التواضع. (فتح الباری شرح صحیح البخاری: ۱/۴۳)

باب: ۱۵۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "لَا تُخَيِّرُوا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَصَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِينَ"

﴿ ایک نبی کو دوسرے نبی پر ترجیح دینے میں احتیاط کا بیان ﴾

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تُخَيِّرُوا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ". (شرح مشكل الآثار: ۳/۵۶، ورواه البخاری (۶۹۱۶)، (ورواه ابن حبان (۶۲۳۲) ورواه احمد: ۳/۳۳، ۳۱، ومسلم: (۲۳۷۴)

خلاصۃ الحدیث:

دین اسلام ایک معتدل اور متوسط دین ہے، اس کی جمیع تعلیمات وارشادات میں اعتدال وتوازن کا عنصر غالب ہے، اسی لئے قرآن وحدیث میں جہاں ایک طرف جنت اور اس

کی نعمتوں کی بشارت دی گئی ہے تو وہیں متصلاً عذاب جہنم اور اس کی ہولنا کیوں سے خوف اور انذار بھی کیا گیا ہے، تا کہ انسان کا ایمان خوف ورجا کے درمیان قائم رہے۔

چنانچہ یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین اسلام سے کسی بھی باب میں غلو اور مبالغہ آرائی کو پنپنے نہیں دیا، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طریقہ کو نہ صرف اچھا نہیں سمجھا بلکہ ان صحابہ کرام کو اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کرنے سے منع کر دیا جس میں دوسرے انبیاء کی تنقیص لازم آئے، یہ فطری بات ہے کہ جب انسان کسی کی تعریف کرتا ہے تو اس کے قصیدے میں غلو اور مبالغہ کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے، جو دوسرے شخص کی تنقیص پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہ اسلام میں درست نہیں، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث الباب میں صحابہ کرام کو منع کیا "لا تفضّلوا بین انبیاء اللّٰہ" کہ تمام انبیاء پر مجھ کو فضیلت مت دو۔

اشکال:

اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سید الانبیاء ہیں اور جمیع انبیاء میں آپ کا مقام و مرتبہ سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو دیگر انبیا پر آپ کی فضیلت بیان کرنے سے منع کر دیا؟

جیسا کہ حدیث الباب کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی یہ مضمون مذکور ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ". (شرح مشکل الآثار: ۵۷/۳)

جواب:

امام طحاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تفضیل علی الأنبیاء کی دو شکلیں ذکر کی ہیں: ایک شکل میں درست ہے، جبکہ دوسرے انبیاء کی تنقیص لازم نہ آئے۔

دوسری شکل ممنوع ہے کہ اس عمل سے دیگر انبیاء کی تنقیص لازم آتی ہے، اور تنقیص

انبیاء کفر ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ وَكَانَ هَذَا عِنْدَنَا وَاللَّهُ أَعْلَمُ عَلَى التَّفْضِيلِ بَيْنَهُمْ وَعَلَى التَّخْيِيرِ بَيْنَهُمْ بِآرَائِنَا وَبِمَا لَمْ يُوقِفْنَا عَلَيْهِ وَلَمْ يُبَيِّنْهُ لَنَا، فَأَمَّا مَا بَيَّنَهُ لَنَا وَأَعْلَمَنَا، فَقَدْ أَطْلَقَهُ لَنَا وَعَادَ مَا نَهَى عَنْهُ فِي هَذَا الْبَابِ إِلَى مَا سِوَى ذَلِكَ مِمَّا لَمْ يُبَيِّنْهُ لَنَا وَلَمْ يُطْلِقْ لَنَا الْقَوْلَ فِيهِ بِمَا قَدْ تَوَلَّاهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ وَمَنَعَنَا مِنْهُ ،وَاللَّهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار:۵۷/۳)

محدثین کے اقوال:

محدث کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ انبیاء کے درمیان ایک کو دوسرے پر فضیلت بیان کرنا تحقیر اور سوء ادب کا سبب ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے حدیث الباب میں منع فرمایا ہے۔

لاتخيروا أى لا تفضلوا بين الأنبياء فانه ربما يفضى إلى التحقير وسوء الأدب.

(بذل المجهود:۱۳/۱۸۷، رقم الحديث:۴۶۶۸)

صاحب عون المعبود بھی حدیث الباب کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک نبی کو دوسرے نبی پر فضیلت دینا مفضول منہ کی تنقیص یا تحقیر کا سبب ہے، اور یہ باعثِ کفر ہے۔

انہوں نے حدیث الباب کا دوسرا مطلب یہ ذکر کیا ہے کہ تم نفس نبوت میں ایک کو دوسرے پر فضیلت مت دو، کیونکہ اس میں سب انبیاء برابر ہیں، ہاں تفاضل دیگر خصوصیات وفضائل میں ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾[سورہ: بقرہ: ۲۵۳] "لاتخيروا" بين الانبياء، يعنى لا تفضلوا بعضهم على بعض من عند أنفسكم، أو معناه تفضلوا تفضيلا يؤدى إلى تنقيص الفضول منهم والإزراء به، وهو كفر، أومعناه لا تفضلوا فى نفس النبوة فإنهم متساوون فيها، وإنما التفاضل بالخصائص والفضائل أخرى، كما قال تعالىٰ

:﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾[سورہ: بقرہ:۲۵۳] (عون المعبود: ۴۲۵/۱۲، ۴۲۴)

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں فضیلت کا معنی یہ ہے کہ جب وہ (ان میں) دوسرے انبیاء کی تحقیر کا سبب ہے، کیوں کے بعض مرتبہ تفضیل بین الانبیاء اعتقاد کے بگاڑ کا زینہ ہوتا ہے، حتی کہ وہ انبیاء کے حقوق کی ادائیگی میں مخل ہوتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فضائل وخصوصیاتِ انبیاء کے مابین فرق ہے اس بنا پر بعض انبیاء کو دوسرے انبیاء پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾[سورہ: بقرہ:۲۵۳]

وقال الخطابی: معنی هذا ترك التخيير بينهم على وجه الإزراء ببعضهم، فانه ربما أدى ذلك الى فساد الاعتقاد فيهم والإخلال بالواجب من حقوقهم، وليس معناه أن يعتقد التسوية بينهم فى درجاتهم، فإن اللّٰه تعالىٰ قال: تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض. (عون المعبود: ۴۲۵/۱۲)

ترجیح وجہ ترجیح:

اقوال بالا میں علامہ خطابی کا قول زیادہ راجح ہے کہ تفضیل بین الانبیاء اعتقاد کے بگاڑ کا زینہ ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔

باب: ۱۵۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي تَسْمِيَةِ الْمَوْلُودِ يَوْمَ سَابِعِهِ وَفِي تَسْمِيَتِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْضَ الْمَوْلُودِينَ قَبْلَ ذٰلِكَ

﴿ساتویں دن نومولود کا عقیقہ اور نام رکھنے کا بیان﴾

عَنِ الْحَسَنِ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "اَلْغُلَامُ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهِ" أَوْ

قَالَ: ” بِعَقِيقَةٍ تُذْبَحُ يَوْمَ السَّابِعِ، وَيُحْلَقُ رَأْسُهُ وَيُسَمَّى “. (شرح مشکل الآثار: ۵۸/۳، ورواہ الترمذی(۱۸۲)ورواہ الطبرانی (۶۸۲۷)ورواہ احمد:۸/۵-۷)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام ایک آفاقی اور عالمی مذہب ہے، یہ دین اللہ تعالیٰ کو اس لئے پسند ہے کہ اس کے سارے احکام وقوانین مرتب ومنظم ہونے کے ساتھ ساتھ اعتدال پر قائم ہیں، کسی باب میں افراط وتفریط نہیں؛ اسلام نے جہاں والدین کو اولاد پر کچھ حقوق عائد کئے ہیں وہیں ان پر اولاد کی تربیت و پرداخت کے اعتبار سے بڑی ذمہ داریاں بھی دی ہیں، ان ذمہ داریوں میں سے ایک بڑی ذمہ داری نومولود کا نام رکھنا ہے، چنانچہ یہ باب اور اس کے تحت احادیث مولود کے نام اور عقیقہ کے سلسلہ میں ہیں، جیسا کہ پہلی حدیث (جو حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے) میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لڑکا یعنی بچہ اپنے عقیقہ کے بدلہ میں مرہون ہوتا ہے، یا تو یہ فرمایا: ایسے عقیقہ کے بدلے جس کو ساتویں دن ذبح کیا جائے مرہون ہوتا ہے، اور اس کا سر حلق کیا جاتا ہے، اور پھر نام رکھا جاتا ہے۔

تعارض:

حضرت سمرہؓ کی حدیث اس بات پر دال ہے کہ نومولود کا نام ساتویں دن رکھنا چاہئے۔

عَنْ سَمُرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”كُلُّ غُلَامٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيقَة تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ، وَيُحْلَقُ رَأْسُهُ وَيُسَمَّى “. (شرح مشکل الآثار: ۵۹/۳)

جب کہ حضرت ثابت بنانیؒ کی حدیث اس کے خلاف ہے، یہ حدیث طویل ہے، اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے، کہ جب حضرت ام سلیمؓ کے بطن سے بچہ پیدا ہوا، تو اس کو لے کر وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دیکھا تو فرمایا کیا ام سلیم کے گھر لڑکا ہوا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بچہ کو آپ کی گود میں رکھ دیا، تو

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عجوہ کھجور کو طلب کیا اور اپنے دہن مبارک سے اس کو چبا کر نرم کر کے نومولود کے منہ میں ڈال دیا تو بچہ زبان کو ہلا کر اس کا ذائقہ لینے لگا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کے بچوں کی خصوصیت کو واضح کیا۔

فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "انظروا إلى حُبُّ الْأَنْصَارِ التَّمْرَ"، ومسح وجهه، وَسَمَّاهُ عَبْدَاللّٰهِ. (شرح مشکل الآثار: ۶۲/۳)

فَقُلْتُ: يَارَسُولَ اللّٰهِ وَلَدَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ فَكَرِهَتُ أَنْ أُحَنِّكَهُ حَتَّى تَكُونَ أَنْتَ تُحَنِّكُهُ، فَقَالَ: "أَمَعَكَ شَيْءٌ؟" قُلْتُ: تَمَرَاتُ عَجْوَةٍ، فَأَخَذَ مِنْ بَعْضِ ذٰلِكَ التَّمْرِ فَمَضَغَهُ فَجَمَعَهُ بِرِيقِهِ فَأَوْجَرَهُ إِيَّاهُ فَتَلَمَّظَ الصَّبِيُّ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "حُبُّ الْأَنْصَارِ لِلتَّمْرِ"، قُلْتُ: سَمِّهِ يَارَسُولَ اللّٰهِ قَالَ: "هُوَ عَبْدُاللّٰهِ". (شرح مشکل الآثار: ۶۴/۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: دیکھو! انصار کو کھجور سے کیسی محبت ہے؟ اور ان کے چہرے پر اپنا مبارک ہاتھ پھیرا، پھر اس کا نام عبداللہ رکھا۔

غور کیجئے، کہ اس روایت میں مطلقاً عبداللہ نام رکھنے کا ذکر ہے، دن کی کوئی تخصیص نہیں، اس اعتبار سے حضرت سمرہؓ اور ثابت بنانیؒ کی حدیث میں تعارض ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِيمَا رَوَيْنَا تَسْمِيَةُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنَهُ إِبْرَاهِيمَ وَعَبْدَاللّٰهِ بْنَ أَبِي طَلْحَةَ بِاسْمَيْهِمَا هٰذَيْنِ قَبْلَ يَوْمِ سَابِعِهِمَا، فَنَظَرْنَا فِي ذٰلِكَ لِنَعْلَمَ مَا الْأَوْلَى مِنَ الرِّوَايَتَيْنِ اللَّتَيْنِ ذَكَرْنَاهُمَا فِي هَذَا الْبَابِ مِنْ تَسْمِيَةِ الْمَوْلُودِ يَوْمَ سَابِعِهِ، وَمِنْ تَقْدِيمِ ذٰلِكَ قَبْلَ سَابِعِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۶۴/۳)

جمع وتطبیق:

امام طحاویؒ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ دراصل بات یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں نومولود کے نام اور عقیقہ کے سلسلہ میں جو روایت تھی اس کو ابتداء اسلام میں صحابۂ کرام

نے باقی رکھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عبداللہ اور ابراہیم کے نام رکھنے کا عمل ساتویں دن کے عمل کو منسوخ نہیں کیا، بلکہ دونوں عمل یعنی نومولود کا نام ساتویں دن سے پہلے اور ساتویں دن دونوں اعتبار سے جاری رہا، اس لئے وہ دونوں صورتوں میں جائز ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَهُ فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ فِي يَوْمِ سَابِعِ الْمَوْلُودِ هُوَ عَلَى مِثْلِ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَهُ فِيهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَأَنَّ الَّذِي كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ابْنِهِ إِبْرَاهِيمَ وَفِي عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ مِنْ تَسْمِيَتِهِ إِيَّاهُمَا قَبْلَ يَوْمِ سَابِعِهِمَا وَقَبْلَ ذَبْحِ عَقِيقَةٍ عَلَى كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَنْهُ، بِأَنَّهَا لَمْ يُنْسَخْ أَنْ يَكُونَ يَوْمَ سَابِعِهِ كَانَ طَارِئًا عَلَى ذَلِكَ وَنَاسِخًا لَهُ فَكَانَ أَوْلَى مِمَّا كَانَ قَبْلَهُ مِمَّا يُخَالِفُهُ مِمَّا ذَكَرْنَاهُ فِي هَذَا الْبَابِ، وَاللَّهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۶۵/۳)

اقوال المحدثین:

صاحب عون المعبود فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں یہ عمل جائز ہے، یعنی ساتویں دن نام رکھے، یا اس سے پہلے رکھے، دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

أصح منه فانها متفق عليها كلها ولا تعارض والأحاديث التى ذكرناها بينها فالأمران جائزان. (عون المعبود: ۲۹/۸، بحوالہ حاشیہ ابن القیم علیہ الرحمہ)

اور امام بخاریؒ نے دونوں روایتوں میں تطبیق کی راہ نکالتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں احادیث دو الگ الگ محمل پر محمول ہیں، چنانچہ ساتویں دن والی روایت کو ان مولود پر محمول کیا جائے جن کے حق میں عقیقہ کرنے کا ارادہ ہو، اور دوسری قسم کی روایات کو ان مولود پر محمول کیا جائے جن کے حق میں عقیقہ کرنے کا ارادہ نہ ہو، یعنی ایسے مولود کا نام ساتویں دن سے پہلے بال صاف کر کے رکھا جا سکتا ہے، اور امام بخاریؒ نے دوسری قسم کی روایات کے لئے بخاری شریف میں ایک باب قائم کیا ہے: "باب تسمية المولود غداة يولد لمن لم يعق عنه".

اس باب پر حافظ ابن حجرؒ رقمطراز ہیں کہ جس شخص کا عقیقہ کرنے کا ارادہ نہ ہو وہ ساتویں

دن تک مؤخر نہ کرے، جیسا کہ ابراہیم بن ابوموسی، عبداللہ بن ابوطلحہ کے قصہ میں ہے، کیوں کہ ان میں سے کسی ایک کے متعلق عقیقہ کرنا مروی نہیں ہے، اور جو شخص عقیقہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ نام رکھنے کو ساتویں دن تک مؤخر کرسکتا ہے۔

قضية رواية الفربری أن من لم يرد أن يعق عنه لا يؤخر تسميته الى السابع كما وقع فی قصة ابراهيم بن أبي موسى وعبدالله بن ابی طلحة وكذلك ابراهيم بن النبی صلى الله عليه وآله وسلم وعبدالله بن الزبير فإنه لم ينقل أنه عق عن احد منهم ومن أريد أن يعق عنه تؤخّر تسميته الى السابع۔۔(فتح الباری:۱۲/۲)

قول راجح:

مذکورہ اقوال میں امام بخاریؒ کا قول زیادہ راجح ہے۔

باب: ۱۶۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يُذْبَحُ عَنِ الْمَوْلُودِ الذَّكَرِ يَوْمَ سَابِعِهِ هَلْ هُوَ شَاةٌ أَوْ شَاتَانِ

﴿عقیقہ میں نومولود لڑکے کی طرف سے ایک یا دو بکرے ذبح کرنے کا بیان﴾

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: "عَقَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ حَسَنٍ وَحُسَيْنٍ بِكَبْشَيْنِ". (شرح مشكل الآثار: ۲۶/۳)، ورواه ابن حبان (۵۳۰۹)،ورواه ابوداود (۲۸۴۱) والطبرانی (۲۵۶۷)والبیهقی: ۳۰۲/۹)

خلاصۃ الحدیث:

لفظ عقیقہ "عَقَّ" سے مشتق ہے، جس کا معنی کاٹنے کے ہیں، اصطلاح شرع میں نومولود

بچہ یا بچی کی جانب سے اس کی پیدائش کے ساتویں دن جس جانور کا خون بہایا جاتا ہے، اُسے عقیقہ کہتے ہیں، عقیقہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ سے صحیح احادیث سے ثابت ہے، اس کے بے شمار فوائد ہیں، چند اہم فوائد بطور ترغیب کے یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) زندگی کی ابتدائی ایام میں نومولود بچہ یا بچی کے نام سے خون بہا کر اللہ تعالیٰ سے اس کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے۔

(۲) بچہ یا بچی کی پیدائش پر جو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳) عقیقہ کی دعوت سے رشتہ دار، دوست واحباب اور دیگر متعلقین کے درمیان تعلق بڑھتا ہے، جس سے ان کے درمیان محبت والفت پیدا ہوتی ہے۔

(۴) عقیقہ کی وجہ سے نومولود کو اللہ کے حکم سے بعض آفتوں اور بیماریوں سے راحت ملتی ہے، نیز قیامت کے دن عقیقہ کرانے والے بچہ یا بچی کی شفاعت کے مستحق ہوں گے۔

بہر حال تفصیل بالا سے اب عقیقہ کی اہمیت وفضیلت کے سلسلہ میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا، لیکن یہاں موضوع بحث یہ ہے کہ ہر بچی یا بچہ کی طرف سے عقیقہ میں ایک مینڈھا یا بکری ذبح کرنا کافی ہے؟ اس سلسلہ میں امام طحاویؒ نے حضرت انسؓ کی حدیث (جو حدیث الباب ہے) پیش کی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ کی طرف سے دو مینڈھے ذبح کئے۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ نومولود کے ساتویں دن ایک بکری ذبح کرے یہ عقیقہ کے لئے کافی ہے چاہے وہ مولود لڑکا ہو یا لڑکی۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ وَفِيمَا رَوَيْنَا مَا قَدْ دَلَّ عَلَى أَنَّ الَّذِي يُذْبَحُ عَنِ الْمَوْلُودِ الذَّكَرِ يَوْمَ سَابِعِهِ شَاةٌ وَاحِدَةٌ كَمَا يُذْبَحُ عَنِ الْأُنْثَى. (شرح مشکل الآثار: ۶۷/۳)

تعارض:

حدیث الباب اور حضرت انس ؓ کی حدیث اس بات پر دال ہے کہ نومولود کے عقیقہ میں ایک میڈھا کافی ہے، نومولود چاہے لڑکا ہو یا لڑکی۔

لیکن حضرت ام کُرز الکعبیہ کی حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نومود اگر لڑکا ہے تو اس کی طرف سے عقیقہ میں دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا ذبح کیا جائے۔

عَنْ سِبَاعِ بْنِ ثَابِتٍ، سَمِعَهُ مِنْ أُمِّ كُرْزٍ الْكَعْبِيَّةِ الَّتِي تُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ لَا يَضُرُّكُمْ ذُكْرَانًا كُنَّ أَوْ إِنَاثًا".

(شرح مشکل الآثار: ۳/۶۷)

اس اعتبار سے حدیث الباب اور حضرت ام کرز ؓ کی حدیث میں تعارض واقع ہے۔

جمع وتطبیق:

عقیقہ کے سلسلہ میں روایات کے مابین تعارض کو دور کرنے کے لئے امام طحاویؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ دراصل ان روایات میں تعارض نہیں ہے، جس طرح قربانی اور حج تمتع اور حج قِران کی قربانی میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح جانور کی قربانی مذکر اولاد کی طرف سے درست ہے، اسی طرح جانور کی قربانی مؤنث اولاد کی طرف سے بھی درست ہے، اسی طرح دَم کی ادائیگی میں بھی، لہذا جس طرح نومولود لڑکی کی طرف سے ایک بکرا بطور عقیقہ ذبح کرنا درست ہے اسی طرح نومولود لڑکے کی طرف سے بھی، رہا یہ سوال کہ پھر حدیث الباب اور حضرت ام کرز ؓ اور عائشہ ؓ کی حدیث میں کیوں فرق ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہ عقیقہ مستحب ہے؛ البتہ استحباب کی دو قسمیں ہیں: ایک استحباب اعلیٰ اور دوسری قسم استحباب ادنیٰ ہے، لہذا حدیث الباب کا حکم استحباب ادنی کے قبیل سے ہے اور دوسری فصل کی حدیث استحباب اعلیٰ کے قبیل سے ہے؛ لہذا فصل اول کی

حدیث کو استحباب ادنی پر محمول کریں گے اور فصل ثانی کی روایات کو استحباب اعلیٰ پر، تاکہ دونوں میں تطبیق ہو جائے، لیکن یہ بات یاد رہے کہ یہاں پر ناسخ و منسوخ کا قاعدہ نہیں جاری کیا گیا۔

فَفِيمَا رَوَيْنَا فِي هَذَا الْفَصْلِ الثَّانِي الْمُخَالَفَةُ بَيْنَ مَا يُذْبَحُ عَنِ الذَّكَرِ يَوْمَ سَابِعِهِ، وَبَيْنَ مَا يُذْبَحُ عَنِ الْأُنْثَى يَوْمَ سَابِعِهَا، وَأَنَّهُ يُذْبَحُ عَنِ الذَّكَرِ شَاتَانِ وَعَنِ الْأُنْثَى شَاةٌ وَاحِدَةٌ وَلَوْ خُلِّينَا وَآرَاءَنَا فِي ذَلِكَ لَكَانَ لَا فَرْقَ بَيْنَ مَا يُذْبَحُ عَنِ الْغُلَامِ وَبَيْنَ مَا يُذْبَحُ عَنِ الْجَارِيَةِ فِي ذَلِكَ كَمَا لَا فَرْقَ بَيْنَ مَا يُذْبَحُ عَنْ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا فِي الْأَضَاحِيِّ. وَكَمَا لَا فَرْقَ بَيْنَ مَا يُذْبَحُ عَنْ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا فِي الْمُتَعِ وَفِي الْقِرَانِ وَفِيمَا يَلْزَمُ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا فِيمَا يُصِيبُهُ فِي إِحْرَامِهِ مِنَ الدِّمَاءِ وَلَكِنَّا لَمْ يُخَلَّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ ذَلِكَ، وَرَدَدْنَا إِلَى مَا وَقَفْنَا عَلَيْهِ مِنْ مَا قَدْ رَوَيْنَاهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ هُوَ الْأَوْلَى بِنَا، وَكَانَ مَا رَوَيْنَاهُ فِي الْفَصْلِ الثَّانِي مِنْ هَذَا الْبَابِ أَوْلَى الْأَشْيَاءِ أَنْ نَسْتَعْمِلَهُ، لِأَنَّ فِيهِ الزِّيَادَةَ عَلَى مَا رَوَيْنَاهُ فِي الْفَصْلِ الْأَوَّلِ مِنْهُ، فَيَكُونُ مَا أُمِرْنَا بِهِ مِنَ الزِّيَادَةِ عَلَى مَا أُمِرْنَا بِهِ فِي الْفَصْلِ الْأَوَّلِ مُسْتَعْمَلًا، وَيَكُونُ أَبَدًا عَلَى مَا أُمِرْنَا بِهِ فِي الْفَصْلِ الْأَوَّلِ وَأَنْ لَا نَجْعَلَ مَا فِي الْفَصْلِ الثَّانِي مِنَ الزِّيَادَةِ مَنْسُوخًا بِمَا فِي الْفَصْلِ الْأَوَّلِ حَتَّى نَقِفَ عَلَى أَنَّهُ فِي الْحَقِيقَةِ كَذَلِكَ، وَاللَّهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/ ۷۱)

محدثین کے اقوال:

مشہور محقق ملا علی قاریؒ قلم بند کرتے ہیں کہ عقیقہ مندوب و مستحب ہے، اور ندب کی دو قسمیں ہیں: ایک ندب اقل اور دوسری قسم ندب کامل۔ وہ روایت جس میں ایک شاۃ ذبح کرنے کا ذکر ہے اسے اقل ندب پر محمول کیا جائے اور دو شاۃ والی حدیث کو کمال ندب پر، اس توجیہ سے مذکورہ بالا روایات میں جو تعارض ہے وہ دور ہو جائے گا۔

البتہ ایک جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے ایک ہی میڈھا کو ذبح

کیا، لیکن حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو دوسرا ذبح کرنے کا حکم فرمایا، تو اس صورت میں ایک شاۃ کی نسبت آپ کی طرف حقیقت میں ہے اور دو شاۃ کی نسبت مجازاً ہے۔

وأما الغلام فتحتمل أن يكون أقل الندب في حقه عقيقة واحدة وكماله ثنتان والحديث لبيان الجواز في الاكتفاء بالأقل أو دلالة على أنه لايلزم من ذبح الشاتين أن يكون في يوم السابع فيمكن أنه ذبح عنه في يوم الولادة كبشا وفي السابع كبشاً وبه يحصل الجمع بين الروايات.

أو عق النبي صلى الله عليه وآله وسلم من عنده كبشا وأمر عليا وفاطمة بكبش آخر، فنسب إليه صلى الله عليم وسلم أنه عق كبشا على الحقيقة وكبشين مجازًا. (مرقاة المفاتيح: ۸/۸۰)

اسی طرح علامہ عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ لڑکے کے لئے تعدد کا قول راجح ہے، پھر ابن رشد مالکی کا قول نقل کرتے ہیں کہ جو شخص شاتین والے قول پر عمل کرے گا تو وہ خطا نہیں کرے گا، کیوں کہ امام ترمذیؒ نے حضرت عائشہؓ سے حدیث صحیح کو نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ لڑکے کی طرف سے دو بکری اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری سے عقیقہ کیا جائے، اور انہوں نے ملا علی قاریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک پر اکتفا کرنا تعدد کے فضل سے منافی نہیں۔

فالمرجح يكون هو التعدد للغلام ولهذا قال ابن رشد المالكي رحمه الله: من عمل به فما اخطأ بل أصاب لما صححه الترمذي عن عائشة أن النبي صلى الله عليه وآله وسلم: أمر أن يعق عن الغلام شاتان وعن الجارية بشاة نقله الزرقاني وقال القاري: لا يخفى أن الاكتفاء بواحد لاينافي فضل التعدد. (التعليق الممجد مؤطا محمد على هامش مؤطا للامام مالك: ۲/۲۶۲)

اور صاحب تنظیم الاشتات نے جوابات لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عقیقہ کے سلسلہ میں دونوں روایات صحیح ہیں، لیکن شاتان والی روایت زیادہ صحیح ہے، وجہ یہ ہے کہ صحابہ کی ایک

جماعت نے اس کو روایت کیا ہے اس لئے یہ روایت راجح ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دونوں حدیثوں میں ایک حدیث قولی ہے تو دوسری فعلی ، اور محدثین کے یہاں یہ اصول ہے کہ جب قولی اور فعلی حدیث میں تعارض ہو تو قولی حدیث کو فعلی حدیث پر ترجیح حاصل ہوتی ہے، چوں کہ شاتین والی حدیث قولی ہے اس لئے اس کو شاۃ والی حدیث پر ترجیح حاصل ہوگی۔(تنظیم الأشتات:۱۲۳/۳)

ترجیح اور وجہ ترجیح:

محدثین کے اقوال میں علامہ عبدالحی لکھنویؒ کا قول عاجز کے نزدیک راجح ہے کہ لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا ذبح کرنا چاہئے، اس کی دو وجہیں ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے حضرت عائشہؓ سے حدیث نقل کی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا ذبح کرنے کا حکم دیا۔

عن يوسف بن ماهك ، أنهم دخلوا على حفصة بنت عبدالرحمن، فسألوها عن العقيقة فاخبرتهم أن عائشة أخبرتها أن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم أمرهم عن الغلام شاتان مكافئتان وعن الجارية شاة. (سنن الترمذی:أبواب الأضاحی: باب ماجاء فی العقيقة، رقم:۱۵۱۳)

دوسری وجہ یہ ہے کہ تعدد والی روایت قولی ہے اور توحد والی فعلی، اور دونوں میں محدثین کے یہاں قولی کو فعلی پر ترجیح حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ صاحب تنظیم الاشتات نے صراحت کی ہے۔

باب: ۱۶۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: ’’وَأَمِيطُوا عَنْهُ الْأَذَى‘‘ يَعْنِي مَا يُفْعَلُ بِالْمَوْلُودِ فِي يَوْمِ سَابِعِهِ

﴿ عقیقہ کی فضیلت واہمیت ﴾

عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الضَّبِّيِّ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "فِي الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ، فَأَهْرِيقُوا عَنْهُ دَمًا وَأَمِيطُوا عَنْهُ الْأَذَى". (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۷، ورواه البیهقی: ۹/ ۲۹۷، ورواه احمد: ۴/۱۸، والنسائی: ۷/۱۶۴، رقم: ۴۲۱۴، والترمذی: ۱۵۱۵، وابوداود: ۲۸۳۹، وابن ماجه: ۳۱۶۴، والدارمی: ۲۰۱۰)

خلاصۃ الحدیث:

انسان کا تعلق چاہے کسی بھی مذہب سے ہو، اس کی سرشت وفطرت طہارت ونظافت اور صفائی ستھرائی پر بنائی گئی ہے، وہ پاکی کو پسند کرتا ہے اور ناپاکی سے نفرت، جہاں صفائی وستھرائی سے اس کی طبیعت میں نشاط وانشراح اور تازگی آتی ہے، تو غلاظت ونجاست سے طبیعت میں انقباض اور تکدر پیدا ہوتا ہے، اسلام چوں کہ دین فطرت ہے، اس لئے جہاں اس نے مسلمانوں کے لئے طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہے، اسی طرح بعض چیزیں جو ناپاک ونجس تو نہیں، لیکن ان کا اپنی مدت سے بڑھ جانا خلاف اولی وافضل قرار دیا ہے، جیسے بدن کے غیر ضروری بالوں کا اور ناخن کا اپنی مدت سے بڑھ جانا ان کو بھی اسلام نے طہارت ونظافت کے منافی تسلیم کیا ہے، اسی لئے اسلام نے جہاں بڑوں کو بغل کے بال اور زیر ناف کے بال کی صفائی کا حکم دیا ہے وہیں نومولود کی طرف سے نیک فالی کے طور پر جانور (بطور عقیقہ) کا خون بہانے کا حکم دیا ہے نیز سر کے بالوں کو تراشنے کا حکم بھی دیا ہے۔

چنانچہ اس باب کی پہلی روایت میں ''الاذی'' سے یہی مراد ہے، اور اسی کو امام طحاویؒ نے کئی احادیث سے ثابت کیا ہے کہ بچہ کے لئے عقیقہ ایک مستحسن عمل ہے، اس کی طرف سے نیک فالی کے طور پر خون بہانے کا حکم دیا ہے۔

تعارض:

حدیث الباب میں "أمیطوا عنه الأذی" میں "الاذی" سے کیا مراد ہے؟ اس سے آیا وہ بکرا مراد ہے، جو نومولود کی طرف سے ذبح کیا جاتا تھا اور اس کے سر کو خون سے لت پت کیا جاتا تھا، اس کو صاف کرنا مراد ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كُنَّا فِي الْجَاهِلِيَّةِ إِذَا وُلِدَ لَنَا غُلَامٌ ذَبَحْنَا عَنْهُ شَاةً وَلَطَّخْنَا رَأْسَهُ بِدَمِهَا. (شرح مشکل الآثار: ۷۵/۳)

یا اس سے نومولود کے سر کے بال مراد ہیں، جسے زعفران سے لیپ کر صاف کرتے ہیں۔

ثُمَّ كُنَّا فِي الْإِسْلَامِ إِذَا وُلِدَ لَنَا غُلَامٌ ذَبَحْنَا عَنْهُ شَاةً وَلَطَّخْنَا رَأْسَهُ بِالزَّعْفَرَانِ. (شرح مشکل الآثار: ۷۵/۳)

اسی طرح حضرت عائشہؓ کی حدیث حضرت عبداللہ بن بریدہ کی حدیث سے مختلف ہے کیوں کہ اس حدیث میں "الاذی" سے نومولود کے سر کے بال مراد ہیں، چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ کی طرف سے ساتویں دن عقیقہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سر سے "اذی" کو صاف کرنے کا حکم دیا۔

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: عَقَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ حَسَنٍ وَحُسَيْنٍ يَوْمَ السَّابِعِ وَسَمَّاهُمَا وَأَمَرَ أَنْ يُمَاطَ عَنْ رَأْسِهِ الْأَذَى، يَعْنِي عَنْ رُءُوسِهِمَا. (شرح مشکل الآثار: ۷۵/۳)

اس اعتبار سے حضرت بریدہؓ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں تعارض واقع ہے۔

جمع وتطبیق:

وکیل الاحناف امام طحاوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ "امیطو عنه الاذی" سے نومولود کے

سر کے بال مراد ہیں، جنہیں ولادت کے بعد صاف کیا جاتا ہے، جیسا کہ امام طحاویؒ کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ الْإِمَاطَةَ الَّتِي أَرَادَهَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هِيَ الْإِمَاطَةُ عَنْ رَأْسِ الصَّبِيِّ الْمَذْبُوحِ عَنْهُ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ مَا يُذْبَحُ عَنْهُ فِيهِ۔(شرح مشکل الآثار:۳/۷۵)

امام طحاویؒ کی اس توجیہ سے حضرت عائشہؓ کی حدیث کی ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ "واميطوا عنه الاذى" سے نومولود کے سر کے بال مراد ہیں، جو فی نفسہ ناپاک نہیں ہیں، لیکن زیادہ مدت تک سر پر بال ہونے کی وجہ سے نظافت وصفائی کے خلاف ہیں، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولادت کے بعد صاف کرنے کا حکم دیا ہے۔

جہاں تک حضرت عبداللہ بن بریدہؓ کی حدیث کا تعلق ہے تو اس سے زمانۂ جاہلیت کی رسم کی عکاسی ہوتی ہے، جس کی طرف امام طحاویؒ نے درج ذیل عبارت سے اشارہ کیا ہے:

فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ الْأَذَى الَّذِي أُمِرَ بِإِمَاطَتِهِ عَنْ رَأْسِ الْمَوْلُودِ هُوَ الدَّمُ الَّذِي كَانَ يُلَطَّخُ بِهِ رَأْسُهُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔ (شرح مشکل الآثار:۳/۷۵)

امام طحاویؒ نے ''الْأَذَى'' سے نومولود کے سر کے بال مراد لیے ہیں، اور اس کی دلیل قرآن مجید کی وہ آیت ہے جو "محصر عن البیت" کے سلسلہ میں ہے یعنی اگر کوئی عمرہ سے پہلے مریض ہوگیا یا سر میں جوئی ہوگئی تو عمرہ فاسد ہونے کی صورت میں سر کے بالوں کا حلق کرانا پڑتا ہے، اسی طرح اگر کسی محرم کے سر میں جوئی ہوگئی ہے، جس سے ضرر ہو رہا ہے، تو سر کے بال کو حلق کرا سکتا ہے لیکن اس پر فدیہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

بہر حال جس طرح اس آیت ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ

صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ [البقرة:۱۹۶]، میں ''الْأَذیٰ'' سے محصر کے سر کے بال مراد ہیں اسی طرح ''امیطوا عنه الأذیٰ'' سے نومولود کے سر کے بال مراد ہیں۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَقَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ الْأَذَى الَّذِي يُمَاطُ عَنْ رَأْسِهِ هُوَ حَلْقُ الشَّعْرِ الَّذِي عَلَيْهِ كَمِثْلِ الْمُرَادِ فِي قَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ [البقرة:۱۹۶]، يُرِيدُ بِذَلِكَ الْمَحْصُورِينَ عَنِ الْبَيْتِ فِي الْعُمْرَةِ الَّتِي تَوَجَّهُوا لَهَا مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَاللهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا ذَكَرْنَا، وَإِيَّاهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار:۳/۷۵)

اقوال المحدثین:

کئی محدثین نے یہاں ''الْأَذَی'' سے بچے کے سر کے بال ہی مراد لیئے ہے، چنانچہ علامہ عینیؒ توضیح کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

''اماطة الأذیٰ عن الصبی'' سے نومولود کے سر کے بال کو حلق کرنا مراد ہے، ''اماطة الأذیٰ عن الصبی حلق الشعر الذی علی رأسه''. (عمدة القاری:۲۱/۸۵)

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث جس کو حاکم نے روایت کیا ہے، اس میں ''وأمر أن یماط عن رؤوسها الأذی'' ہے؛ لیکن یہ حلق رأس کے ساتھ متعین نہیں، کیوں کہ ابن عباسؓ کی حدیث جو طبرانی میں ہے، اس میں ''ویماط عنه الأذیٰ ویحلق رأسه'' ہے تو حلق رأس کو ''ویماط عنه الأذیٰ'' پر عطف کرنا لازم آئے گا (حالانکہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت پائی جاتی ہے) اس لئے ''الأذیٰ'' حلق رأس پر محمول کرنے کے مقابلہ میں عام رکھنا ہی بہتر اور اولیٰ ہے، اور اس کی تائید حضرت عمرو بن شعیب والی حدیث کے

بعض طرق سے ہوتی ہے، جس میں ”ویماط عنه اقذاره“ ہے۔

ووقع فی حدیث عائشة عند الحاکم“ وأمر أن یماط عن رؤوسهما الأذٰی“ ولکن لا یتعین ذلك فی حلق الرأس فقد وقع فی حدیث ابن عباس عند الطبرانی ، ”ویماط عنه الأذی ویحلق رأسه“فعطفه علیه فالأولی حمل الأذی علی ماهو أعم من حلق الرأس ویؤید ذلك أن فی بعض طرق حدیث عمروبن شعیب ویماط عنه اقذاره.(فتح الباری: ۱۲/۱۰)

محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے ”الأذیٰ“ سے نومولود کے سر کے بال مراد لئے ہیں، چنانچہ اپنی کتاب ”بذل المجهود“ میں ”واميطوا عنه الأذی “کی تشریح میں لکھتے ہیں، ”احلقوا رأسه وأزیلوا عنه شعره“یعنی اس کے سر کو حلق کردو اور اس کے بالوں کو اس سے دور کردو۔

نیز صاحب بذل نے علامہ کرمانیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے:

وقال الکرمانی: أی امیطوا أثردم رحم أولا تلطخوا رأسه بدمها کالجاهلیة أو المراد جلدة الختان، وعن محمد بن سیرین: طلبنا معناه فلم نجد من یعرفه، وأخرج البیهقی عن محمد قلت معناه: أزیلوا عنه کل مااحتمله فلا یختص بواحد.(بذل المجهود: ۹/۶۱۴-۶۱۳)

اور علامہ خطابیؒ نے بھی ”الْأَذَی“ سے حلق الرأس ہی مراد لیا ہے، چنانچہ ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

”اماطة الأذی“ کا معنی حلق الرأس وازالة ما علیه من الشعر ہے، جیسا کہ ابوداؤد کی تعلیق میں عزت عبید اور عادل السید نے نقل کیا ہے۔(سنن ابی داود: ۳/۱۷۷)

باب: ۱۶۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْعَقِيقَةِ وَهَلْ هُوَ عَلَى الْوُجُوبِ أَوْ عَلَى الِاخْتِيَارِ؟

﴿ اسلام میں عقیقہ کی حیثیت ﴾

أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "الْمَوْلُودُ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهِ".

عَنْ أَنَسٍ: "أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنْ نَفْسِهِ بَعْدَمَا جَاءَتْهُ النُّبُوَّةُ". [(شرح مشکل الآثار:(۳/۷۸)، ورواه الطبراني في الاوسط(۹۹۸) ورواه ابن حزم في المحلى:(۷/۵۲۸)، ورواه البزار(۱۲۳۷)]

خلاصۃ الحدیث:

چوں کہ اس سے پہلے دو ابواب میں عقیقہ سے متعلق امام طحاویؒ نے کلام کیا ہے، اس لئے ان ابواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس باب میں عقیقہ کے اس شق پر روشنی ڈالی ہے کہ آیا عقیقہ واجب ہے یا تطوع اختیاری ہے؟

اس سلسلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے، چناں چہ بعض حضرات عقیقہ کے وجوب کے قائل ہیں، جب کہ جمہور علماء استحباب یا سنت کے قائل ہیں۔

وجوب کے قائل کی دلیل:

امام طحاویؒ نے ترجمۃ الباب کے بعد حدیث کے ایک جزء کو ذکر کیا ہے جو مختلف

الفاظ کے ساتھ مروی ہے، کسی سے "المولود مرتھن لعقیقته" مروی ہے تو کسی سے "کل مولود/غلام مرتھن/رھینة/رھین بعقیقة" کے الفاظ آئے ہیں، جس کا معنی گروی رکھنا ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر بچہ محبوس اور مقید رہتا ہے، اپنے عقیقہ کے ساتھ اور بچہ کا عقیقہ کرنا واجب ہے، تاکہ یہ بچہ مصیبت سے محفوظ رہے، اور بعض احادیث میں "امر" کا صیغہ استعمال کیا ہے، اور امر کا صیغہ وجوب پر دلالت کرتا ہے، امام طحاویؒ نے حضرت انسؓ کی حدیث کو وجوب کے قول کی تائید کے لئے یہاں پیش کیا ہے۔

جمہور کی دلیل:

حضرت عمرو بن شعیبؒ کی حدیث ہے جس میں آپ ﷺ سے عقیقہ کے متعلق دریافت کیا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا میں عقیقہ کو پسند نہیں کرتا، یعنی لغوی اعتبار سے یہ "لفظ" اچھا نہیں سمجھا، اور جس کے یہاں بچہ پیدا ہو پھر وہ اس بچہ کی طرف سے خون بہانا چاہے تو بہائے یعنی عقیقہ کرنا چاہے تو کرے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث اور اس کے بعد والی حدیث عدم وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَقِيقَةِ فَقَالَ: "لَا أُحِبُّ الْعُقُوقَ"، وَكَأَنَّهُ كَرِهَ الِاسْمَ، قَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّمَا نَسْأَلُكَ عَنْ أَحَدِنَا يُولَدُ لَهُ قَالَ: "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَنْسُكَ عَنْ وَلَدِهِ فَلْيَنْسُكْ عَنْهُ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافَأَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ" قَالَ دَاوُدُ: فَسَأَلْتُ زَيْدَ بْنَ أَسْلَمَ عَنِ الْمُكَافَأَتَيْنِ قَالَ: الشَّاتَانِ الْمُشْبِهَتَانِ يُذْبَحَانِ جَمِيعًا. (شرح مشکل الآثار:۸۰/۳)

تعارض:

حدیث الباب حضرت انسؓ کی حدیث میں یہ بات ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نبوت کے بعد اپنی طرف سے عقیقہ کیا، یہ حدیث عقیقہ کے وجوب پر دال ہے، جیسا کہ امام

طحاویؒ نے ذکر کیا ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ فَكَانَ فِيمَا رَوَيْنَا مِنْ هٰذَا تَوْكِيدُ وُجُوبِهَا، ثُمَّ نَظَرْنَا هَلْ رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يُخَالِفُ ذٰلِكَ أَمْ لَا؟ (شرح مشکل الآثار: ۷۸/۳)

لیکن وہیں حضرت عمرو بن شعیب کی حدیث میں عقیقہ کے سلسلہ میں جو فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

قَالَ: "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَنْسُكَ عَنْ وَلَدِهِ فَلْيَنْسُكْ عَنْهُ، عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافَأَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ". (شرح مشکل الآثار: ۸۰/۳)

یعنی جو اپنے مولود کی طرف سے عقیقہ کرنا چاہے تو کرے، یہ استحباب پر دال ہے، اس اعتبار سے دونوں حدیثوں میں تعارض واقع ہے۔

جمع وتطبیق:

امام طحاویؒ نے اس تعارض کو اس طرح دور کیا ہے کہ حضرت انسؓ والی حدیث زمانۂ جاہلیت کے رسوم پر دال ہے، کیوں کہ زمانۂ جاہلیت میں عقیقہ کرنا واجب تھا، ابتداء اسلام میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا، لیکن بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واجب کو منسوخ کر دیا، اب عقیقہ سنت واستحباب کے درجہ میں باقی ہے، اور اسی معنی پر حضرت عمرو بن شعیب کی حدیث دال ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ مَا فِي هٰذَيْنِ الْحَدِيثَيْنِ قَدْ دَلَّ أَنَّ أَمْرَهَا قَدْ رُدَّ إِلَى الِاخْتِيَارِ لِقَوْلِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ وُلِدَ لَهُ مَوْلُودٌ فَأَرَادَ أَوْ أَحَبَّ أَنْ يَنْسُكَ عَنْهُ فَلْيَفْعَلْ" وَكَانَ مَا قَدْ رَوَيْنَاهُ قَبْلَ ذٰلِكَ فِي تَوْكِيدِ أَمْرِهَا هُوَ عَلَى حَسَبِ مَا كَانَتْ عَلَيْهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، ثُمَّ جَاءَ

الْإِسْلَامُ فَأُقِرَّتْ عَلَى مَا كَانَتْ عَلَيْهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ مَا رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا قَدْ خَالَفَ ذَلِكَ كَانَ طَارِئًا عَلَيْهِ وَنَاسِخًا لَهُ وَاللَّهَ نَسْأَلُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۸۱)

اقوال المحدثین:

مشہور محقق علامہ عبدالحی لکھنویؒ اس باب کی تمام احادیث پر کلام کرنے کے بعد قلم بند کرتے ہیں کہ اکثر احادیث اس بات پر دال ہیں کہ عقیقہ گرچہ واجب نہیں؛ مگر مستحب تو ضرور ہے، امام ابوحنیفہؒ کے یہاں عقیقہ مباح ہے، ممکن ہے کہ یہ سب احادیث ان کو نہ پہنچی ہوں۔

وفی الباب أخبار وأحادیث ۔۔۔وھی کلھا تشھد بمشروعیة العقیقة بل بعضھا یدل علی الوجوب وبه استدل من قال به، ولکن أکثرھا یدل علی خلافه، فإن لم یکن واجبا فلا أقل من أن یکون مستحبا بل سنة ولعلھا لم تبلغ امامنا حیث قال: انھا مباحة ولیست بمستحبة. (التعلیق الممجد علی مؤطا محمد: ۲/۶۵۹)

حافظ ابن حجرؒ نے ایک جواب یہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نبوت کے بعد عقیقہ کرنا یہ آپ کے خصائص میں سے تھا، لہذا عقیقہ امت پر لازم نہیں۔

ویحتمل أن یقال: إن صح ھذا الخبر کان من خصائصه صلی اللہ علیه وآله وسلم کما قالوا فی تضحیته عمن لم یضح من أمته. (فتح الباری: ۵/۵۹۵)

علامہ ابن قدامہ نے امام محمدؒ کی بات نقل کی ہے کہ عقیقہ واجب نہیں ہے؛ بلکہ مستحب ہے، اس وجہ سے کہ یہ ایک ذبیحہ ہے جو خوشی کی وجہ سے کیا جاتا ہے، لہذا یہ مستحب ہے، جیسے ولیمہ اور نقیعہ (وہ کھانا جو مہمان کے آنے پر پکایا جاتا ہے) مستحب ہے واجب نہیں۔

واما بیان کونھا غیر واجبة، فدلیله ما احتج به اصحاب الرأي من الخبر وما رووه

محمول على تأكيد الاستحباب جمعًا بين الاخيار، ولأ نها ذبيحة لسرور حادث فلم تكن واجبة كالوليمة والنقيعة. (ذخیرة العقبی فی شرح المجتبی:۳۲/۳۴۵)

علامہ عینیؒ بھی مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ والی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ حدیث استحباب پر دال ہے۔

فهذا الحديث يدل على الاستحباب. (عمدة القاری: ۲۱/۸۳)

راجح قول: محدثین اور فقہاء کے اقوال سے یہ بات عیاں ہوئی کہ عقیقہ واجب نہیں؛ بلکہ مستحب ہے۔

باب: ۱۶۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْعَتِيرَةِ، وَهَلْ هِيَ الرَّجَبِيَّةُ أَمْ لَا؟

﴿ عتیرہ کی حقیقت اور اس کا حکم ﴾

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ فِي إِمْلَائِهِ عَلَيْهِمْ قَالَ: وَذَبْحٌ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، كَانُوا يَذْبَحُونَ فِي رَجَبٍ شَاةً وَهِيَ الرَّجَبِيَّةُ كَانَ أَهْلُ الْبَيْتِ يَذْبَحُونَهَا فَيَأْكُلُونَ وَيَطْبَخُونَ وَيُطْعِمُونَ. وَالْعَتِيرَةُ كَانَ الرَّجُلُ إِذَا وَلَدَتْ لَهُ النَّاقَةُ أَوِ الشَّاةُ ذَبَحَ أَوَّلَ وَلَدٍ تَلِدُهُ لَهُ فَأَكَلَ وَأَطْعَمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسُئِلَ عَنِ الْعَتِيرَةِ فَقَالَ: "أَنْ يَدَعَهُ حَتَّى يَكُونَ شُغْزُبًا خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَنْحَرَهُ، يَلْصَقُ لَحْمُهُ بِوَبَرِهِ وَتَكْفَأُ إِنَاءَكَ وَتُوَلِّهِ نَاقَتَكَ". (شرح مشكل الآثار: ۳/۸۲، ورواه عبدالرزاق (۷۹۹۵) وأحمد (۲/۱۸۳، و۱۸۷) وأبوداود (۲۸۴۲)

خلاصة الحديث:

عتیرہ اس جانور کو کہتے ہیں جسے رجب کے پہلے دس دنوں میں ذبح کیا جاتا تھا، اور اسی کو ''رجبیہ'' بھی کہا جاتا تھا، اسلام سے قبل ماہ رجب میں لوگ جانور ذبح کرتے تھے جسے ''عتیرہ'' یا ''رجبیہ'' کہا کرتے تھے، اسی طرح اوائل اسلام میں بھی یہی معمول چلتا رہا، یہاں تک امام طحاویؒ نے امام محمد بن الحسنؒ کے قول کو نقل کیا ہے کہ انہوں نے ذکر کیا کہ زمانۂ جاہلیت میں ماہ رجب میں جو بکری ذبح کی جاتی، اس کا گوشت خود کھاتے اور دوسرے کو کھلاتے، اسی کو رجبیہ کہتے۔

نیز یہ فرمایا جب کسی کے یہاں اونٹنی یا بکری کا بچہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے اس بچے کو بتوں کے نام سے ذبح کر دیتے، پھر خود کھاتے اور دوسرے کو کھلاتے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ''عتیرہ'' کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ اس بچہ کو جوان ہونے تک چھوڑے رکھنا یہ بہتر ہے اس بات سے کہ پیدا ہونے کے بعد فوراً اس کو ذبح کرے، اور اس کے کھال کے ساتھ اس کے گوشت کو لگا رہنے دے اور اپنے برتن کو اوندھا کرے، اور اس کی ماں کو تکلیف پہنچائے۔

الغرض امام محمد بن الحسنؒ کے یہاں ''عتیرہ'' اور ''رجبیہ'' میں فرق ہے، البتہ امام شافعیؒ کے یہاں ''عتیرہ'' کو ہی ''رجبیہ'' کہتے ہیں۔

قَالَ الشَّافِعِيُّ: وَالْعَتِيرَةُ هِيَ الرَّجَبِيَّةُ، وَهِيَ ذَبِيحَةٌ كَانَ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَتَبَرَّرُونَ بِهَا يَذْبَحُونَهَا فِي رَجَبٍ فَكَانَ فِيمَا رُوِّينَا عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ أَنَّ الْعَتِيرَةَ خِلَافُ الرَّجَبِيَّةِ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۸۳)

اوپر کی توجیہ سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ امام شافعیؒ اور امام محمد بن الحسنؒ کے یہاں عتیرہ اور رجبیہ کے سلسلہ میں اختلاف ہے، یعنی امام شافعیؒ کے یہاں ''عتیرہ'' اور ''رجبیہ'' دونوں ایک

ہیں، چنانچہ جو جانور رجب کے مہینہ میں ذبح کیا جاتا اس کو عتیرہ اور رجبیہ کہتے تھے، مگر امام محمد بن الحسنؒ نے دونوں میں فرق کیا ہے۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ دونوں ائمہ کرام کی رائے میں کس کی رائے زیادہ صحیح ہے؟ اور اس سلسلہ میں کوئی حدیث ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں امام طحاویؒ نے مخنف بن سلیم کی ایک حدیث پیش کی ہے جس سے امام شافعی کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

عَنْ مِخْنَفِ بْنِ سُلَيْمٍ، قَالَ: وَنَحْنُ وُقُوفٌ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَفَةَ فَقَالَ: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ عَلَى أَهْلِ كُلِّ بَيْتٍ فِي كُلِّ عَامٍ أُضْحَاةً وَعَتِيرَةً، هَلْ تَدْرُونَ مَا الْعَتِيرَةُ؟" قَالَ: فَلَا أَدْرِي مَا كَانَ مِنْ رَدِّهِمْ عَلَيْهِ قَالَ: "هِيَ الَّتِي يَقُولُ النَّاسُ الرَّجَبِيَّةُ".

(شرح مشکل الآثار:۸۴/۳)

حضرت مخنف بن سلیمؓ عرض کرتے ہیں کہ ہم لوگ مقام عرفہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے لوگوں! ہر سال ہر گھر والوں پر ایک قربانی اور ایک "عتیرہ" ہے، نیز فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے؟ کہ "عتیرہ" کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: نہیں، اور کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، تو بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ "عتیرہ" وہی ہے جس کو لوگ "رجبیہ" کہتے ہیں۔

اخیر میں اس بات کو کئی طرق سے امام طحاویؒ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "عتیرہ" وہی "رجبیہ" ہے۔

"قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَعَقَلْنَا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ الْعَتِيرَةَ هِيَ الرَّجَبِيَّةُ". (شرح مشکل الآثار:۸۵/۳)

لیکن کیا حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قربانی کی طرح عتیرہ کا ذبح کرنا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں حضرت لقیط بن عامرؓ کی حدیث سے رہنمائی ملتی ہے، جس میں یہ مضمون ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم لوگ ماہ رجب میں جانور ذبح کرتے ہیں اور جو لوگ ہمارے پاس آتے ہیں ان کو کھلاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

عَنْ أَبِي رَزِينٍ، وَهُوَ لَقِيطُ بْنُ عَامِرٍ أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "إِنَّا كُنَّا نَذْبَحُ ذَبَائِحَ فِي رَجَبٍ فَنُطْعِمُ مَنْ جَاءَنَا"، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا بَأْسَ" قَالَ وَكِيعٌ: لَا أَتْرُكُهَا أَبَدًا. (شرح مشکل الآثار: ۸۵/۳)

پھر "عتیرہ" کا حکم منسوخ ہوگیا، اس کا ثبوت حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے ہوتا ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا فَرَعَةَ وَلَا عَتِيرَةَ" قَالَ سُفْيَانُ: يَقُولُ: فِي الْإِسْلَامِ، ثُمَّ قَالَ لَنَا الزُّهْرِيُّ: الْفَرَعَةُ أَوَّلُ النِّتَاجِ، وَالْعَتِيرَةُ شَاةٌ كَانُوا يَذْبَحُونَهَا فِي رَجَبٍ. (شرح مشکل الآثار: ۸۶/۳)

یہاں ایک بحث یہ ہے کہ اس حدیث میں "عتیرہ" کے وجوب کی تنسیخ مقصود ہے، یا مطلقاً عتیرہ کے حکم کو منسوخ کرنا ہے، اگر اس میں صرف وجوب کو نسخ کرنا مقصود ہے تو پھر اس موقع پر دوسرے مشروع جانور ذبح کرنا درست ہوگا۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ نَفْيُ الْعَتِيرَةِ، وَقَدْ يَحْتَمِلُ نَفْيُهَا الْمَذْكُورُ فِيهِ نَفْيَ الْوُجُوبِ وَلَا يَمْنَعُ ذَلِكَ أَنْ يَفْعَلَ فِعْلًا لَا مَعْصِيَةَ فِيهِ وَلَا خِلَافَ لِمَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ. وَقَدْ يُحْتَمَلُ خِلَافُ ذَلِكَ فَنَظَرْنَا فِي ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۸۷/۳)

اب امام طحاویؒ نے دونوں معانی میں سے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے کہ "لا عتیرۃ فی

الإسلام" سے وجوب کی نفی مقصود ہے نہ کہ علی الاطلاق اباحت کی، یعنی "عتیرہ" کے وجوب کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، البتہ اس کی اباحت اب بھی باقی ہے۔

اس معنی کی تائید حضرت نبیشہ الہذلی کی حدیث سے ہوتی ہے، کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے "عتیرہ" اور "فرع" کے بارے میں استفسار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ جو چاہے عتیرہ ذبح کرے اور جو چاہے نہ کرے، اسی طرح "فرع" کے بارے میں جواب دیا۔

عَنْ نُبَيْشَةَ، قَالَ: سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّا كُنَّا نَعْتِرُ عَتِيرَةً فِي رَجَبٍ فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اذْبَحُوا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فِي أَيِّ شَهْرٍ مَا كَانَ وَبَرُّوا اللّٰهَ وَأَطْعِمُوا" سَمِعْتُ الْمُزَنِيَّ يَقُولُ: "وَبَرُّوا اللّٰهَ أَوْ أَوْتِرُوا اللّٰهَ" الشَّكُّ مِنَ الْمُزَنِيِّ. (شرح مشکل الآثار: ۸۷/۳)

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام طحاویؒ نے عرض کیا ہے کہ "عتیرہ" سے وجوب کی نفی ہے نہ کہ اباحت واختیار کی۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ مَا قَدْ عَقَلْنَا بِهِ أَنَّ أَمْرَ الْعَتِيرَةِ رُدَّ إِلَى الِاخْتِيَارِ وَنَفْيِ الْوُجُوبِ وَأَنَّهُ بِرٌّ، مَنْ أَخَذَ بِهِ فَقَدْ أَحْسَنَ، وَمَنْ نَكِرَهُ لَمْ يَحْرَجْ. (شرح مشکل الآثار: ۸۸/۳)

محدثین کے اقوال:

محقق علامہ انور شاہ کشمیریؒ ذکر کرتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں اس سلسلہ میں بڑی تاکید تھی، پھر بعد میں وسعت دی گئی، چنانچہ لوگ اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے، البتہ مسلمان صرف اللہ تعالیٰ کے نام سے جانور ذبح کرتے، ہاں! جب قربانی کی فرضیت کا حکم آیا تو "عتیرہ" اور "فرع" کا حکم منسوخ ہو گیا، اب جو چاہے ذبح کرے اور جو چاہے ذبح نہ کرے۔

قال المحقق المحدث أنور شاه الکشمیری: کان تأکیدا فی أول الإسلام ثم وسع فیها بعده وکان أهل الجاهلیة یذبحونها لأصنامهم، وأما أهل الإسلام فما کانوا لیفعلوا الا تعالیٰ . فلما فرضت الأضحیة نسخ الفرع وغیره فمن شاءذبح ومن شاء لم یذبح. (فیض الباری:۱۷۷/۷)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ "نبیشة الهذلی" کی حدیث نقل کرنے کے بعد قلم بند کرتے ہیں کہ اس حدیث میں "فرع اور عتیرہ" کو بالکلیہ ختم نہیں گیا گیا ہے، بلکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی صفت کو باطل کر دیا گیا ہے، یعنی "فرع" میں پہلے بچہ کے وجوب اور "عتیرہ" میں ماہ رجب میں خاص کر کے ذبح کرنے کو ختم کر دیا گیا، نیز یہ لکھا ہے کہ تمام احادیث عدم وجوب میں صریح ہیں، لیکن استحباب کی نفی نہیں کرتی۔

ففی هذا الحدیث انه ﷺ لم یبطل الفرع والعتیرة من أصلهما وانما أبطل صفة من کل منهما، فمن الفرع کونه یذبح اول ما یولد، من العتیرة خصوص الذبح فی شهر رجب، وهذا صریح فی عدم الوجوب لکن لا ینفی الاستحباب. (فتح الباری: ۱۱/ ۱۷-۱۶)

اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے نسائی شریف کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "فرع" اونٹنی کا پہلا بچہ ہے جس کو لوگ اپنے معبودوں کے نام پر ذبح کرتے تھے، پھر مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا گیا، پہلے مسلمان بھی ابتداء اسلام میں ذبح کرتے تھے، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

"لافرع ولا عتیرة" الفرع أول ما تلده الناقة کانوا یذبحونه لآلهتهم فنهی المسلمون عنه، وقیل کان الرجل فی الجاهلیة إذا تمت إبله مائة قدم بکرا فنحره لصنمه وهو الفرع، وقد کان المسلمون یفعلونه فی صدر الإسلام ثم نسخ، والعتیرة شاة تذبح فی رجب. (شرح النسائی للسیوطی علی هامش النسائی:۱۶۷/۷)

باب: ۱۶۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْفَرَعَةِ

﴿ زمانۂ جاہلیت اور اسلام میں فرع کی حقیقت ﴾

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: قَدْ رَوَيْنَا فِيمَا تَقَدَّمَ مِنَّا فِي هَذِهِ الْأَبْوَابِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْفَرَعِ مَا قَدْ رَوَيْنَاهُ عَنْهُ فِيهَا فَأَرَدْنَا أَنْ نَعْلَمَ مَا ذَلِكَ الْفَرَعُ؟ فَوَجَدْنَا الْمُزَنِيَّ قَدْ حَدَّثَنَا قَالَ: قَالَ أَبُو عَبْدِ اللّٰهِ، يَعْنِي الشَّافِعِيَّ فِي تَفْسِيرِ الْفَرَعَةِ: هُوَ شَيْءٌ كَانَ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَطْلُبُونَ بِهِ الْبَرَكَةَ فِي أَمْوَالِهِمْ، فَكَانَ أَحَدُهُمْ يَذْبَحُ بِكْرَ نَاقَتِهِ أَوْ شَاتِهِ وَلَا يَغْذُوهُ رَجَاءَ الْبَرَكَةِ فِيمَا يَأْتِي بَعْدَهُ، فَسَأَلُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ”فَرِّعُوا إِنْ شِئْتُمْ“ أَيِ اذْبَحُوا إِنْ شِئْتُمْ، وَكَانُوا يَسْأَلُونَهُ عَمَّا كَانُوا يَصْنَعُونَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خَوْفَ أَنْ يُكْرَهَ فِي الْإِسْلَامِ، فَأَعْلَمَهُمْ أَنَّهُ لَا مَكْرُوهَ عَلَيْهِمْ فِيهِ وَأَمَرَهُمُ اخْتِيَارًا أَنْ يَغْذُوهُ ثُمَّ يَحْمِلُوا عَلَيْهِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ. (شرح مشکل الآثار:۳/۱۹۱، ورواه أبوداود(۲۸۳۳)والحاکم(۴/۲۳۵)والبیهقی:(۹/۳۱۲)

خلاصۃ الحدیث:

”فرع“ اونٹنی کا وہ پہلا بچہ ہے جس کو اسلام سے پہلے اور اوائل اسلام میں اپنے معبودوں کے نام ذبح کرتے تھے، اسلام نے اس کو منسوخ کر دیا، اس لئے اب اسلام میں اس کی اجازت نہیں، جیسا کہ امام سیوطی نے ”فرع“ کی توجیہ کی ہے۔

”الفرع“ اول ما تلده الناقة كانوا يذبحونه لآلهتهم فنهي المسلمون عنه، وقيل كان الرجل فی الجاهلية إذا تمت إبله مائة قدم بكرا فنحره لصنمه وهو الفرع، وقد كان المسلمون يفعلونه فی صدر الإسلام ثم نسخ. (شرح النسائی للسيوطی علی هامش النسائی: ۷/۱۶۷)

جس طرح اس سے پہلے کے باب میں ''فرع'' کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تعلیمات آئی ہیں کہ ''لافرع ولا عتیرۃ''(فرع اور عتیرہ اسلام میں درست نہیں) یعنی اونٹ کا پہلا بچہ بتوں کے نام سے ذبح کرنا اور رجب کے مہینہ میں بکری ذبح کرنا درست نہیں) اسی طرح اس باب میں امام طحاویؒ نے امام مزنی کے حوالہ سے امام شافعی کی رائے ''فرع'' کے سلسلہ میں ذکر کی ہے۔

چنانچہ امام شافعیؒ نے ''فرع'' کی تفسیر وتوجیہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ''فرع'' زمانۂ جاہلیت میں ایک عمل تھا جس کو لوگ اپنے مال میں برکت کا زینہ سمجھتے تھے، اسی وجہ سے جب کسی کی بکری یا اونٹنی کو بچہ ہوتا اس کو ذبح کردیتے اور برکت کی امید سے خود اس کا گوشت استعمال نہیں کرتے، لیکن جب کہ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ تعلیم آئی کہ فرع کا ذبح کرنا درست ہے، تو پہلے ہی دن میں ذبح کرنا ضروری نہیں؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ جب چاہو جانور کی پرورش کرو اور اپنی ضرورت کے مطابق ذبح کرو اور سواری کے لائق ہوجائے تو اس کو جہاد میں بھی استعمال کرو، جیسا کہ حدیث الباب میں مذکور ہے، یعنی پہلے ''فرع'' کے سلسلہ میں وجوب کا حکم تھا وہ تو منسوخ ہو چکا ہے، البتہ استحباب کی حیثیت سے اس کا حکم اب بھی باقی ہے۔

الغرض جمہور ائمہ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فرع کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، لیکن امام شافعی اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک اب بھی وہ مستحب ہے۔

امام شافعیؒ کی دلیل یہ حدیث ہے:

عن عبداللہ بن عمرو سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن الفرع فقال: ''الفرع حق وان تترکته حتی یکون بکرا شغزبا ابن مخاض أو ابن لبون''فتعطیه أرملة او تحمل علیه فی سبیل اللہ خیر من ان تذبحه، فیلزق لحمه بوبره.(ابوداود(۲۸۴۲)وأحمد(۶۸۵۹))

جمہور کی دلیل وہ حدیث ہے جو اس سے پہلے باب میں آ چکی ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا فَرَعَةَ وَلَا عَتِيرَةَ" قَالَ سُفْيَانُ: يَقُولُ: فِي الْإِسْلَامِ ثُمَّ قَالَ لَنَا الزُّهْرِيُّ: الْفَرَعَةُ أَوَّلُ النِّتَاجِ، وَالْعَتِيرَةُ شَاةٌ كَانُوا يَذْبَحُونَهَا فِي رَجَبٍ. (شرح مشکل الآثار: ۸۶/۳)

باب: ۱۶۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَسْأَلَتِهِ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يَرُدَّ الشَّمْسَ عَلَيْهِ بَعْدَ غَيْبُوبَتِهَا وَرَدِّ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ إِيَّاهَا عَلَيْهِ، وَمَا رُوِيَ عَنْهُ مِمَّا يُوهِمُ مَنْ تَوَهَّمَ مُضَادَّ ذَلِكَ

﴿ سورج غروب ہونے کے بعد طلوع ہونا معجزات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک کڑی ہے ﴾

عَنْ أَسْمَاءَ ابْنَةِ عُمَيْسٍ، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوحَى إِلَيْهِ وَرَأْسُهُ فِي حِجْرِ عَلِيٍّ، فَلَمْ يُصَلِّ الْعَصْرَ حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "صَلَّيْتَ يَا عَلِيُّ؟" قَالَ: لَا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اللّٰهُمَّ إِنَّهُ كَانَ فِي طَاعَتِكَ وَطَاعَةِ رَسُولِكَ فَارْدُدْ عَلَيْهِ الشَّمْسَ"، قَالَتْ أَسْمَاءُ: فَرَأَيْتُهَا غَرَبَتْ، ثُمَّ رَأَيْتُهَا طَلَعَتْ بَعْدَمَا غَرَبَتْ. (شرح مشکل الآثار: (۹۲/۳)، ورواه الطبرانی: (۳۹۰/۲۴) واورده الهیثمی فی المجمع: ۲۹۷/۸)

خلاصۃ الحدیث:

اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے مظاہر نا قابل شمار ہیں، تمام چیزوں کی تخلیق میں

توازن قائم ہے، یہ بات بدیہی ہے کہ سورج اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے مظاہر میں سے ایک ہے، جو اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے اور اپنے وقت پر غروب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿یس:۳۸﴾

اور آفتاب اپنے ٹھکانے پر چلتا رہتا ہے۔

الغرض دنیا کی تمام چیزیں ایک نظام وسسٹم کے تحت اپنے محور پر کام کر رہی ہیں، مثلاً سورج اور چاند کا اپنے وقت پر طلوع ہونا اور غروب ہونا ،لیکن اللہ تعالیٰ کبھی نظام سابقہ کے خلاف اپنی قدرت کاملہ کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس سے جہاں قدرت الٰہی کا مظاہرہ مقصود ہوتا ہے تو وہیں اس سے منکرین ومرتدین کو عاجز کرنا بھی ہے، مثلاً آگ کی خاصیت جلا کر راکھ کرنا ہے، لیکن وہی آگ اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ پر گلِ گلزار ہوگئی: قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿الأنبياء: ٦٩﴾ (ہم نے کہا اے آگ (حضرت) ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور سلامتی بن جا) جس طرح آگ حضرت ابراہیمؑ پر باعث رحمت بن گئی، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی وجہ سے سورج غروب ہونے کے بعد طلوع ہوگیا، پھر حضرت علیؓ نے عصر کی نماز ادا کی اس کے بعد غروب ہوگیا۔

یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں سے ایک اہم کڑی ہے، جیسا کہ امام طحاویؒ نے حدیث الباب میں اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

یہ واقعہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے مروی ہے کہ یہ وحی کی آمد کا وقت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر مبارک حضرت علیؓ کی گود میں تھا، حضرت علیؓ نماز عصر ادا نہیں کر سکے، یہاں تک سورج غروب ہوگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا "صَلَّيْتَ يَا عَلِيُّ؟ انہوں نے کہا: "لا" (نہیں)، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا کی "اللهُمَّ إِنَّهُ كَانَ فِي طَاعَتِكَ وَطَاعَةِ رَسُولِكَ فَارْدُدْ عَلَيْهِ الشَّمْسَ"، حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میں نے سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھا، پھر طلوع ہوا

اوراس کے بعد پھر غروب ہوگیا، جب کہ یہی روایت دوسرے طریق سے منقول ہے اوراس میں اضافہ ہے، "ثم قام عليٌّ فتوضَّأ وصلَّى العصر ثم غابت" یعنی حضرت علی کھڑے ہوئے، وضوکیا اور عصر کی نماز ادا کی پھر سورج غروب ہوگیا۔

عَنْ أَسْمَاءَ ابْنَةِ عُمَيْسٍ، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوحَى إِلَيْهِ وَرَأْسُهُ فِي حِجْرِ عَلِيٍّ فَلَمْ يُصَلِّ الْعَصْرَ حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "صَلَّيْتَ يَا عَلِيُّ؟" قَالَ: لَا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اللّٰهُمَّ إِنَّهُ كَانَ فِي طَاعَتِكَ وَطَاعَةِ رَسُولِكَ فَارْدُدْ عَلَيْهِ الشَّمْسَ"، قَالَتْ أَسْمَاءُ: فَرَأَيْتُهَا غَرَبَتْ، ثُمَّ رَأَيْتُهَا طَلَعَتْ بَعْدَمَا غَرَبَتْ. (شرح مشکل الآثار: ۹۲/۳)

تعارض:

حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی اور آپ کی دعا کی برکت سے سورج دوبارہ طلوع ہوا، جب کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج کو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع علیہ السلام کے علاوہ کسی پر نہیں روکا، اس اعتبار سے حدیث الباب اور حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں تعارض پایا جارہا ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَمْ تَحْتَبِسِ الشَّمْسُ عَلَى أَحَدٍ إِلَّا لِيُوشَعَ".

فَقَالَ قَائِلٌ: كَيْفَ تَقْبَلُونَ هَذَا وَأَنْتُمْ تَرْوُونَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَدْفَعُهُ. (شرح مشکل الآثار: ۹۵/۳)

جمع وتطبیق:

امام طحاویؒ نے تعارض کو اس طرح دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اصلاً حدیث الباب اور حدیث ابی ہریرہ میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیوں کہ حضرت اسماءؓ کی حدیث میں سورج

غروب ہونے کے بعد دوبارہ لوٹائے جانے کا تذکرہ ہے، جب کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں غروب ہونے سے پہلے روک کر رکھنے کا واقعہ ہے، جیسا کہ اس بات کو امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے۔

فَإِنْ كَانَ حَقِيقَةُ الْحَدِيثِ كَذٰلِكَ فَلَيْسَ فِيهِ خِلَافٌ لِمَا فِي الْحَدِيثَيْنِ الْأَوَّلَيْنِ؛ لِأَنَّ الَّذِي فِيهِ هُوَ حَبْسُ الشَّمْسِ عَنِ الْغَيْبُوبَةِ وَالَّذِي فِي الْحَدِيثَيْنِ الْأَوَّلَيْنِ هُوَ رَدُّهَا بَعْدَ الْغَيْبُوبَةِ. (شرح مشکل الآثار: ۹۶/۳)

لیکن اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی دوسری حدیث بھی حضرت اسماءؓ کی دونوں حدیث کے خلاف ہے؛ کیوں کہ اس میں ذکر ہے کہ حضرت یوشعؑ پر حبس الشمس کے واقعہ کے بعد یہ واقعہ پیش نہیں آیا، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت یوشعؑ کے واقعہ کو بیان کیا، اس وقت تک اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، ہاں! البتہ حضرت علیؓ کا واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت سے پیش آیا اس لئے اس میں کوئی تعارض کی بات نہیں۔

وَأَمَّا مَا رَوَاهُ لَنَا عَنْهُ يَحْيَى بْنُ زَكَرِيَّا، فَهُوَ عَلَى أَنَّهَا لَمْ تُرَدَّ مُنْذُ رُدَّتْ عَلَى يُوشَعَ بْنِ نُونٍ إِلَى الْوَقْتِ الَّذِي قَالَ لَهُمْ فِيهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَذَا الْقَوْلَ، فَذٰلِكَ غَيْرُ دَافِعٍ أَنْ تَكُونَ لَمْ تُرَدَّ إِلَى يَوْمَئِذٍ. (شرح مشکل الآثار: ۹۶/۳)

محدثین کے اقوال:

صاحب لمعات لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث (جس میں حبس شمس کا واقعہ) پہلے پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دوبارہ طلوع شمس کا واقعہ اس کے بعد کا ہے، اس لئے دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔

ویحتمل أن یکون هذا القول قبل ان ترد الشمس له ما ورد انها قد رُدّت له صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرات. (لمعات التنقیح: ۹۶/۷، رقم: ۴۵۳۳)

اسی طرح علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ دراصل حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں حصرت یوشع علیہ السلام کے علاوہ حبس شمس کا واقعہ نہیں ہوا، لہذا اس میں کوئی منافی نہیں کہ بعد میں حبس شمس کا واقعہ پیش آسکتا ہے۔

ولا ينافي حبسها للنبيﷺ ما أخرجه أحمد عن أبي هريرة لأنه يحتمل أن يكون المراد أنها لم تحبس فى من مضى من الأبنياء إلاليوشع عليه السلام ولا ينافى أن تحبس لنبينا عليه السلام. (فتح الملهم: ۴۲/۹، رقم الحديث: ۴۵۳۰)

باب: ١٦٦

بَابُ الْمُسْتَخْرَجِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ الَّذِي يَرْفَعُهُ بَعْضُ رُوَاتِهِ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ, وَيُوقِفُهُ بَعْضُهُمْ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ فِي الْمُرَادِ بِقَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: (وَأَتْبَعْتهُمْ ذُرِّيَّتهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ)

﴿ جنت میں والدین کی وجہ سے اولاد کی ترقی ﴾

عَنْ شعبة حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ مُرَّةَ قَالَ: سَأَلْتُ سَعِيدَ بْنَ جُبَيْرٍ عَنْ هَذِهِ الْآيَةِ: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَأَتْبَعْنَاهُمْ ذُرِّيَاتِهِمْ بِإِيمَانٍ﴾، قَالَ: قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: "الْمُؤْمِنُ تُرْفَعُ لَهُ ذُرِّيَّتُهُ لِيُقِرَّ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَيْنَهُ، وَإِنْ كَانُوا دُونَهُ فِي الْعَمَلِ". (شرح مشكل الآثار: ۱۰۵/۳، ورواه هناد بن السرى فى الزهد(۱۷۹) والطبرى:۲/۲۷)

خلاصۃ الحدیث:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے فضل وکرم سے انسان کو بے شمار نعمتوں سے مالا مال کیا ہے، مثلاً انسان کو جمیع مخلوق پر شرف وفضیلت بخشنے اور ایک نیکی پر دس گنا ثواب کرنے، اور ایمان کے ساتھ عمل صالح کرنے پر جنت جیسی عظیم نعمتوں سے مسلمانوں کو

بہرور کرنے کا وعدہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے کرم وفضل وعنایت کا ایک روشن باب ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا مومنین پر بہت بڑا احسان ہے کہ والدین کی رفاقت اور ہمنشینی جنت میں حاصل ہوگی، حالاں کہ اولاد وذریت کے اعمال والدین کے مقام سے فروتر ہوں گے، لیکن والدین کے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ان کی اولاد کو ماں باپ کا مرتبہ اور والدین کی معیت حاصل ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَأَتْبَعْتُهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ﴾ (طور: ۲۱)

(اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ان کے ایمان میں ساتھ دیا، ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ شامل کردیں گے)

چنانچہ امام طحاویؒ نے اسی آیت کی توجیہ اس باب کی حدیث میں کی ہے چوں کہ حدیث الباب کئی طرق سے مروی ہے، بعض طریق میں مرفوعاً منقول ہے، تو بعض موقوفاً چنانچہ پہلی روایت جو(شعبة عن عمرو بن مرة کے واسطہ سے ہے) موقوف ہے؛ لیکن دوسری حدیث (جو سفیان عن سماعة عن عمرو بن مرة عن سعید بن جبیر عن ابن عباس عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مرفوعاً منقول ہے، بہر کیف عمرو بن مرہ کے واسطہ سے قیس بن ربیع نے بھی حدیث نقل کی ہے جو گرچہ موقوف ہے لیکن مرفوع حدیث سے اس کا رتبہ کم نہیں ہے، کیوں؟ اس لئے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی مستفاد ہوئی ہے، چاہے وہ مرفوع ہو یا موقوف۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث میں آیت مذکورہ کی تفسیر وتوجیہ ہے جو غیر نبی سے اخذ نہیں کی جاسکتی۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَهَذَا الْحَدِيثُ فَنَحْنُ نُحِيطُ عِلْمًا لَوْ لَمْ نَجِدْ أَحَدًا مِنْ رُوَاتِهِ رَفَعَهُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ لَمْ يَأْخُذْهُ إِلَّا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ

كَانَ الَّذِي فِيهِ إِخْبَارٌ عَنِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ بِمُرَادِهِ فِي الْآيَةِ الْمَذْكُورَةِ فِيهِ، وَذَلِكَ مِمَّا لَا يُؤْخَذُ مِنْ غَيْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۰۷/۳)

اسی طرح علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے مراسیل صحابہ کے بارے میں تحریر کیا ہے:

والمختار قبول مطلقا ودليله الاجماع والمعقول، أما الإجماع فهو أن الصحابة والتابعين أجمعوا على قبول المراسيل من العدل، أما الصحابة فانهم قبلوا أخبار عبداللّٰه ابن عباس مع كثرة روايته، وقد قيل: إنه لم يسمع من رسول اللّٰه صلى الله عليه وآله وسلم سوى أربعة أحاديث لصغره سنه. (قواعد فی علوم الحدیث: ۸۶)

اشکال:

حدیث الباب سے یہ معلوم ہوا کہ مومنین جب جنت میں داخل ہوں گے تو ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور سکون پہنچانے کے لئے اللہ تعالی ان کی اولاد کے درجات کو بلند کر کے والدین کے برابر کردیں گے؛ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کو بھی یہی مقام ومرتبہ حاصل ہوگا؟

جواب:

امام طحاویؒ نے لکھا ہے کہ جب عام مومنین کی اولاد کو یہ مقام حاصل ہوگا اور ان کے درجات بلند کئے جائیں گے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے درجات بدرجۂ اولی بلند کئے جائیں گے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد اس کے زیادہ مستحق ہیں۔

وَوَجَدْنَا غَيْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ دَخَلَ فِي ذَلِكَ فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدْخَلُ فِي ذَلِكَ مِنْهُمْ، وَأَنَّهُ فِي إِلْحَاقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ بِهِ ذُرِّيَّتَهُ الْمُتَّبِعَةَ لَهُ بِالْإِيمَانِ بِهِ لِيُقِرَّ عَيْنَهُ بِذَلِكَ أَوْلَى مِنْ سَائِرِ الْمُؤْمِنِينَ سِوَاهُ.

وَإِنَّمَا كَانَ ذَلِكَ لِسَائِرِ الْمُؤْمِنِينَ سِوَاهُ لِيُقِرَّ بِهِ أَعْيُنَهُمْ كَانَ لَهُ فِي ذُرِّيَّتِهِ الْمُتَّبِعَةِ لَهُ

بِالْإِيمَانِ أَوْلَى ، وَكَانُوا بِذَلِكَ مِنْهُ أَحْرَى ، وَاللَّهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۰۸/۳)

باب: ۱٦٧

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَخْنَعِ الْأَسْمَاءِ مَا هُوَ مِنْهَا

﴿ نومولود کا نام بامعنی رکھنے کا بیان ﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ يَبْلُغُ بِهِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "أَخْنَعُ الْأَسْمَاءِ عِنْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ تَسَمَّى بِاسْمِ مَلِكِ الْأَمْلَاكِ". (شرح مشکل الآثار: ۱۰۹/۳، ورواه أحمد: ۲۴۴/۲، والبخاری (۶۲۰۲) وأبوداود (۴۹۶۱) والترمذی (۲۸۳۷) ومسلم (۲۱۴۳)

خلاصۃ الحدیث:

یقیناً دنیا کی نعمتوں میں ایک بڑی نعمت اولاد ہے، نعمت کی قدردانی اور شکر گذاری کے تقاضوں میں سے ایک بڑا تقاضہ یہ ہے کہ نومولود کا نام والدین ایسا رکھیں جو بامعنی ہو، چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آدمی سب سے پہلے تحفہ اپنے بچہ کو نام کا دیتا ہے، اس لئے اس کا اچھا نام رکھنا چاہیے، (رواہ ابوداؤد) نام تجویز کرنے کا مقصد محض نام اور پہچان نہیں؛ بلکہ مذہب کی شناخت اس سے وابستہ ہے، اس لئے اچھے دلکش اور بامعنی ناموں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، لیکن وہ نام جن میں معنی اچھا نہ ہو؛ بلکہ اس میں غرور وتکبر کا پہلو نمایاں ہو تو ایسے بے معنی نام تجویز کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

چنانچہ حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ذلیل ترین نام "ملک الاملاک" (بادشاہوں کا بادشاہ ہے) ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے یہ نام رکھنے سے منع فرمایا ہے؛ البتہ اس نام کو پسند فرمایا جس میں عبدیت کا معنیٰ نمایاں ہو، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترمذی شریف کی حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: "أحب الأسماء إلی اللہ عبداللہ وعبدالرحمن" (اللہ پاک کو سب سے پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہے) (رواہ الترمذی: ۲۸۳۳) کیوں کہ دونوں نام کا معنیٰ اطاعت وبندگی ہے، جو انسان کے امتیازی وصف ہیں۔

الغرض امام طحاویؒ نے یہ باب اس لئے قائم کیا ہے کہ تاکہ امت مسلمہ کو ایسے ناموں سے منع کیا جائے جو غرور وتکبر کے معنیٰ پر دال ہوں، جیسے "ملک الاملاک" بادشاہوں کا بادشاہ، کسی بچہ کا نام رکھنا؛ ظاہر ہے یہ درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ نام اللہ کی صفت ہے اور اللہ کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کسی بچے کا نام رکھنا درست نہیں۔

لفظ خنع کی حقیقت:

"خنع" کا معنیٰ ذلت ورسوائی ہے، حدیث میں "لفظ اخنع" اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ "سب سے ذلیل ترین" عربی زبان میں "خنع الرجل خنوعًا" اس وقت بولتے ہیں، جب ذلت ورسوائی ایسے بدترین ذلیل نام رکھنے والوں پر ثابت ہوجاتی ہے، نہ کہ نام پر جیسے قرآن کریم میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ (اعلیٰ:۱) میں اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے، جیسا کہ امام طحاوی نے تحریر کیا ہے:

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَتَأَمَّلْنَا هَذَا الْحَدِيثَ لِنَقِفَ عَلَى مَا الْمُرَادُ بِهِ مَا هُوَ؟ فَوَجَدْنَا الْخَنْعَ إِنَّمَا يُرَادُ بِهِ الذُّلُّ وَالْخُضُوعُ ، يُقَالُ مِنْهُ: خَنَعَ الرَّجُلُ خُنُوعًا إِذَا خَضَعَ فَذَلَّ، فَكَانَ الْخُضُوعُ وَالذِّلَّةُ إِنَّمَا وَقَعَتْ فِي هَذَا عَلَى ذِي الِاسْمِ لَا الِاسْمِ نَفْسِهِ ؛ لِأَنَّ الِاسْمَ لَا يَلْحَقُهُ ذَمٌّ وَلَا مَدْحٌ. (شرح مشکل الآثار: ۱۱۰/۳)

لفظ "خنع" کا معنیٰ:

حدیث الباب میں ایک لفظ "اخنع" استعمال ہوا ہے، امام طحاوی علیہ الرحمہ اس کا معنیٰ

اور مراد کو یہاں واضح کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں ''خنع'' سے ذلت، وعاجزی مراد ہے، جب کہ انسان عاجزی اور اپنے کو فروتر ظاہر کرتا ہے تو اس وقت لوگ بولتے ہیں: ''خنع الرجل خنوعا'' پھر یہ عاجزی اور انکساری کا وصف صاحب نام میں پایا جاتا ہے نا کہ نام میں، اس لیے کہ نام پر فی نفسہ نہ مذمت لاحق ہوتی ہے اور نہ مدح، جب اللہ نے سورۂ اعلیٰ میں امت کو اپنے رب کے نام کی تسبیح بیان کرنے کا حکم دیا ہے، ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ [الأعلى: ١] اس میں بھی نفس نام مراد نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے۔

اسی طرح صاحب کتاب نے ''قریۃ'' والی آیت کو بطور نظیر کے پیش کیا ہے ﴿وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبَائِثَ﴾ [الأنبياء: 74] یہاں پر بھی اہل قریہ مراد ہے، جن کا عمل نازیبا تھا۔

لَيْسَ يُرِيدُ بِذَلِكَ الْقَرْيَةَ نَفْسَهَا، وَإِنَّمَا يُرِيدُ أَهْلَهَا الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ الْخَبَائِثَ.

(شرح مشکل الآثار: ١١٠/٣)

باب: ١٦٨

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: ''إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ طَعَامَ الْقَوْمِ إِذَا لَمْ يَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ مَا الْمُرَادُ بِذَلِكَ الِاسْتِحْلَالِ؟''

﴿ کھانے سے پہلے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنے کی فضیلت ﴾

عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ، قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ أُتِيَ بِجَفْنَةٍ، فَكَفَّ عَنْهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكُنَّا لَا نَضَعُ أَيْدِيَنَا حَتَّى يَضَعَ يَدَهُ، فَجَاءَ أَعْرَابِيٌّ كَأَنَّهُ يُطْرَدُ حَتَّى يَهْوِي إِلَى الْجَفْنَةِ فَأَكَلَ مِنْهَا، فَأَخَذَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ فَأَجْلَسَهُ ثُمَّ جَاءَتْ جَارِيَةٌ فَأَهْوَتْ بِيَدِهَا تَأْكُلُ فَأَخَذَ بِيَدِهَا فَأَجْلَسَهَا ثُمَّ قَالَ:

"إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ طَعَامَ الْقَوْمِ إِذَا لَمْ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ, وَإِنَّهُ لَمَّا رَآكُمْ كَفَفْتُمْ جَاءَ بِالْأَعْرَابِيِّ لِيَسْتَحِلَّ بِهِ، ثُمَّ جَاءَ بِالْجَارِيَةِ لِيَسْتَحِلَّ بِهَا، فَوَاللّٰهِ الَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ إِنَّ يَدَهُ فِي يَدِي مَعَ أَيْدِيهِمَا". (شرح مشکل الآثار: ٣/١١١، ورواه عبدالرزاق (١٩٥٦٣) ورواه أحمد: ٥/٣٨٣-٣٨٢، ومسلم (٢٠١٧) ورواه أحمد: ٥/٣٩٧-٣٩٨، وأبوداود (٣٧٦٦)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام ہی ایک منفرد مذہب ہے، جس نے انسانی زندگی کے تمام شعبجات میں رہنمائی کی ہے، اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں، حتی کہ کھانے پینے کے باب میں بھی آداب اور سنت کی عملی تعلیم دی ہے، اور ولادت سے لے کر وفات تک زندگی کے ہر باب میں رسول اللہ ﷺ نے امت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے۔

اسی بنا پر امام طحاویؒ نے اس باب میں حضرت حذیفۃ بن الیمانؓ کی حدیث کو پیش کرکے یہ سبق دیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کھانے سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھتا ہے، تو شیطان اس کے کھانے کو اپنے لئے حلال سمجھتا ہے، اور وہ اس پر قادر ہوجاتا ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب بھی یاد آئے ویسے ہی "بِاسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ" پڑھ لے، تاکہ اس کھانے میں شیطان کی شرکت نہ ہو، اگر شرکت کرچکا ہے تو بعد میں بسم اللہ کے پڑھنے کی وجہ سے شیطان پورا کھانا قے کے ذریعہ باہر پھینک دے گا، الغرض تسمیہ یعنی ''بسم اللہ'' کے پڑھنے کی وجہ سے شیطان پر روک لگ جاتی ہے، اور برکت کا ظہور شروع ہوجاتا ہے۔

اختلاف فی السند:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ تمام علماء محدثین کا اتفاق ہے کہ معمر سے اس حدیث کی سند میں سہو ہوا ہے، انہوں نے سند اس طرح بیان کی ہے:

عن معمر قال حدثنی الأعمش عن زید بن وھب عن حذیفة بن الیمان قال ـ۔ الخ۔۔ حالاں کہ صحیح سند اس طرح ہے، حدثنا أبومعاویة عن الأعمش عن خیثمة عن أبی حذیفةَ عن حذیفة.

یعنی معمر نے اعمش کے بعد زید ابن وہب کو ذکر کیا ہے، حالانکہ صحیح سند یہ ہے کہ اعمش کے بعد خیثمہ عن ابی حذیفۃ ہے، اور امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ابو حذیفہ عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں سے ہیں، جن کا نام سلمہ بن صہیہ الارجی ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَأَهْلُ الْعِلْمِ جَمِيعًا بِالْحَدِيثِ يَقُولُونَ: إِنَّ مَعْمَرًا غَلِطَ فِي إِسْنَادِ هَذَا الْحَدِيثِ عَنِ الْأَعْمَشِ وَإِنَّ الصَّحِيحَ فِي إِسْنَادِهِ هُوَ مَا حَدَّثَنَا فَهْدُ بْنُ سُلَيْمَانَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الصَّلْتِ الْكُوفِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ خَيْثَمَةَ، عَنْ أَبِي حُذَيْفَةَ، عَنْ حُذَيْفَةَ.. (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۱۱-۱۱۲)

وقال أبوجعفر: إن أبا حذیفة من اصحاب عبداللہ بن مسعود۔۔۔۔۔واسمه سلمة بن صهية الأرجی. (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۱۲-۱۱۳)

لفظ استحلال کا معنی:

امام طحاویؒ مذکورہ عبارت "ان الشیطان یستحل طعام القوم" کے تحت بیان کرتے ہیں: حلال کا لغوی معنی یہ ہے کہ ہر چیز اپنی اصلی حالت کے اعتبار سے حلال ہے، جب تک کہ شریعت کی طرف سے اس پر حرمت کا حکم نہ آجائے۔

فَوَجَدْنَا الْحَلَالَ هُوَ الشَّيْءُ الْمُطْلَقُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۱۲)

حرام - امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ شریعت کی جانب سے منع کردہ اشیاء کو حرام کہتے ہیں۔ :الْحَرَامَ هُوَ الشَّيْءُ الْمَمْنُوعُ مِنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۱۲)

استحلال - امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ منع کردہ چیزوں کو اپنی ذات کے لئے حلال سمجھنا اس کو استحال کہتے ہیں، مثلاً کسی انسان کا بلاوجہ خون کرنا، اسی طرح کسی کا سامان اجازت کے بغیر

لینا، اب اگر کوئی شخص اپنے لئے کسی کے خون یا سامان کو بغیر حق واجب کے حلال سمجھے تو عربی میں اس کو درج ذیل الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں:

اسْتَحَلَّ فُلَانٌ دَمِي وَاسْتَحَلَّ فُلَانٌ مَالِي عَلَى مَعْنَى أَطْلَقَ لِنَفْسِهِ دَمِي وَأَطْلَقَ لِنَفْسِهِ مَالِي. (شرح مشکل الآثار:۱۱۴/۳)

قرآنی آیت سے استحلال کی مثال:- امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اشہر حرم کے چار مہینے متعین فرمائے تھے: (ذی القعدہ، ذی الحجۃ، محرم اور رجب) جن میں قتال کرنا حرام تھا، اب مشرکین اپنی نفسانی اغراض اور قتال کا جواز پیدا کرنے کے لئے جو مہینہ حرام تھا، اس کو حلال بنا دیتے اور جو حلال تھا، اس کو حرام بنا دیتے اور کسی بھی طرح بغیر تخصیص کے اشہر حرم کے چار کی تعداد کو پورا کر دیتے، الغرض استحلال مذکورہ مثال میں اس طور پر ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اشہر حرم میں قتال کو حرام فرما دیا تھا تو مشرکین اپنے لئے اس کو حلال سمجھتے۔

وَمِنْ ذَلِكَ قَوْلُ اللهِ جَلَّ وَعَزَّ فِي الْآيَةِ الَّتِي ذُكِرَ فِيهَا النَّسِيءُ: ﴿يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ﴾ أَيْ: لِيُطْلِقُوا لِأَنْفُسِهِمْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِمْ مِنْ ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار:۱۱۴/۳)

سوال:

یہاں سوال یہ ہے کہ کھانے میں شیطان کو شریک نہ کرنے کے لئے اکلِ طعام کے وقت ''بسم اللہ'' پڑھنا ضروری ہے یا برتن پر ڈھکن رکھتے وقت یا کھانا بناتے وقت بسملہ پڑھنا کافی ہے؟

. ثُمَّ تَأَمَّلْنَا بَعْدَ ذَلِكَ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنْ قَوْلِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ طَعَامَ الْقَوْمِ إِذَا لَمْ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ". (شرح مشکل الآثار:۱۱۴/۳)

جواب:

ایک طرف چند احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈھکن رکھتے وقت ''بسم اللہ'' پڑھنا

کافی ہے، مثلاً ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وَخَمِّرُوا آنِيَتَكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ'' یعنی اپنے برتنوں کو ڈھانپ لو اور اللہ کا نام لو۔

دوسری حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسملہ پڑھنے کی برکت سے شیطان کھانے میں شریک نہیں ہوگا، مثلاً باب کی پہلی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھوٹی بچی اور اعرابی کو بغیر بسملہ پڑھے کھانا میں ہاتھ ڈالنے سے روکا اور بسملہ پڑھنے کا حکم دیا:

فَوَجَدْنَاهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ رُوِيَ عَنْهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ الَّذِي رَوَيْنَاهُ فِي صَدْرِ هَذَا الْبَابِ قَوْلَهُ: "إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ طَعَامَ الْقَوْمِ إِذَا لَمْ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ عِنْدَ أَكْلِهِمْ إِيَّاهُ". (شرح مشکل الآثار: ۱۱۷/۳)

ان تمام احادیث کو سامنے رکھ کر امام طحاویؒ نے یہ نتیجہ نکالا کہ کھانا بناتے وقت، یا برتن پر ڈھکن رکھتے وقت بسملہ پڑھنے کی برکت سے کھانا شیطان کی شرکت سے محفوظ رہے گا، جب تک کہ کھانا برتن میں ہے، یا ڈھکا ہوا ہے، برتن سے نکالنے کے بعد اب کھانا شیطان کی شرکت سے محفوظ نہیں رہے گا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ بسملہ پڑھنے کا حکم دیا۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَاحْتُمِلَ أَنْ تَكُونَ التَّسْمِيَةُ عَلَى الطَّعَامِ عِنْدَ وَضْعِهِ مِنْ وَاضِعِهِ أَوْ عِنْدَ تَغْطِيَتِهِ بِمَا يُغَطَّى بِهِ هِيَ التَّسْمِيَةُ الْمَانِعَةُ لِلشَّيْطَانِ مِنْهُ بَعْدَ ذَلِكَ أَبَدًا. فَوَجَدْنَاهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ رُوِيَ عَنْهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ الَّذِي رَوَيْنَاهُ فِي صَدْرِ هَذَا الْبَابِ قَوْلَهُ: "إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ طَعَامَ الْقَوْمِ إِذَا لَمْ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ عِنْدَ أَكْلِهِمْ إِيَّاهُ"، فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ التَّسْمِيَةَ عِنْدَ تَخْمِيرِهِ أَوْ عِنْدَ إِيعَائِهِ إِنَّمَا تَحْفَظُهُ مَا كَانَ مُوكًى أَوْ مَا كَانَ مُوعًى حَتَّى يُحَاوِلَ أَهْلُهُ أَكْلَهُ، فَإِذَا حَاوَلُوا ذَلِكَ احْتَاجُوا إِلَى تَسْمِيَةِ اللّٰهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۱۷/۳)

سوال:

اگر کھانا کھانے سے پہلے بسملہ پڑھنا بھول جائے اور درمیان میں یاد آئے تو کیا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے موقع پر کوئی ایسا عمل بتلایا ہے کہ جس کو پڑھنے کی برکت سے شیطان کا کھانا اس کے لئے قابل انتفاع نہ رہے، اور مابقیہ بچے ہوئے کھانے میں شیطان کی شرکت سے محفوظ رہے؟

ثُمَّ طَلَبْنَا مَا الَّذِي يَنْبَغِي لَهُمْ إِذَا ذَهَبَتْ عَنْهُمُ التَّسْمِيَةُ أَنْ يَكُونَ مِنْهُمْ عِنْدَ مُحَاوَلَتِهِمْ أَكْلَهُ مَا الَّذِي يَنْبَغِي أَنْ يَفْعَلُوهُ حَتَّى لَا يَنْتَفِعَ الشَّيْطَانُ بِمَا أَكَلَ مِنْهُ قَبْلَ ذَلِكَ وَحَتَّى يَكُونَ ذَلِكَ سَبَبًا يَمْنَعُهُ مِنْ بَقِيَّتِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۱۷/۳)

جواب:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کے شروع میں بسملہ بھول جائے تو درمیان میں یاد آنے پر "بِاسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ" پڑھے، جس کو پڑھنے کی برکت سے شیطان کو قے ہو جاتی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"فَإِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَنَسِيَ أَنْ يَذْكُرَ اسْمَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ ثُمَّ ذَكَرَ فَلْيَقُلْ: بِاسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ".

دوسری حدیث رسول کے الفاظ اس طرح ہے:

"مَا زَالَ الشَّيْطَانُ يَأْكُلُ مَعَكَ حَتَّى سَمَّيْتَ، فَمَا بَقِيَ فِي بَطْنِهِ شَيْءٌ إِلَّا أَلْقَاهُ".

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَوَقَفْنَا بِذَلِكَ عَلَى أَنَّ الَّذِي يَحِلُّ بِالشَّيْطَانِ بِقَوْلِ الْآكِلِ الَّذِي لَمْ يَكُنْ سَمَّى فِي أَوَّلِ طَعَامِهِ عِنْدَ وُقُوفِهِ عَلَى ذَلِكَ مِنْ نَفْسِهِ: بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ، وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۲۰/۳)

اسی طرح محدث کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بھی حضرت عائشہؓ کی حدیث کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص شروع میں "بسم اللہ" پڑھنا بھول گیا تو کھانے کے درمیان یاد آنے پر پڑھ لے، تو اس کی برکت کھانے میں ضرور حاصل ہوگی یعنی وہ کھانا شیطان کی شرکت سے محفوظ رہے گا۔

عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: فَإِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ أي طعاما (فاليذكر اسم اللّٰه) عليه، (فإن نَسِيَ أَنْ يَذْكُرَ اسْمَ اللّٰهِ فى أوله فَلْيَقُلْ: بِاسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ) أي في اوّله وآخره، فيحصل له بركة التسمية فى الاول ايضا. (بذل المجهود: ١١/ ٤٩٤، رقم الحديث: ٣٧٦٧)

باب: ١٦٩

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الصَّلَاةِ الَّتِي سَمَّاهَا خِدَاجًا مَا هِيَ؟ وَمَا حُكْمُهَا فِي ذَلِكَ؟ هَلْ هُوَ فَسَادُهَا وَوُجُوبُ إِعَادَتِهَا أَوْ مَا سِوَى ذَلِكَ؟

﴿ نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے کا حکم ﴾

حَدَّثَنَا حُسَيْنُ بْنُ نَصْرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ يَزِيدَ بْنِ هَارُونَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ عَبَّادِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ أَبِيهِ عَبَّادٍ عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "كُلُّ صَلَاةٍ لَمْ يُقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ". (شرح مشكل الآثار: ٣/ ١٢١، ح: ١٠٨٧، سنن أبي داود: ١/ ٣٥٩، مجمع الزوائد: ٢/ ٢٨٦، ح: ٢٦٥٤، مرقات المفاتيح: ٢/ ٥٤٦، ح: ٨٢٢) ورواه الترمذی: (٢٩٥٣) والنسائی: (٩٠٩) وابن ماجه: (٨٣٨) ومالك فی الموطا (٢٢٤) واحمد: ١٢٩١)

خلاصۃ الحدیث:

نماز بدنی عبادت میں سب سے اہم عبادت ہے، نماز دین کا ستون ہے، نماز آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ ہے، نماز بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے؛ لیکن یادرہے کہ نماز کی تکمیل اوراس کے فوائد کا ظہور کچھ فرائض اور واجبات کی دائیگی پر موقوف ہے، اسی وجہ سے اگر واجبات

صلوۃ میں سے کوئی واجب چھوٹ جاتا ہے تو نماز میں نقصان پیدا ہوجاتا ہے، اور سجدہ سہو واجب ہوتا ہے، مثلاً سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، اگر کوئی اس کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کی نماز کو حدیث الباب میں خداج سے تعبیر کیا ہے۔

جیسا کہ روایت میں مذکور ہے: (جس شخص نے نماز میں ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کی تلاوت نہیں کی تو اس کی نماز خداج ہے، یعنی ناقص ہے۔

لفظ خداج کی وضاحت:

احادیث مبارکہ میں ''خداج مخدج، نیز لفظ خداج بالتکرار وارد ہوا ہے''، جس کا معنی: ناقص، ادھورا، حمل کا نقصان، اور پیدائشی نقص ہے۔

فَوَجَدْنَاهُ النُّقْصَانَ فِي الخلق وَوَجَدْنَاهُ النُّقْصَانَ فِي مُدَّةِ الْحَمْلِ، فَيُقَالُ لِمَنْ كَانَ نَاقِصًا فِي خَلْقِهِ أَوْ نَاقِصًا فِي مُدَّةِ الْحَمْلِ بِهِ: إِنَّهُ خِدَاجٌ. (شرح مشکل الآثار: ۱۲۳/۳)

چنانچہ اس باب کی پہلی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نماز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت نہ کی جائے تو وہ خداج ہے، لیکن آگے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے علاوہ دوسری نماز کو بھی خداج سے تعبیر کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز دو دو رکعت ہیں، ہر دو رکعت کے درمیان تشہد ہے، اور نماز کو ٹھہر ٹھہر کر سکون سے ادا کرنا ہے، جو اس طرح نماز ادا نہ کرے تو اس کی نماز خداج ہے۔

ثُمَّ وَجَدْنَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَدْ سَمَّى صَلَاةً أُخْرَى: خِدَاجًا لِمَعْنًى غَيْرِ الْمَعْنَى الَّذِي سَمَّى بِهِ هَذِهِ الصَّلَاةَ خِدَاجا.

كَمَا حَدَّثَنَا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ مَرْوَانَ الرَّقِّيُّ،۔۔۔۔ عَنْ أَنَسِ بْنِ أَبِي أَنَسٍ، مِنْ أَهْلِ مِصْرَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ نَافِعِ بْنِ الْعَمْيَاءِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْحَارِثِ، عَنِ الْمُطَّلِبِ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: " الصَّلَاةُ مَثْنَى مَثْنَى، وَتَشَهُّدٌ فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَتَبَاؤُسٌ

وَتَمَسْكُنٌ وَتُقْنِعُ بِيَدَيْكَ وَتَقُولَ: اللّٰهُمَّ اللّٰهُمَّ، فَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَهِيَ خِدَاجٌ". (شرح مشکل الآثار: ۱۲۴/۳)

اختلاف الفقہاء:

حدیث الباب اور مذکورہ حدیث دونوں میں نماز کے متعلق صفت خداج کو ذکر کیا ہے، چنانچہ مذکورہ دونوں حدیث سے شوافع اور حنابلہ استدلال کرتے ہیں کہ جس شخص نے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کی تلاوت نہیں کی تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی۔

وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ وَفِي الْحَدِيثِ الَّذِي قَبْلَهُ الَّذِي ذَكَرْنَاهُ فِي أَوَّلِ هَذَا الْبَابِ وَصْفُ تَيْنِكَ الصَّلَاتَيْنِ أَنَّهُمَا خِدَاجٌ، فَقَالَ قَوْمٌ: إِنَّ مَنْ صَلَّى وَلَمْ يَقْرَأْ فِي صَلَاتِهِ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ مِنْهَا فَاتِحَةَ الْكِتَابِ لَمْ تُجْزِهِ، وَجَعَلُوا التَّقْصِيرَ الَّذِي دَخَلَهَا حَتَّى عَادَتْ خِدَاجًا يُبْطِلُهَا. (شرح مشکل الآثار: ۱۳۱/۳)

احناف کی رائے اور دلائل:

اس کے برخلاف احناف کا نظریہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے نہ پڑھنے کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی، بلکہ نماز میں نقص آجاتا ہے، اور نقص کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی؛ بلکہ اس میں جو کمی آتی ہے، وہ سجدہ سہو سے مکمل ہوجاتی ہے، حنفیہ کا مستدل ایک طویل روایت ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اخیر عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علالت کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئے، کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ مسجد میں بھی بمشکل دو آدمیوں کے سہارے سے آئے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو امام متعین کر دیا تھا، ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے کہ دوران نماز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا احساس ہوتا ہے تو وہ پیچھے کی طرف ہٹنے لگتے ہیں؛ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو نماز مکمل کرانے کا

حکم دیتے ہیں، مگر حضرت ابوبکرؓ "الادب فوق الأمر" کی بنیاد پر پیچھے آ گئے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بقیہ نماز کی امامت کی، اور حضرت ابوبکر اور سارے صحابہ نے اقتداء کیا۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درمیانی قرأت سے حضرت ابوبکرؓ کی اقتداء میں نماز مکمل کرنا دوصورتوں سے خالی نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز میں داخل ہوئے اس وقت یا تو حضرت ابوبکرؓ نے مکمل سورہ فاتحہ یا کچھ حصہ تو پڑھ ہی لیا ہوگا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درمیانی قرأت میں داخل ہونے کے باوجود سورہ فاتحہ کی قرأت نہیں کی اور سورہ فاتحہ کے قرأت کے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز درست بھی ہوگئی، چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سورہ فاتحہ کے چھوٹ جانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

وَقَدْ خَالَفَهُمْ فِي ذَلِكَ قَوْمٌ مِنْهُمْ أَبُو حَنِيفَةَ وَأَصْحَابُهُ فَجَعَلُوهَا جَارِيَةً مُخْدَجَةً بِتَرْكِ مُصَلِّيهَا فَاتِحَةَ الْكِتَابِ فِيهَا، وَذَهَبُوا إِلَى أَنَّ الْخِدَاجَ لَا يَذْهَبُ بِهِ الشَّيْءُ الَّذِي يُسَمَّى بِهِ، إِنَّمَا يَنْقُصُ بِهِ، فَالصَّلَاةُ الَّتِي ذَكَرْنَا لَمَّا وَجَبَ نُقْصَانُهَا لَمْ تَكُنْ مَعْدُومَةً وَلَكِنَّهَا مَوْجُودَةٌ نَاقِصَةٌ، وَلَيْسَ كُلُّ مَنْ نَقَصَتْ صَلَاتُهُ بِمَعْنًى تَرَكَهُ مِنْهَا يَجِبُ بِهِ فَسَادُهَا، قَدْ رَأَيْنَاهُ بِتَرْكِهِ إِتْمَامَ رُكُوعِهَا وَإِتْمَامَ سُجُودِهَا فَيَكُونُ ذَلِكَ نَقْصًا مِنْهَا، وَلَا تَكُونُ بِهِ فَاسِدَةً يَجِبُ إِعَادَتُهَا، فَلَا يُنْكَرُ أَنْ يَكُونَ بِتَرْكِ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِيهَا نَاقِصَةً نُقْصَانًا لَا يَجِبُ مَعَهُ إِعَادَتُهَا. وَقَدْ وَجَدْنَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى ذَلِكَ وَهُوَ مَا حَدَّثَنَا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ مَرْوَانَ الرَّقِّيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا الْفِرْيَابِيُّ، ح وَمَا حَدَّثَنَا بَكَّارُ بْنُ قُتَيْبَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا بَكْرُ بْنُ بَكَّارٍ، وَمَا حَدَّثَنَا رَبِيعٌ الْمُرَادِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَسَدٌ، قَالُوا جَمِيعًا: حَدَّثَنَا إِسْرَائِيلُ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ أَرْقَمَ بْنِ شُرَحْبِيلَ، قَالَ: سَافَرْتُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ مِنَ الْمَدِينَةِ إِلَى الشَّامِ فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا مَرِضَ مَرَضَهُ الَّذِي مَاتَ فِيهِ كَانَ فِي بَيْتِ عَائِشَةَ فَقَالَ: "ادْعُ لِي عَلِيًّا" فَقَالَتْ: أَلَا نَدْعُو لَكَ أَبَا بَكْرٍ قَالَ: "ادْعُوهُ" فَقَالَتْ حَفْصَةُ: أَلَا نَدْعُو

لَكَ عُمَرَ قَالَ: "ادْعُوهُ"، فَقَالَتْ أُمُّ الْفَضْلِ: أَلَا نَدْعُو لَكَ الْعَبَّاسَ عَمَّكَ قَالَ: "ادْعُوهُ"، فَلَمَّا حَضَرُوا رَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ قَالَ: "لِيُصَلِّ لِلنَّاسِ أَبُو بَكْرٍ" فَتَقَدَّمَ أَبُو بَكْرٍ يُصَلِّي بِالنَّاسِ وَوَجَدَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ نَفْسِهِ خِفَّةً فَخَرَجَ يُهَادَى بَيْنَ رَجُلَيْنِ فَلَمَّا أَحَسَّهُ أَبُو بَكْرٍ سَبَّحُوا، فَذَهَبَ أَبُو بَكْرٍ يَتَأَخَّرُ، فَأَشَارَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَكَانَكَ"، فَاسْتَتَمَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حَيْثُ انْتَهَى أَبُو بَكْرٍ مِنَ الْقِرَاءَةِ، وَأَبُو بَكْرٍ قَائِمٌ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ فَائْتَمَّ أَبُو بَكْرٍ بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَائْتَمَّ النَّاسُ بِأَبِي بَكْرٍ. (شرح مشکل الآثار:۳/۱۳۱)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَتَمَّ مِنْ حَيْثُ انْتَهَى أَبُو بَكْرٍ إِلَيْهِ مِنَ الْقِرَاءَةِ، فَلَمْ يَخْلُ ذَلِكَ مِنْ أَحَدِ وَجْهَيْنِ: أَنْ يَكُونَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ فِي الْقِرَاءَةِ وَقَدْ قَرَأَ أَبُو بَكْرٍ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ، أَوْ قَدْ قَرَأَ بَعْضَهَا، فَلَمْ يَقْرَأْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَلَا شَيْئًا مِنْهَا. (شرح مشکل الآثار:۳/۱۳۲)

قرأت فاتحہ کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان امام ومقتدی کا اختلاف

اوپر ہم نے شوافع اور حنابلہ کو دیکھا کہ وہ سورۂ فاتحہ کی قراءت نہ کرنے سے امام ومقتدی کو برابر قرار دے کر دونوں کی نماز کے فساد کا حکم لگاتے ہیں، لیکن یہ حضرات اس لاحق کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کرتے، جو امام کے رکوع میں جانے کے بعد نماز میں داخل ہوتا ہے، اور رکعت کے چھوٹنے کے ڈر سے سورۂ فاتحہ کی قرأت نہیں کرتا، چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت کے بغیر بھی نماز درست ہوجاتی ہے۔

پس اگر شوافع اور حنابلہ کہیں کہ یہ حکم تو محض ایک ضرورت کے لئے تھا؛ کیوں کہ اگر لاحق

سورہ فاتحہ کی قرأت کرے گا، تو اس کی وہ رکعت چھوٹ جائے گی۔

لہٰذا احناف ان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ضرورت فرض کو ساقط نہیں کرتی، مطلب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، کہ اگر یہی لاحق نماز میں تھوڑی دیر قیام کئے بغیر رکوع میں چلا جاتا ہے، تو اس کی وہ نماز درست نہیں ہوتی، اس لئے کہ رکوع سے پہلے قیام فرض ہے، اگر سورۂ فاتحہ کی قرأت کا بھی یہی حکم ہوتا، تو قرأت کے بغیر نماز ہی مکمل نہ ہوتی، جب کے معاملہ اس کے برخلاف ہے کہ لاحق کی نماز بغیر قرأت فاتحہ کے بھی درست ہو جاتی ہے، تو معلوم ہوا کہ قرأت فاتحہ واجب ہے نہ کہ فرض۔ (واللہ اعلم بالصواب)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَتَمَّ مِنْ حَيْثُ انْتَهَى أَبُو بَكْرٍ إِلَيْهِ مِنَ الْقِرَاءَةِ , فَلَمْ يَخْلُ ذَلِكَ مِنْ أَحَدِ وَجْهَيْنِ: أَنْ يَكُونَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ فِي الْقِرَاءَةِ وَقَدْ قَرَأَ أَبُو بَكْرٍ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ، أَوْ قَدْ قَرَأَ بَعْضَهَا، فَلَمْ يَقْرَأْ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَلَا شَيْئًا مِنْهَا، وَكَانَتْ صَلَاتُهُ تِلْكَ قَدْ أَجْزَتْهُ بِذَلِكَ , فَكَانَ فِي ذَلِكَ دَلِيلٌ أَنَّ تَرْكَ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ أَوْ بَعْضِهَا لَا تُفْسِدُ بِهِ الصَّلَاةُ كَمَا يَقُولُ الَّذِينَ يَقُولُونَ ذَلِكَ، . (شرح مشکل الآثار: ۱۳۳/۳)

باب: ۱۷۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ فِي فَضْلِ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ عَلَى صَلَاةِ الْفَذِّ

﴿ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت ﴾

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ عَلَى صَلَاةِ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِينَ دَرَجَةً". (شرح مشکل الآثار: ۱۳۴/۳، ورواه

البخاری(۶۴۵) ومسلم (۶۵۰) والترمذی(۲۱۵) وابن ماجه (۷۸۹) والنسائی (۸۳۷) والموطالمالک (۳۴۱)والدارمی(۱۳۱۳)واحمد(۴۶۷۰)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تعالیٰ نے جو عبادات اپنے بندوں پر فرض کی ہیں، ان میں سب سے اہم عبادت نماز ہے، جسے ایک نظم کے تحت جماعت کے ساتھ ادا کرنا اس عبادت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، یقیناً نماز باجماعت ادا کرنے میں بڑے فوائد ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دین اسلام اور اللہ رب العزت کے حکم کی تعمیل کا برسر عام اظہار ہوتا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت خصوصیت کے ساتھ متوجہ ہوتی ہے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ نماز باجماعت ادا کرنے کی وجہ سے مساجد آباد ہوتی ہیں، مساجد آباد رکھنا مسلمانوں کا ملی فریضہ ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ مومن کے ہر عمل صالح کا ثواب دس گنا عطا کرتا ہے، لیکن نماز ہی وہ منفرد عبادت ہے، جسے اگر مومن خشوع وخضوع کے ساتھ باجماعت پڑھتا ہے، تو اس کا ثواب ستائیس (۲۷) گنا تک عطا کرتے ہیں، الغرض امام طحاویؒ نے حدیث الباب میں اسی مضمون کو واضح کیا ہے۔

تعارض:

حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب ستائیس (۲۷) گنا تک اضافہ کرکے دیں گے، لیکن اسی باب کی دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے ہے اس میں یہ ذکر ہے کہ تنہا آدمی کی نماز سے باجماعت کا ثواب پچیس (۲۵) گنا زیادہ دیں گے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةِ أَحَدِكُمْ وَحْدَهُ بِخَمْسَةٍ وَعِشْرِينَ جُزْءًا''. (شرح مشکل الآثار:۱۳۵/۳)

اس اعتبار سے حدیث الباب اور حدیث ابی ہریرہؓ میں تعارض ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: قَالَ قَائِلٌ: هَذَانِ الْحَدِيثَانِ يُضَادُّ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ مِنْهُمَا ؛ لِأَنَّ فِي أَحَدِهِمَا أَنَّ الَّذِي تَفْضُلُ بِهِ صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ صَلَاةَ الْوَاحِدِ سَبْعٌ وَعِشْرُونَ دَرَجَةً ، وَفِي الْآخَرِ: أَنَّ الَّذِي تَفْضُلُهَا بِهِ خَمْسَةٌ وَعِشْرُونَ جُزْءًا. (شرح مشکل الآثار:۳/۱۳۵)

جمع وتطبیق:

حقیقت یہ ہے کہ دونوں حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب پچیس گناہ زیادہ دینے کا وعدہ فرمایا، جس کا ذکر حدیث ابی ہریرہ میں ہے، پھر بعد میں اس کے ثواب میں دو درجے اور بڑھا دئے، اس لئے ستائیس درجے ہوگئے، اسی کا تذکرہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللهِ وَعَوْنِهِ: أَنْ لَا تَضَادَّ فِيهِمَا إِذْ كَانَ قَدْ يَحْتَمِلُ أَنْ يَكُونَ الَّذِي جَعَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ بِصَلَاةِ الْجَمَاعَةِ مِنَ الْفَضْلِ أَوَّلًا عَلَى صَلَاةِ الْفَذِّ خَمْسًا وَعِشْرِينَ دَرَجَةً عَلَى مَا فِي حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ مِنْهُمَا ، ثُمَّ زَادَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي فَضْلِهَا عَلَى صَلَاةِ الْوَاحِدِ جُزْئَيْنِ آخَرَيْنِ عَلَى مَا فِي حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ فَكَانَ ذَلِكَ زِيَادَةً لَا تَضَادًّا وَبِاللهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار:۳/۱۳۵)

اقوال المحدثین:

حافظ ابن حجرؒ نے درج ذیل شکلوں میں دونوں احادیث کی توجیہ کی ہیں، کبھی عدد کا اختلاف تمیز کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں تمیز ''درجۃً'' ہے، جبکہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں تمیز ''جزءاً'' ہے اور ''جزء'' کا تعلق دنیا سے ہے اور ''درجۃ'' کا تعلق آخرت سے ہے، یعنی دنیا میں ۲۵ درجہ ثواب ملے گا، جیسا کہ حضرت

ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے اور آخرت میں ۲۷ درجہ ثواب ملے گا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں ہے، تو یہ اختلاف تغایر زمان پر مبنی ہے۔

ان اختلاف العددین باختلاف ممیزھا وقال بعضھم: الجزء فی الدنیا والدرجة فی الاخرة وھو مبنی علی التغایر. (فتح الباری: ج:۲، ص:۱۷۵، ح:۶۴۵)

کبھی مصلی کی حالت کے اعتبار سے ثواب ملتا ہے، جتنا زیادہ خشوع وخضوع ہوگا، اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا، اور کم خشوع کی وجہ سے کم ثواب ملے گا۔

الفرق بحال المصلی کأن یکون اعلم او اخشع. (فتح الباری: ج:۲، ص:۱۷۵، ح: ۶۴۵)

کبھی مسجد کے قریب وبعید ہونے کے اعتبار سے ثواب میں فرق ہوگا، مسجد دور ہے تو چلنے کی مشقت کی وجہ سے زیادہ ثواب ملے گا۔

بقرب المسجد وبعدہ. (فتح الباری: ج:۲، ص:۱۷۵، ح:۶۴۵)

کبھی کثرت جماعت اور قلت جماعت کے اعتبار سے ثواب میں کمی بیشی ہوگی۔

الفرق بکثرة الجماعة وقلتھم. (فتح الباری: ج:۲، ص:۱۷۵، ح:۶۴۵)

لہذا ۲۵ / کا عدد ذکر کرنے سے ۲۷ درجہ ثواب کی نفی نہیں ہوگی، یعنی عدد قلیل کثیر کی نفی نہیں کرتا۔ ان ذکر القلیل لا ینفی الکثیر. (ایضاً)

کبھی جہری اور سری نماز کی وجہ سے ثواب میں فرق ہوتا ہے، چنانچہ جہری نماز میں ۲۷ / درجہ ثواب ملے گا اور سری نماز میں ۲۵ / درجہ۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک تمام جوابات میں سب سے بہتر جواب یہی ہے۔ (ایضاً)

مفتی اعظم مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ نے حافظ ابن حجرؒ کے جوابات میں

سے اس جواب کو درسِ ترمذی میں تحریر کیا ہے کہ ادنی ترین جماعت دوآدمیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔(ایک امام اور ایک مقتدی)، لہذا جن روایات میں ۲۵/کا عدد مذکور ہے، وہاں صرف اجرِ فضیلت کو بیان کیا گیا ہے اور جن روایات میں ۲۷/کا عدد مذکور ہے وہاں اجرِ فضیلت کے ساتھ دوآدمیوں کے اجرِ اصلی کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔(درس ترمذی:۱/۴۸۱)

ترجیح وجہ ترجیح:

یہاں دیگر محدثین نے ترجیح کے طریق کو اپناتے ہوئے ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح دی ہے، اس میں دو اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عمرؓ کی روایت کو ترجیح ہوگی اس لئے کہ اس کے رواۃ عادل، حافظ ہیں۔

(۲) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت راجح ہے؛ کیوں کہ اس کے رواۃ کثیر تعداد میں ہیں۔

وقد رجّح بعضهم رواية الخمس لكثرة رواتها وقيل رواية السبع، لانّ فيها زيادة من عدلٍ حافظٍ. (حاشیہ طحاوی:۱۳۵/۳)

باب: ۱۷۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "إِنَّ الرَّجُلَ لَيُصَلِّي الصَّلَاةَ وَمَا يُكْتَبُ لَهُ مِنْهَا إِلَّا عُشْرُهَا" أَوْ مَا سِوَى ذٰلِكَ مِمَّا ذَكَرَ مِنْ أَجْزَائِهَا

﴿ مصلی کو اپنے عمل اور نیت کے اعتبار سے نماز کا ثواب ملتا ہے ﴾

عَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ، أَنَّهُ صَلَّى صَلَاةً فَخَفَّفَ فِيهَا , فَقَالَ لَهُ: لَقَدْ صَلَّيْتَ صَلَاةً

خَفَّفْتَ فِيهَا قَالَ: هَلْ رَأَيْتَنِي انْتَقَصْتُ شَيْئًا مِنْ حُدُودِهَا؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ عَمَّارٌ: بَادَرْتُ وَسْوَاسَ الشَّيْطَانِ، إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "إِنَّ الْعَبْدَ لَيَنْصَرِفُ مِنْ صَلَاتِهِ ,وَمَا كُتِبَ لَهُ مِنْهَا إِلَّا عُشْرُهَا أَوْ تُسْعُهَا أَوْ ثُمْنُهَا أَوْ سُبْعُهَا أَوْ سُدُسُهَا أَوْ خُمُسُهَا أَوْ رُبُعُهَا أَوْ ثُلُثُهَا أَوْ نِصْفُهَا". (شرح مشکل الآثار: ۱۳۶/۳، ح:۱۱۰۳، مسند احمد: ۳۲۱/۴، ابوداود: ۱/ ۳۵۳، ح:۷۹۶، نسائی شریف: ۲۱۱/۱، ب:۱۲۹)

خلاصۃ الحدیث:

یقیناً بدنی عبادات میں نماز کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کو دین کا ستون قرار دیا ہے، اس کی ادائیگی پر بڑی فضیلت اور نیکی کا وعدہ فرمایا ہے، اور تمام فضائل اور ثواب کی تحصیل نماز کے فرائض، واجبات، سنن ومستحبات اور خشوع وخضوع کے اہتمام پر موقوف ہے، اس لئے مصلی کی طرف سے اس کے اہتمام میں جیسے جیسے کوتاہی پائی جاتی ہے، اسی اعتبار سے نماز کے ثواب میں کمی واقع ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مصلی کو کبھی دسواں حصہ ثواب ملتا ہے، کبھی نواں حصہ، اسی طرح کم ہوتا جاتا ہے، بہرحال امام طحاویؒ نے اس مضمون کو ثابت کرنے کے لئے کئی روایات پیش کی ہیں۔

سوال:

سائل نے سوال کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امتِ مسلمہ کو اس حدیث سے کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَسَأَلَ سَائِلٌ عَنْ مَعْنَى هَذَا الْحَدِيثِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۳۹/۳)

جواب:

تمام محدثین نے مختلف تعبیرات میں اس حدیث کا ایک ہی مطلب بیان فرمایا ہے کہ مصلی کو نماز کی ادائیگی پر اپنی کوشش کے اعتبار سے ثواب ملتا ہے، یعنی نماز کے ارکان و

واجبات اور مستحبات مثلاً قیام، رکوع، سجود، قرأت، تسبیحات اور نفسانی وشیطانی خیالات سے اپنے آپ کو بچا کر خشوع وخضوع میں جتنا زیادہ اہتمام ہوگا، اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا، اور اگر ایسا نقص پایا جائے، جو مفسدِ صلاۃ نہ ہو تو ثواب میں کمی ہوتی جائے گی، البتہ فریضہ ساقط ہو جائے گا۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ وَعَوْنِهِ بَعْدَ تَأَمُّلِنَا إِيَّاهُ: أَنَّ الْمُرَادَ بِذَلِكَ عِنْدَنَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ أَنْ تَكُونَ الصَّلَاةُ إِذَا صَلَّاهَا الرَّجُلُ كَمَا أُمِرَ أَنْ يُصَلِّيَهَا مِنْ إِتْمَامِ قِيَامِهَا وَرُكُوعِهَا وَسُجُودِهَا وَقُعُودِهَا وَالْقِرَاءَةِ فِيهَا وَذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ الَّذِي يُؤْمَرُ بِهِ فِيهَا وَخُشُوعِهِ فِيهَا وَإِقْبَالِهِ عَلَيْهَا وَتَرْكِهِ التَّشَاغُلَ عَنْهَا بِشَيْءٍ سِوَاهَا يَدْعُوهُ إِلَى التَّقْصِيرِ عَنْ إِكْمَالِهَا يُؤْتِيهِ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ذَلِكَ مَا شَاءَ أَنْ يُؤْتِيَهُ إِيَّاهُ عَلَيْهِ بِجَدِّهِ إِيَّاهُ عَلَى مَا كَانَ مِنْهُ فِيهَا، وَإِذَا قَصَّرَ عَمَّا ذَكَرْنَاهُ فِيهَا تَقْصِيرًا لَمْ يُخْرِجْهُ مِنْهَا، وَلَكِنَّهُ كَانَ بِهِ مُنْتَقِصًا مِنْهَا مَا قَدْ كَانَ يَجِبُ عَلَيْهِ أَلَّا يَنْتَقِصَهُ مِنْهَا مِنَ الذِّكْرِ، وَمِمَّا سِوَاهُ مِنْ إِشْكَالِهِ إِيَّاهُ عَلَى مَا جَاءَ بِهِ مِنْهَا بِمِقْدَارِ مِمَّا كَانَ يُؤْتِيهِ لَوْ كَانَ جَاءَ بِهَا بِكَمَالِهَا عَلَى مَا يُؤْمَرُ بِهِ فِيهَا مِنَ الْأَجْرِ الَّذِي يُؤْتِيهِ عَلَى ذَلِكَ مِنْ قَلِيلِ أَجْزَائِهِ وَمِنْ كَثِيرِهَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِ رَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِي ذَلِكَ، وَإِيَّاهُ نَسْأَلُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۳۹/۳)

فتح الربانی کی عبارت:

ان اتی بها تامة الارکان وکان مخلصا خاشعا. فاذا نقص من ذلک شیئا نقص من ثوابه بقدره. (الفتح الربانی: ۲۲۹/۲، (۱۳۸/۴)

باب: ۱۷۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَطْعِ الْمُسْلِمِينَ نَخْلَ بَنِي النَّضِيرِ وَتَحْرِيقِهَا، وَفِي السَّبَبِ الَّذِي فِيهِ نَزَلَتْ:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا﴾ [الحشر: ۵]

﴿دشمن کے علاقے میں آگ لگانے اور کھیتی وغیرہ کا نقصان کرنے کا بیان﴾

عَنْ سُفْيَانَ، عَنْ مُوسَى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ: "أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطَعَ نَخْلَ بَنِي النَّضِيرِ وَحَرَّقَ ". (شرح مشکل الآثار: ۱۴۰/۳، ب:۱۷۲، مسند احمد جدید: ۹۳/۵، ح:۵۵۲۰، بخاری: ح:۳۰۲۱، باب حرق الدور والنخیل، مسلم: ح:۱۷۴۶)

خلاصۃ الحدیث:

مکہ سے مدینہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے تشریف لائے، تو یہاں یہود پہلے سے آباد تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے معاہدہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت وآبرو کی پاسداری کریں گے، بالخصوص یہود کے قبائل میں سے بنونضیر اس معاہدہ میں شامل تھا، مگر اس نے عہد شکنی کی جیسا کہ حدیث الباب میں بنونضیر کی مخالفت اور ان کو دی جانے والی سزا کی طرف اشارہ ہے، اس لئے یہاں اس واقعہ کو مختصراً بیان کر دیا جا رہا ہے، در اصل عمر بن امیہ الضمری کو اس معاہدہ کا علم نہ تھا، اور لاعلمی میں انہوں نے بنو عامر کے دو افراد کا قتل کر دیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو عامر کے دونوں مقتول کے اہل خانہ کو دیت دینے کا فیصلہ کیا، دیت چوں کہ زیادہ تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنونضیر سے چندہ کا مطالبہ کیا، بجائے اس کے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاونت کرتے، ان خبیثوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنالیا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو ایک دیوار کے سائے تلے بیٹھا دیا، اور چھت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر پتھر گرانے کی تدبیر کرنے لگے، اسی دوران اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بذریعہ وحی ان کے کالے منصوبہ سے آگاہ کیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بہ سلامت گھر تشریف لے آئے، اور بنونضیر کو عہد شکنی کی وجہ سے دس دن کے اندر مدینہ خالی کرنے کا حکم دیا، لیکن بنونضیر نے

عبداللہ بن اُبی کی باتوں میں آ کر مدینہ خالی نہیں کیا، تو بدلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا محاصرہ کرلیا، کئی دنوں تک محاصرہ کرنے کے باوجود جب وہ اپنے قلع سے باہر نہ آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے درختوں کو کاٹنے اور جلانے کا حکم دیا، آخر تنگ آ کر جب وہ باہر نکلے، تو انہیں جلاوطن کردیا گیا، الغرض صاحب کتاب نے اسی واقعہ کے تحت یہاں اس باب کو قائم کیا ہے۔

اشکال:

قرآن کریم کی ہر آیت امت مسلمہ کی ہدایت کا ذریعہ ہے، کوئی بھی آیت فائدہ سے خالی نہیں، لیکن حدیث یونس سے معلوم ہوا کہ تحریق نخل کے واقعہ کے بعد ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّينَةٍ﴾ [الحشر:۵] الْآيَةَ کے نزول کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَقَالَ قَائِلٌ: فِي حَدِيثِ يُونُسَ الَّذِي رَوَيْتَهُ مِنْ هَذِهِ الْأَحَادِيثِ مَا قَدْ دَلَّ أَنَّ نُزُولَ قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّينَةٍ﴾ [الحشر:۵] الْآيَةَ، إِنَّمَا كَانَ ذَلِكَ بَعْدَ أَنْ كَانَ مِنْهُمْ مِنَ الْقَطْعِ وَالتَّحْرِيقِ مَا كَانَ .... (شرح مشکل الآثار:۱۴۲/۳)

جواب:

معترض کا قول کہ آیت کریمہ: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّينَةٍ﴾ [الحشر:۵] کا نزول بے فائدہ ہے، ایسا کہنا اس کی کم فہمی اور منشاء رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اس لئے کہ قرآن کریم کی کوئی بھی آیت فائدہ سے خالی نہیں، تحریق نخل کے واقعہ کے بعد اس آیت کے نزول کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تحریق نخل کے بعد بہت سے صحابہ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ تحریق نخل درست نہیں، انہیں اپنے فعل پر شرمندگی ہوئی، اسی طرح بعض وہ صحابہ جنہوں نے تحریق نخل نہیں کیا تھا، انہیں اندیشہ ہوا، کہ شاید تحریق نخل نہ کرنا اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے، چنانچہ وہ حضرات

شدومد میں پڑ گئے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آیت کریمہ ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّينَةٍ﴾ [الحشر: ۵] کے ذریعہ ان کی دل جوئی کی کہ جو کچھ بھی ہوا، سب اللہ کے جانب سے تھا، اس لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ أَنَّ هَذَا الْحَدِيثَ لَمْ يَسْتَوْعِبِ السَّبَبَ الَّذِي كَانَ فِيهِ نُزُولُ هَذِهِ الْآيَةِ , وَأَنَّهُ قَدْ كَانَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ قَبْلَ نُزُولِهَا مَا كَانَ مِنْ نُزُولِهَا فِيهِ عَلَيْهِمْ أَكْبَرُ الْفَائِدَةِ وَلَمْ نَجِدْهُ إِلَّا فِي حَدِيثٍ يُرْوَى عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ.

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ هَذِهِ الْآيَةَ أَنْزَلَهَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَعْلَمَ بِهَا الْمُسْلِمُونَ أَنَّ الَّذِي كَانَ مِنْ قَطْعِهِمْ لَمَّا قَطَعُوا مِنْ نَخْلِ بَنِي النَّضِيرِ وَتَحْرِيقِهَا مُبَاحٌ لَهُمْ لَا إِثْمَ عَلَيْهِمْ فِيهِ , وَأَنَّ الَّذِي تَرَكُوهُ مِنْهَا فَلَمْ يَقْطَعُوهُ وَلَمْ يُحَرِّقُوهُ مُبَاحٌ لَهُمْ لَا إِثْمَ عَلَيْهِمْ فِيهِ , فَبَانَ بِذَلِكَ مَوْضِعُ الْفَائِدَةِ فِي نُزُولِ هَذِهِ الْآيَةِ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۴۴)

تعارض:

یہاں دو روایت باہم متعارض ہیں، حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ ”احراق اور قطع اشجار“ ”فی بلاد العدو“ جائز ہے، جب کہ اس کے برخلاف حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے جس میں حضرت ابوبکرؓ نے شام کی طرف بھیجے جانے والے لشکر کو احراق شجر سے منع کیا تھا۔

عَن ابن شهاب قال: حدثني سعيد بن المسيب أَنَّ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيقَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ لَمَّا بَعَثَ أُمَرَاءَ الْجُنُودِ نَحْوَ الشَّامِ يَزِيدَ بْنَ أَبِي سُفْيَانَ وَعَمْرَو بْنَ الْعَاصِ وَشُرَحْبِيلَ بْنَ حَسَنَةَ قَالَ: ”أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ اغْزُوَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ، فَإِنَّ اللّٰهَ

نَاصِرُ دِينَهُ، وَلَا تَغُلُّوا وَلَا تَغْدِرُوا وَلَا تَجْبُنُوا وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ، وَلَا تُغْرِقُنَّ نَخْلًا وَلَا تُحَرِّقُنَّهَا وَلَا تَعْقِرُوا بَهِيمَةً وَلَا شَجَرَةً تُثْمِرُ وَلَا تَهْدِمُوا بِيْعَةً". (شرح مشکل الآثار: ۱۴۴/۳)

نیز اعتراض یہ ہے کہ ''﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّينَةٍ﴾ [الحشر: ۵]'' الخ۔۔آیت کا علم حضرت ابوبکرؓ کو بھی تھا اور دیگر صحابہ کو بھی تھا، پھر بھی حضرت ابوبکرؓ نے امراءِ لشکر کو احراق شجر عدو سے منع فرمایا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس آیت کا سبب نزول حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کی روایت سے مختلف ہے، کیوں کہ اگر سبب نزول سے احراق شجر کے جواز کا علم ہوتا، تو حضرت ابوبکر صدیقؓ امراءِ لشکر کو احراق شجر سے منع نہ فرماتے؟

وَقَالَ قَائِلٌ آخَرُ: قَدْ رُوِيَ عَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيمَا كَانَ تَقَدَّمَ بِهِ إِلَى أُمَرَاءِ الْأَجْنَادِ لَمَّا وَجَّهَهُمْ إِلَى الشَّامِ مَا يَدُلُّ عَلَى خِلَافِ مَا فِي هَذِهِ الْأَحَادِيثِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَابْنِ عَبَّاسٍ....... (شرح مشکل الآثار: ۱۴۴/۳)

قَالَ هَذَا الْقَائِلُ: فَأَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَدْ قَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ، وَقَدْ قَرَأَهَا أُمَرَاءُ الْأَجْنَادِ الَّذِينَ تَقَدَّمَ إِلَيْهِمْ بِمَا تَقَدَّمَ إِلَيْهِمْ بِهِ فِي هَذَا الْحَدِيثِ....... (شرح مشکل الآثار: ۱۴۶/۳)

جمع و تطبیق:

امام طحاویؒ کا نظریہ یہ ہے کہ آیت کا سبب نزول حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے موافق ہے، البتہ حضرت ابوبکرؓ کے منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے سے ہی انہیں بتادیا تھا کہ شام اور روم پر ہمارا غلبہ ہوگا اور فتح ہوکر جب تمام مال ہمارے قبضہ میں آنے والا ہے، تو تحریق نخل سے ہمارا ہی نقصان ہوگا، اسی لئے شفقتاً منع فرمایا، تقریباً یہی نظریہ امام شافعیؒ کا بھی ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ وَعَوْنِهِ أَنَّ الَّذِي فِي ذَيْنِكَ الْحَدِيثَيْنِ مِنَ

السَّبَبِ الَّذِي كَانَ فِيهِ نُزُولُ هَذِهِ الْآيَةِ كَمَا فِيهِمَا .... (شرح مشکل الآثار: ۱۴۶/۳)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ أَمْرُ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أُمَرَاءَ الْأَجْنَادِ بِمَا أَمَرَهُمْ بِهِ فِي حَدِيثِهِ الَّذِي رَوَيْنَاهُ لِهَذَا الْمَعْنَى الَّذِي فِي هَذِهِ الْأَحَادِيثِ ... (شرح مشکل الآثار: ۱۴۹/۳)

اقوال المحدثین:

امام طبریؒ کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا مقصد یہ ہے کہ قصداً اپنی طرف سے اقدام نہیں کرنا ہے، ہاں اگر اثناء جنگ میں اس کی نوبت آجائے تو منع نہیں، جنگ میں مثلاً عورتوں اور بچوں کو مارنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ بھی قتال میں شریک ہیں تو انہیں بھی قتل کیا، جائے گا۔

وحمل الإمام الطبری نهی ابی بکر علی القصد لذلك بخلاف ما اذا اصابوا ذلك فی خلال القتال، کما وقع فی نصب المنجنیق علی الطائف، وهو نحو ما أجاب فی النهی عن قتل النساء والصبیان. (حاشیة شرح مشکل الآثار: ۱۴۵/۳)

اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے:

عن رباح بن ربیع قال کنا مع رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی غزوة۔۔۔فقال انظر علی ما اجتمع هؤلاء فجاء فقال علی امرأة قتیل فقال ما کانت هٰذه لتقاتل. (ابوداود، کتاب الجهاد: ح(٢٦٦٩)

اور امام شافعیؒ اور کوفیوں نے بھی عورتوں کو اس صورت میں قتل کی اجازت دی ہے، جب کہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی جنگ میں شریک ہوں۔

وقال الشافعی والکوفیون: قالوا: اذا قاتلت المرأة جاز قتلها وکذا الصبی المراهق، ویؤیده حدیث رباح بن الربیع انه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رأی إمرأة مقتولة فقال "ما کانت هٰذه لتقاتل" فإن مفهومه انها لو قاتلت لقتلت. (بذل المجهود، کتاب الجهاد: ۲۸۸/۹)

باب: ۱۷۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قِيَامِ الرِّجَالِ بَعْضِهِمْ إِلَى بَعْضٍ

﴿کسی معزز شخص کے اکرام میں لوگوں کا کھڑا ہونا﴾

حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ هِشَامُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ قُرَّةَ بْنِ أَبِي خَلِيفَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو جَعْفَرٍ أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ سَلَامَةَ بْنِ سَلَمَةَ الْأَزْدِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا يُونُسُ بْنُ عَبْدِ الْأَعْلَى، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ وَهْبٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي يُونُسُ بْنُ يَزِيدَ، قَالَ: قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: وَأَخْبَرَنِي عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ كَعْبٍ، أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ كَعْبٍ، قَالَ: سَمِعْتُ كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ، يُحَدِّثُ بِحَدِيثِ تَوْبَتِهِ، قَالَ: فَانْطَلَقْتُ أَتَأَمَّمُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَلَقَّانِي النَّاسُ فَوْجًا فَوْجًا يُهَنِّئُونَنِي بِالتَّوْبَةِ , وَيَقُولُونَ: لِتَهْنَكَ تَوْبَةُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْكَ، حَتَّى دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ فَإِذَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ حَوْلَهُ النَّاسُ فَقَامَ إِلَيَّ طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللهِ يُهَرْوِلُ حَتَّى صَافَحَنِي وَهَنَّأَنِي، وَاللّٰهِ مَا قَامَ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ غَيْرُهُ، قَالَ: فَكَانَ كَعْبٌ لَا يَنْسَاهَا لِطَلْحَةَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۵۰/۳، ح:۱۱۱۵، صحیح البخاری:ص:۴۹، ح: ۴۴۱۸، صحیح مسلم:ص:۱۲۶۹، ح:۲۷۶۹)أبوداود:(۲۷۷۳)ترمذی:(۳۱۰۲)

خلاصۃ الحدیث:

انسانی زندگی میں یہ طریقہ بہت زیادہ رائج ہے کہ جب بھی کوئی بادشاہ یا معزز شخص کسی مجلس میں آتا ہے، تو لوگ اس کے اعزاز واکرام میں کھڑے ہوجاتے ہیں، بالخصوص اہل عجم، اس میں بہت زیادہ غلو کرتے ہیں، کہ وہ حضرات ایسے بادشاہوں کے لئے اتنی دیر تک کھڑے رہتے ہیں کہ ان کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوگوں کا ایک دوسرے کے لئے کھڑے ہوکر اکرام کرنا کیسا ہے، جائز ہے یا ناجائز؟ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جنگ تبوک میں چند صحابہ کے نہ شریک ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ نے ان سے تقریباً ۵۰ ر دنوں تک ترک کلام کیا، صاحب واقعہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خود ذکر کرتے ہیں کہ ۵۰ ر دنوں کے بائیکاٹ کے بعد جب میری توبہ قبول ہوئی تو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے لئے ان کی مجلس میں حاضر ہوا، اس وقت حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر میرا استقبال کیا، اور مجھے توبہ کی قبولیت کی خوش خبری دی، صاحب کتاب نے اسی واقعہ کے تحت یہاں اس باب کو قائم کیا ہے، کہ کیا لوگوں کا ایک دوسرے کے لئے کھڑا ہونا درست ہے؟ اس کی کیا صورت ہے؟ کس صورت میں جائز ہے اور کس صورت میں ناجائز ہے؟

تعارض:

ظاہر ہے کہ حدیث الباب میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے لئے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے کھڑے ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی نکیر نہیں کی، جب کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان کی روایت میں اس عمل پر وعید آئی ہے، اس اعتبار سے یہاں تعارض واقع ہے۔

حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَعْبَدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شَبَابَةُ بْنُ سَوَّارٍ، قَالَ: حَدَّثَنِي الْمُغِيرَةُ بْنُ مُسْلِمٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ بُرَيْدَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِي سُفْيَانَ، يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَسْتَجِمَّ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۵۴)

جمع و تطبیق:

اصل میں مذکورہ دونوں روایت میں کوئی تعارض نہیں، اس لئے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں مطلقاً کھڑے ہونے کی اجازت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے اس پر نکیر نہیں کی ہے، جبکہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کی روایت میں جو وعید وارد ہے وہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی شخص پسند کرے کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں، تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے، لہذا اب یہاں کوئی تضاد باقی نہ رہا۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ أَنَّ هَذَا الْحَدِيثَ عِنْدَنَا غَيْرُ مُخَالِفٍ لِلْأَحَادِيثِ الْأُوَلِ الَّتِي رَوَيْنَاهَا فِي هَذَا الْبَابِ؛ لِأَنَّ الْأَحَادِيثَ الْأُوَلَ الَّتِي رَوَيْنَاهَا فِي هَذَا الْبَابِ فِيهَا إِطْلَاقُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِيَامَ الرِّجَالِ بَعْضِهِمْ إِلَى بَعْضٍ بِاخْتِيَارِ الْقَائِمِينَ لِذَلِكَ لَا بِذِكْرِ مَحَبَّةِ الَّذِينَ قَامُوا لَهُمْ إِيَّاهُ مِنْهُمْ. (شرح مشکل الآثار: ۱۵۵/۳)

اشکال:

صحابہ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اپنی جان مال، آل اولاد کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے، اور ایک اشارہ پر سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھے، پھر بھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے تھے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لئے کھڑے ہونا پسند نہیں فرماتے تھے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک دوسرے کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں۔

وَحَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ مَرْزُوقٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا حِبَّانُ بْنُ هِلَالٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، عَنْ حُمَيْدٍ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: "لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكَانُوا إِذَا رَأَوْهُ لَمْ يَقُومُوا لَهُ لِمَا يَعْلَمُوا مِنْ كَرَاهَتِهِ لِذَلِكَ". (شرح مشکل الآثار: ۱۵۵/۳)

جواب:

حضرت انسؓ کی مذکورہ روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے لئے کھڑے ہونے کو پسند نہ کرنا، اس وجہ سے نہیں تھا کہ ایک دوسرے کے لئے کھڑا ہونا حرام ہے، بلکہ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تواضع تھا، اگر ایک دوسرے کے لئے کھڑا ہونا حرام ہی ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ کو حضرت سعید بن معاذؓ کے لئے کھڑے ہونے کا حکم نہیں دیتے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ قَدْ دَلَّ أَنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا كَانُوا يَتْرُكُونَ الْقِيَامَ لَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعِلْمِهِمْ بِكَرَاهَتِهِ لِذَلِكَ مِنْهُمْ وَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى أَنَّهُمْ لَوْلَا كَرَاهَتُهُ لِذَلِكَ مِنْهُمْ لَقَامُوا لَهُ وَقَدْ تَكُونُ كَرَاهَتُهُ لِذَلِكَ مِنْهُمْ عَلَى وَجْهِ التَّوَاضُعِ مِنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِذَلِكَ؛ لَا لِأَنَّهُ حَرَامٌ عَلَيْهِمْ أَنْ يَفْعَلُوا ذَلِكَ لَهُ، وَكَيْفَ يُظَنُّ أَنَّ ذَلِكَ حَرَامٌ عَلَيْهِمْ وَقَدْ أَمَرَهُمْ بِالْقِيَامِ إِلَى سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ وَقَامَ بِمَحْضَرِهِ طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللهِ إِلَى كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عِنْدَ نُزُولِ تَوْبَتِهِ مُهَنِّئًا لَهُ بِذَلِكَ فَلَمْ يَنْهَهُ عَنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۵۴/۳)

تعارض:

اس باب میں حضرت معاویہؓ کی دو روایت ہیں:

(۱) "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَسْتَجِمَّ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ". (شرح مشکل الآثار: ۱۵۶/۳)

(۲) "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ". (شرح مشکل الآثار: ۱۵۶/۳)

دونوں حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں، تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے؛ لیکن ایک جماعت نے حضرت معاویہؓ کی مذکورہ روایت "مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" سے لغوی معنی مراد لیا ہے، ان کا نظریہ ہے کہ قیام سے عجمیوں کا قیام مراد ہے؛ یعنی اہل عجم اپنے بادشاہوں کے لئے اتنی دیر کھڑے ہوتے تھے کہ ان کی طبیعت بگڑنے لگتی تھی، اور یہ ان پر بڑا شاق گزرتا تھا، اس لئے یہاں وعید اس شخص کے بارے میں ہے، جو عجمیوں کے طریقہ پر کھڑے ہونے کو پسند کرے۔

۱۱۲۷ - وَحَدَّثَنَا بَكَّارُ بْنُ قُتَيْبَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا رَوْحُ بْنُ عُبَادَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا حَبِيبُ

بْنُ الشَّهِيدِ، عَنْ أَبِي مِجْلَزٍ، قَالَ: دَخَلَ مُعَاوِيَةُ بَيْتًا فِيهِ عَبْدُ اللهِ بْنُ الزُّبَيْرِ وَعَبْدُ اللهِ بْنُ عَامِرٍ فَقَامَ ابْنُ عَامِرٍ وَثَبَتَ ابْنُ الزُّبَيْرِ وَكَانَ أَوْزَنَهُمَا، ....(شرح مشکل الآثار:۱۵۶/۳)

فَدَلَّ ذَلِكَ أَنَّ الْمَكْرُوهَ مِمَّا ذَكَرْنَاهُ هُوَ الْمَحَبَّةُ مِنْ بَعْضِ الرِّجَالِ لِذَلِكَ مِنْ بَعْضٍ، وَقَدْ تَكُونُ تِلْكَ الْمَحَبَّةُ مِنَ الْقِيَامِ إِلَيْهِمْ، وَقَدْ تَكُونُ بِلَا قِيَامٍ إِلَيْهِمْ، فَدَلَّ ذَلِكَ عَلَى أَنَّ الْكَرَاهِيَةَ فِي ذَلِكَ إِنَّمَا هِيَ لِلْمَحَبَّةِ الَّتِي ذَكَرْنَا لِلْقِيَامِ الَّذِي لَا مَحَبَّةَ مَعَهُ ....(شرح مشکل الآثار:۱۵۷/۳)

رفع تعارض:

بعض حضرات نے جو عجمیوں کے طریقہ پر کھڑے ہونے کا معنی مراد لیا ہے، وہ معنی یہاں مراد لینا محال ہے، اس لئے کہ حضرت معاویہؓ کی مذکورہ روایت میں حضرت معاویہؓ نے عبداللہ بن عامرؓ کو فورا بٹھادیا تھا، اگر حدیث سے عجمیوں کا طریقہ مقصود ہوتا تو حضرت معاویہؓ عبداللہ بن عامرؓ کو بیٹھنے کا حکم نہ دیتے، چنانچہ ان حضرات کا لغوی تأویل کرنا نا قابل قبول ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَهَذَا عِنْدَنَا مُسْتَحِيلٌ؛ لِأَنَّ الْحَدِيثَ الْمَرْوِيَّ فِي ذَلِكَ إِنَّمَا دَارَ عَلَى مُعَاوِيَةَ لَا مَخْرَجَ لَهُ سِوَاهُ وَقَدْ كَانَ فِيهِ مَا خَاطَبَ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَامِرٍ مَا كَانَ بِغَيْرِ إِطَالَةٍ مِنَ ابْنِ عَامِرٍ لَهُ فِي ذَلِكَ قِيَامًا، فَدَلَّ ذَلِكَ عَلَى انْتِفَاءِ هَذَا التَّأْوِيلِ، وَفِي انْتِفَائِهِ ثُبُوتُ التَّأْوِيلِ الْأَوَّلِ. (شرح مشکل الآثار:۱۵۷/۳)

باب: ۱۷۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مُرَادِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَعْنِهِ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ

﴿اپنے بال کے ساتھ دوسرے بال لگانے اور لگوانے والی عورت پر لعنت﴾

۱۱۲۸ - حَدَّثَنَا فَهْدُ بْنُ سُلَيْمَانَ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ أَبِي قَيْسٍ، عَنِ الْهُزَيْلِ بْنِ شُرَحْبِيلَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ، قَالَ: "لَعَنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَاصِلَةَ وَالْمَوْصُولَةَ". (شرح مشکل الآثار: ۱۵۸/۳، ح: ۱۱۲۸، صحیح البخاری: ص: ۷۴۹، ح: ۵۹۳۷، صحیح مسلم: ص: ۱۱۹، ح: ۲۱۲۳، سنن نسائی: ج: ۶/ص: ۱۴۹، ح: ۳۴۱۶، کنز العمال: ج: ۱۶، ص: ۶۰۴، ح: ۴۶۰۲۴)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تمام مخلوق سے افضل اور بہتر بنایا، اور وہ حسن و جمال عطا کیا، جو کسی اور کو نہیں ملا، قرآن کریم میں اس کی واضح مثال ہے ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ [تین: ۴] یقیناً ہم نے انسان کو بہترین سانچہ میں ڈھالا ہے، لہذا اب اس جسم میں کمی تلاش کرنا، اور اس میں بے جا تبدیلی کرنا کفران نعمت اور جرم عظیم ہے، اور ایسے لوگوں پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے، جیسا کہ حدیث الباب میں ہے، ("لَعَنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَاصِلَةَ وَالْمَوْصُولَةَ") رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الگ سے بال جوڑنے والی اور جوڑوانے والی پر لعنت فرمائی ہے۔

تعارض:

حدیث الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا اپنے بال کے ساتھ بال جوڑنا یا کسی طرح کا مصنوعی بال جوڑنا جائز نہیں ہے، جب کہ اس کے برخلاف اہل علم حضرات نے اُون یا ریشم کے مصنوعی بال کو جوڑنے کی اجازت دی ہے، اور اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: "لَا بَأْسَ أَنْ تَصِلَ الْمَرْأَةُ شَعْرَهَا بِالصُّوفِ". (شرح مشکل الآثار:۳/۱۶۲)

نیز حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

عَنْ بُكَيْرٍ عَنْ أُمِّهِ أَنَّهَا دَخَلَتْ عَلَى عَائِشَةَ وَهِيَ عَرُوسٌ، وَمَعَهَا مَاشِطَتُهَا، فَقَالَتْ عَائِشَةُ: "أَشَعْرُهَا هَذَا؟" فَقَالَتِ الْمَاشِطَةُ: شَعْرُهَا وَغَيْرُهُ وَصَلْتُهُ بِصُوفٍ، قَالَتْ أُمُّ بُكَيْرٍ: فَلَمْ أَسْمَعْهَا تُنْكِرُ ذَلِكَ، قَالَ بُكَيْرٌ وَإِنَّمَا يُكْرَهُ أَنْ يُوصَلَ بِالشَّعْرِ. (شرح مشکل الآثار:۳/۱۶۳)

اس اعتبار سے حدیث الباب اور مذکورہ دونوں حدیث میں تعارض پایا جارہا ہے۔

ثُمَّ وَجَدْنَا أَهْلَ الْعِلْمِ جَمِيعًا بَعْدَ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُبِيحُونَ صِلَةَ الشَّعْرِ بِغَيْرِ الشَّعْرِ مِنَ الصُّوفِ، وَمِمَّا أَشْبَهَهُ وَيَرْوُونَ فِي ذَلِكَ عَنْ مَنْ تَقَدَّمَهُمْ. (شرح مشکل الآثار:۳/۱۶۲)

جمع و تطبیق:

امام طحاویؒ نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واصلہ اور مستوصلہ سے تمام عورتوں کو مراد نہیں لیا، بلکہ صرف ان عورتوں کو مراد لیا ہے جو بال کے ساتھ بال جوڑتی ہیں، یا یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے تمام عورتوں کو مراد لیا تھا، بعد میں اُون اور ریشم کے مصنوعی بال لگانے کی اجازت دے دی ہو۔

اس لئے کہ علماء و محدثین کا اپنے طرف سے کسی حدیث کے معنی کو بدل کر بیان کرنا محال ہے، بلکہ انہوں نے وہی روایت نقل کی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، اگر وہ اپنی طرف سے معنی میں تبدیلی کرتے، تو ان کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی، بلکہ حدیث کے برخلاف معنی بدلنے کی وجہ سے ان کی عدالت باقی نہ رہتی، اور عدالت کے ساقط ہونے کی وجہ سے ان کی روایت بھی قابل قبول نہ ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ ان حضرات کی روایت پر آج بھی امت عمل پیرا ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَعَائِشَةُ أَحَدُ مَنْ رَوَيْنَا عَنْهَا فِي هَذَا الْبَابِ لَعْنَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ، فَلَمْ يَكُنْ يَخْرُجُ مِنْ ذَلِكَ إِلَّا مَا قَدْ عَلِمَتْ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَآلِهِ لَمْ يُرِدْهُ بِلَعْنِهِ ذَلِكَ، أَوْ أَنَّهُ أَرَادَهُ ثُمَّ أَخْرَجَهُ مِنْهُ، وَلَمْ يَكُنْ أَهْلُ الْعِلْمِ الْمَأْمُونُونَ عَلَى نَقْلِهِ يُخْرِجُونَ مِنْ حَدِيثٍ قَدْ رَوَوْهُ مُحْتَمِلًا عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا يُوجِبُ ظَاهِرُهُ دُخُولَهُ فِيهِ إِلَّا بَعْدَ عِلْمِهِمْ بِخُرُوجِهِ مِنْهُ، وَلَوْلَا ذَلِكَ لَسَقَطَ عَدْلُهُمْ وَكَانَ فِي سُقُوطِ عَدْلِهِمْ سُقُوطُ رِوَايَتِهِمْ، وَحَاشَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يَكُونُوا كَذَلِكَ، وَاللّٰهَ نَسْتَوْفِقُ وَنَسْأَلُهُ السَّدَادَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۶۳/۳)

اقوال المحدثین:

واصلۃ اور مستوصلہ کے سلسلہ میں محدثین کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) امام نوویؒ اور حافظ ابن حجرؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مطلق بال کے ساتھ کسی بھی چیز کا جوڑنا حرام ہے، چاہے وہ اصلی بال ہو، یا مصنوعی بال، یا اُون وغیرہ ہو، جیسا کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ذکر کیا ہے:

یحرم الوصل مطلقا، سواء کان بشعر آدمی او شعر غیر آدمی، وسواء کان بخرقۃ او بصوف، وھذا القول جعلہ النووی الظاھر المختار، وھو الذی ذکرہ الخافظ فی الفتح.

(فتح الملھم: ج:۱۰/ص:۱۶۵)

(۲) اس کے علاوہ بعض شوافع کی رائے یہ ہے کہ آدمی کا بال جوڑنا حرام ہے، اسی طرح انسان کے علاوہ نجس چیز یا نجس جانور کا بال لگانا بھی حرام ہے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ذکر کیا ہے:

الوصل بشعر الآدمی حرام، وکذلک الوصل بشعر نجس من غیر الآدمی وأما الشعر الطاھر من غیر الآدمی فیجوز وصلہ بہ بإذن الزوج والسید وھو قول البعض الشافعی، کما حکی عنھم النووی. (فتح الملھم: ج:۱۰، ص:۱۶۵)

(۳) اسی طرح لیث بن سعدؒ کا قول ہے کہ انسانی بال کے ساتھ دوسرے بال کا جوڑنا ممنوع ہے، چاہے انسان کا ہو یا جانور کا، ہاں! بال اُون وغیرہ کی اجازت ہے۔

الوصل بالشعر ممنوع مطلقا، سواء کان بشعر الآدمی او شعر الحیوان، ولکن لا بأس بوصله بصوف او حرق او غیرها، وهو قول اللیث بن سعد. (فتح الملهم:۱۰/۱۶۵)

(۴) اور حافظ ابن حجر کا نظریہ یہ ہے کہ: مصنوعی بال لگانا حلال ہے، جب کے اصلی بال کے مشابہ نہ ہو اور اگر مشابہ ہو تو جائز نہیں۔

الوصل بغیر الشعر انمایحل إذا لم یلتبس بالشعر بحیث لا یظن الناظر أنه من الشعر اما إذا وقع به الالتباس فلا وهو الذی قواه الحافظ فی الفتح .(فتح الملهم :ج: ۱۰، ص:۱۶۵)

باب: ۱۷۵

بَابُ بَیَانِ مُشْکِلِ مَارُوِيَ مِنْ قَوْلِهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: "أَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ، مَامِنْهَامَوْضِعُ قَدَمٍ" فِي أَحَدِ الْحَدِیثَیْنِ الْمَرْوِیَّیْنِ فِي ذٰلِكَ وَفِي الْآخَرِ مِنْهُمَا "مَامِنْهَامَوْضِعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلَّا وَفِیهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ"

﴿ فرشتوں کی عبادت کا مثالی مظہر ﴾

۱۱۳۴ - حَدَّثَنَا أَبُو غَسَّانَ مَالِكُ بْنُ یَحْیَی الْهَمْدَانِيُّ وَمُحَمَّدُ بْنُ بَحْرِ بْنِ مَطَرٍ الْبَغْدَادِيُّ قَالَا: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ بْنُ عَطَاءٍ، قَالَ: أَخْبَرَنَا سَعِیدٌ وَهُوَ ابْنُ أَبِي عَرُوبَةَ عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ صَفْوَانَ بْنِ مُحْرِزٍ، أَنَّ حَکِیمَ بْنَ حِزَامٍ قَالَ: بَیْنَمَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَعَ أَصْحَابِهِ إِذْ قَالَ لَهُمْ: "هَلْ تَسْمَعُونَ مَا أَسْمَعُ؟" قَالُوا: مَا نَسْمَعُ مِنْ شَيْءٍ یَا رَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: "إِنِّي لَأَسْمَعُ أَطِیطَ السَّمَاءِ، وَمَا تُلَامُ أَنْ تَئِطَّ، وَمَا فِیهَا مَوْضِعُ قَدَمٍ إِلَّا وَعَلَیْهِ مَلَكٌ إِمَّا سَاجِدٌ، وَإِمَّا قَائِمٌ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۶۷، ح: ۱۱۳۴)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں بے شمار مخلوق کو پیدا کیا ہے، انہیں مخلوق میں سے ایک لطیف اور نورانی مخلوق (فرشتہ) بھی ہے، جس کو عام آدمی دیکھ نہیں سکتا، جس طرح اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح فرشوں کے ہونے پر بھی ایمان ویقین رکھنا ضروری ہے، اس کے بغیر ایمان نامکمل ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ فرشتوں کو بھی اعمال کا مکلف بنایا ہے، قرآن کریم میں متعدد مقام پر ان کا ذکر وارد ہے مثلاً (کراما کاتبین) کا ذکر ہے، یہ وہ فرشتے ہیں جو بندہ کے اعمال کو لکھتے ہیں، دوسری جگہ پر ہے (لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ) یہ وہ فرشہ ہیں جو بندہ کی حفاظت پر مأمور ہیں۔

الغرض فرشتوں کی بے شمار ذمہ داریاں ہیں، جنہیں وہ بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں جیسا کہ سورہ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے ﴿لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾[تحریم:٦] جو اللہ کے کسی حکم میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہ وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے) نیز ان کی تعریف میں متعدد احادیث وارد ہیں، جیسا کہ امام طحاویؒ نے یہاں اس باب میں ایک حدیث کے تحت بحث کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آسمان میں چار انگلی کے برابر بھی جگہ خالی نہیں، جہاں فرشتے اللہ کی عبادت نہ کررہے ہوں، بعض برابر رکوع ہی میں ہیں، تو بعض سجدے میں، ان کی کثرت عبادت کی وجہ سے آسمان بوجھل ہوگیا ہے، اور آسمان سے آواز آرہی ہے، جس کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا اور صحابہ کرام کے سامنے اس کا تذکرہ کیا۔

سوال:

حدیث الباب میں جو (موضع قدم) اسی طرح چار انگلی جگہ کے بقدر فرشتوں کے عبادت کرنے سے کیا مراد ہے؟

فَقَالَ قَائِلٌ: وَهَلْ تَعْقِلُونَ أَنْ يَكُونَ فِي مَوْضِعِ قَدَمٍ أَوْ فِي مَوْضِعِ أَرْبَعِ أَصَابِعَ مَلَكٌ سَاجِدٌ أَوْ رَاكِعٌ؟(شرح مشکل الآثار: ۱۶۸/۳)

جواب:

امام طحاویؒ نے بڑے ہی صاف لفظوں میں اس اشکال کا جواب دیا، اور ایسی مثال سے سمجھایا، جس کے بعد کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا، مثلاً: ایک چھوٹی سی چٹائی ہے جس پر ایک شخص بیٹھا ہے تو اس کو عربی میں "فلان جالس علی الحصير" کہتے ہیں، فلاں شخص چٹائی پر بیٹھا ہے، حالانکہ اس کے جسم کا کچھ حصہ چٹائی پر ہے اور کچھ حصہ چٹائی کے باہر زمین پر، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی بڑی چٹائی پر بیٹھا ہے تو اس کے بارے میں بھی "فلان جالس علی الحصير" کہتے ہیں، حالانکہ مکمل چٹائی پر اکیلے آدمی کا بیٹھنا محال ہے تو جس طرح چھوٹی چٹائی پر بیٹھنے والے کو "فلان جالس علی الحصير" کہتے ہیں حالانکہ اس کا بعض حصہ چٹائی سے باہر زمین پر بھی ہوتا ہے، اسی طرح ایک قدم یا چار انگل کے اندر فرشتے عبادت میں لگے ہوئے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ حصہ باہر بھی ہوگا، صرف ایک ہی جگہ میں عبادت کرنا مراد نہیں ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ: أَنَّ هَذَا الْكَلَامَ كَلَامٌ عَرَبِيٌّ يَفْهَمُهُ الْمُخَاطَبُونَ, وَيَقِفُونَ عَلَى مَا أَرَادَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهِ وَالْعَرَبُ تُطْلِقُ أَنْ يُقَالَ: فُلَانٌ جَالِسٌ عَلَى كَذَا لِمَا نَقَصَ عَنْهُ وَفُلَانٌ جَالِسٌ عَلَى كَذَا لِمَا يَفْضُلُ عَنْهُ, وَذَلِكَ مَوْجُودٌ فِي كَلَامِ النَّاسِ، يَقُولُونَ: فُلَانٌ جَالِسٌ عَلَى الْحَصِيرِ وَهِيَ مُقَصِّرَةٌ عَنْهُ، وَجُلُوسُهُ فِي الْحَقِيقَةِ عَلَيْهَا وَعَلَى غَيْرِهَا مِنَ الْأَرْضِ وَمِمَّا سِوَاهَا ......(شرح مشکل الآثار: ۱۶۹/۳-۱۶۸)

باب: ۱۷۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي رَدِّهِ عَلَى الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ لَمَّا سَأَلَهُ عَمَّا يَقُولُهُ إِذَا أَوَى إِلَى فِرَاشِهِ مِمَّا ذَكَرَهُ أَنَّهُ يَقُولُهُ فِيهِ

"وَرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ" بِقَوْلِهِ "وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ"

﴿سونے سے پہلے دعا کرنے کی ترغیب﴾

۱۱۳۶ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَمْرِو بْنِ يُونُسَ الْمَعْرُوفُ بِالسُّوسِيِّ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ مُحَمَّدٍ الْعَنْقَزِيُّ، عَنْ فِطْرِ بْنِ خَلِيفَةَ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَا بَرَاءُ، مَا تَقُولُ إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ؟" قَالَ: قُلْتُ: اللهُ عَزَّ وَجَلَّ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ: "فَإِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ طَاهِرًا فَتَوَسَّدْ يَمِينَكَ وَقُلِ: اللهُمَّ أَسْلَمْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ، وَفَوَّضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ، وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِي إِلَيْكَ رَهْبَةً وَرَغْبَةً إِلَيْكَ، لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَى مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ، آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ"، فَقُلْتُ كَمَا قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرَ أَنِّي قُلْتُ: وَرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ، قَالَ: فَطَعَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأُصْبُعِهِ فِي صَدْرِي، فَقَالَ لِي: "وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ" فَفَعَلْتُهُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۷۰/۳، ح:۱۱۳۶، أبوداود: ج: ۵، ص: ۱۸۸، ح:۵۰۴۷، البخاری: ح: ۶۳۱۱، مسلم: (۲۷۱۰)، الترمذی: ۳۳۹۴، ابن ماجه: (۳۸۷۶)

خلاصۃ الحدیث:

دعا عبادت کی روح اور مغز ہے، دعا اللہ تعالیٰ سے قربت اور اپنی مانگ پوری کروانے کا بہترین ذریعہ ہے، دعا ہر حال میں مفید ہے، دعا اگر فوراً قبول ہوتی ہے تو اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے، لیکن اگر فوراً قبول نہیں ہوتی، تب بھی دعا کرنے والے کو بڑی تسلی اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے، الغرض دعا ہر حال میں مفید ہے، اسی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر موقع پر علاحدہ علاحدہ دعا پڑھتے، اور صحابہ کرام کو اس کی تلقین فرماتے تھے جیسا کہ اس باب کی پہلی حدیث میں رات میں سونے سے پہلے ایک خاص دعا حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو پڑھنے اور اس کا اہتمام کرنے کی

ترغیب وتحریض فرمائی ہے۔

اشکال:

جب حضرت براء بن عازب ؓ نے (وَرسُولِكَ الّذِي أَرْسَلْتَ) پڑھا تو آپ ﷺ نے یہ پڑھنے سے منع کیوں فرمایا، اور (ونبيك الّذِي أَرْسَلْتَ) پڑھنے کا حکم کیوں دیا؟

فَسَأَلَ سَائِلٌ عَنِ الْمَعْنَى الَّذِي رَدَّ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَجْلِهِ عَلَى الْبَرَاءِ قَوْلَهُ: وَرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ وَأَمْرِهِ إِيَّاهُ أَنْ يَقُولَ مَكَانَ ذَلِكَ: وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ مَا هُوَ؟(شرح مشکل الآثار:۱۷۳/۳)

جواب:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں: چوں کہ نبی کا لفظ عام ہے اس میں رسالت اور نبوت دونوں داخل ہیں، جب کہ لفظ رسول خاص ہے، اور اس سے صرف رسالت کا معنی مترشح ہوتا ہے، اس لئے آپ ﷺ نے حضرت براء بن عازب ؓ کو دعا میں ''وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ'' پڑھنے کا حکم دیا۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيقُ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ: أَنَّ قَوْلَهُ: وَرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ، لَيْسَ فِيهِ إِلَّا الرِّسَالَةُ خَاصَّةً, وَالَّذِي رَدَّ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَمَرَهُ أَنْ يَقُولَ مَكَانَ ذَلِكَ, وَهُوَ: وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ يَجْمَعُ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ جَمِيعًا فَكَانَ أَوْلَى مِمَّا يَكُونُ عَلَى الرِّسَالَةِ دُونَ النُّبُوَّةِ, وَاللّٰهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار:۱۷۳/۳)

اقوال المحدثین:

(۱) امام مازریؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جو دعا سکھائی ہے بعینہ اسی حروف کے ساتھ پڑھنے پر ثواب اور جزاء کا حصول ہوتا ہے، اس لئے جن حروف کے ساتھ دعا مذکور ہو، ان ہی حروف اور الفاظ کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

واختار المارزی أن سبب الانکار ان ھذا ذکر ودعاء فینبغی فیه الاقتصار علی اللفظ الوارد بحروفه. (بذل المجھود: ج:۱۳،ص:۱۴۲، فتح الملھم: ج:۱۱،ص:۴۴۴، حاشیة شرح مشکل الآثار: ج:۳،ص:۱۷۳)

(۲) بعض اصحاب کا کہنا ہے کہ (رسولک) کہنے سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ صرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا ہے، انبیا پر نہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا۔

إنما رده لأن قوله آمنت برسولك يحتمل غير النّبي من حيث اللّفظ. (حاشية شرح مشكل الآثار: ج:۳،ص:۱۷۳)

(۳) امام نوویؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ''جس طرح رسول نبی کا معنی دیتا ہے ایسے ہی رسول قاصد کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

إنما رده، لأن قوله آمنت برسولك، ويحتمل غير النبي من حيث اللفظ. (حاشية شرح معاني الآثار: ج:۳،ص:۱۷۳)

باب: ۱۷۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَمْرِهِ زَوْجَةَ النَّحَّامِ أَنْ لَا تُكَحِّلَ ابْنَتَهَا فِي عِدَّتِهَا مِنْ وَفَاةِ زَوْجِهَا بَعْدَ أَنْ أَعْلَمَتْهُ خَوْفَهَا عَلَى عَيْنِهَا إِنْ لَمْ تَفْعَلْ ذَلِكَ

﴿ متوفی عنہا زوجہا کا عدت کی حالت میں سرمہ لگانے کا بیان ﴾

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، أَنَّ امْرَأَةً تُوُفِّيَ عَنْهَا زَوْجُهَا وَرَمَدَتْ، وَخَشَوْا عَلَى عَيْنِهَا، فَأَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَأْذَنُوهُ فِي الْكُحْلِ وَذَكَرُوا أَنَّهُمْ يَخْشَوْنَ عَلَى عَيْنِهَا فَقَالَ: ''لَا: قَدْ كَانَتْ إِحْدَاكُنَّ تَمْكُثُ فِي شَرِّ بَيْتِهَا فِي أَحْلَاسِهَا - أَوْ فِي أَحْلَاسِهَا فِي شَرِّ بَيْتِهَا -، فَإِذَا كَانَ حَوْلٌ مَرَّ كَلْبٌ فَرَمَتْهُ بِبَعْرَةٍ فَلَا، أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا''. (شرح مشكل الآثار:۱۷۴/۳،ح:۱۱۴۱،

البخاری: (۵۳۳۸)، مسلم: (۱۴۸۸)، ابوداود: (۲۲۹۹)، سنن الترمذی: (۱۱۹۷)، سنن النسائی: (۳۵۰۱)، ابن ماجه: (۲۰۸۴)، مؤطا مالك (۱۷۴۹)

خلاصۃ الحدیث:

نکاح اولادِ آدم کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ عظیم نعمت ہے، مرد وعورت کی عفت وعصمت کا یہ محافظتی قلعہ ہے، لیکن جس طرح طلاق سے رشتۂ زوجیت ختم ہوجاتا ہے اور اس کی وجہ سے مطلقہ کو بڑا غم اور صدمہ لاحق ہوتا ہے، اسی طرح شوہر کے فوت ہونے کی وجہ سے بھی رشتۂ زوجیت ختم ہوجاتا ہے، اور عورت کو غم وصدمہ لاحق ہوتا ہے، لہذا اب ایسی عورت پر چار ماہ دس دن تک زیب وزینت، نکاح دواعی نکاح حرام ہوجاتے ہیں، جس کو اصطلاح شرع میں عدت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور عدت کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معتدہ کو سرمہ لگانے، اسی طرح خوشبودار تیل لگانے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ حدیث الباب میں مذکور ہے، لیکن بعض دفعہ معتدہ کی آنکھ میں تکلیف ہوتی ہے، جس کی وجہ سے سرمہ لگانے کی ضرورت پڑتی ہے، تو کیا ایسی صورت میں بھی سرمہ لگانا جائز نہیں؟ تو اس سلسلہ میں محدثین کے مختلف اقوال ہیں جن کو امام طحاویؒ نے اس باب کے تحت واضح کیا ہے۔

تعارض:

حضرت ام سلمہؓ کی تمام روایات سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معتدہ کو اپنی عدت کے زمانہ میں مطلقاً سرمہ لگانے سے منع فرمایا ہے، لیکن حضرت ام سلمہؓ کی دوسری حدیث میں اجازت دی گئی ہے، مثلاً:

عَنْ المغيرة بن الضحاك ، يقول: أَخْبَرَتْنِي أُمُّ حَكِيمٍ بِنْتُ أَسِيدٍ، عَنْ أُمِّهَا، أَنَّ زَوْجَهَا تُوُفِّيَ فَكَانَتْ تَشْتَكِي فَتَكْتَحِلُ بِكُحْلِ الْجِلاَءِ، فَأَرْسَلَتْ مَوْلاَةً لَهَا إِلَى أُمِّ سَلَمَةَ فَسَأَلَتْهَا عَنْ كُحْلِ الْجِلاَءِ، فَقَالَتْ: لَا تَكْتَحِلِي إِلَّا مِنْ أَمْرٍ لَا بُدَّ مِنْهُ يَشْتَدُّ عَلَيْكِ فَتَكْتَحِلُ

بِاللَّيْلِ وَتَمْسَحُهُ بِالنَّهَارِ، ثُمَّ قَالَتْ عِنْدَ ذَلِكَ أُمُّ سَلَمَةَ: دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ تُوُفِّيَ أَبُو سَلَمَةَ وَقَدْ جَعَلْتُ عَلَى عَيْنِي صَبِرًا، فَقَالَ: "مَا هَذَا يَا أُمَّ سَلَمَةَ؟" قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّمَا هُوَ صَبِرٌ لَيْسَ فِيهِ طِيبٌ قَالَ: " إِنَّهُ يَشُبُّ الْوَجْهَ وَلَا تَجْعَلِيهِ إِلَّا بِاللَّيْلِ وَتَنْزِعِينَهُ بِالنَّهَارِ، وَلَا تَمْتَشِطِي بِالطِّيبِ وَلَا بِالْحِنَّاءِ فَإِنَّهُ خِضَابٌ"، قُلْتُ: بِأَيِّ شَيْءٍ أَمْتَشِطُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: "بِالسِّدْرِ تُغَلِّفِينَ بِهِ رَأْسَكِ"... (شرح مشکل الآثار: ۱۷۸/۳)

اسی بناء پر علماء نے ضرورت کے وقت سرمہ لگانے کی اجازت دی ہے اس اعتبار سے دونوں میں تعارض ہے؟

فَقَالَ قَائِلٌ: كَيْفَ تَقْبَلُونَ هَذَا عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَهْلُ الْعِلْمِ جَمِيعًا عَلَى خِلَافِهِ وَعَلَى إِبَاحَةِ الْكُحْلِ لِمِثْلِهَا لِلضَّرُورَةِ الدَّاعِيَةِ بِهَا إِلَى ذَلِكَ؟ (شرح مشکل الآثار: ۱۷۸/۳)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے کہ شدید ضرورت کے وقت معتدہ سرمہ لگاسکتی ہے، جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جن میں اس کی ممانعت ہے (مثلاً حضرت ام سلمہؓ کی روایت) تو وہ تمام احادیث منسوخ ہیں، اس لئے کہ راوی کی روایت جب اس کے قول کے خلاف ہو تو فعلی روایت منسوخ ہوتی ہے، لہٰذا ام سلمہ کی قولی روایت کا اعتبار ہوگا۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنْ قَوْلِ أُمِّ سَلَمَةَ لِلْمَرْأَةِ الَّتِي سَأَلَتْهَا عَمَّا سَأَلَتْهَا عَنْهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ: لَا تَفْعَلِي ذَلِكَ إِلَّا لِمَا لَا بُدَّ مِنْهُ، وَقَدْ سَمِعَتْ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يُخَالِفُ فَاسْتَحَالَ أَنْ يَكُونَ كَانَ ذَلِكَ مِنْهَا إِلَّا وَقَدْ عَلِمَتْ بِنَسْخِهِ مِنْ قِبَلِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؛ لِأَنَّهَا رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَيْهَا مَأْمُونَةٌ عَلَى مَا قَالَتْ كَمَا كَانَتْ مَأْمُونَةً عَلَى مَا رَوَتْ وَاللهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۷۹/۳)

اقوال المحدثین:

(۱) امام نوویؒ نے متعارض حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ مطلق نہی والی روایت پر عمل

اس وقت ہوگا جب کہ ضرورت نہ ہو، اور اگر شدید ضرورت ہے تو رات میں سرمہ لگانے کی اجازت ہے، دن میں نہیں، لیکن سرمہ نہ لگانا اولیٰ ہے۔

وجه الجمع بين الاحاديث انها اذالم تحتج اليه لا يحل لها وان احتاجت لم يجز بالنهار، ويجوز بالليل مع ان الأولى تركه. (شرح النووی علی مسلم، کتاب الطلاق، ک:۱۸، ب:۱۹)

(۲) علماء کی ایک جماعت نے یہ جواب دیا ہے کہ ضرورت کے وقت سرمہ لگانا جائز ہے اور نہی والی روایت کو نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے۔ (بذل المجهود: ج:۸، ص:۴۰۸)

(۳) شدید عذر کے وقت سرمہ لگانا جائز ہے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معتدہ عورت کو منع اس لئے کیا کہ اس کی بیماری ہلکی تھی، یا سرمہ لگائے بغیر دوسری دوا سے شفایابی کی امید تھی۔

واما نهيه عن الاكتحال فی حديث الباب فيحتمل ان تكون الضرورة لم تتحقق عنده، اما لخفة مرضها اولانه كان يحصل لها البرء بغير الكحل. (فتح الملهم: ۲۲۹/۷)

الغرض متوفی عنہا زوجہا بقدر ضرورت حالت عدت میں صرف رات میں سرمہ لگاسکتی ہے، اس بات کی تائید حضرت ام حکیم بنت اسید رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہوتی ہے۔

عَنِ المغيرة بن الضحاك يقول: أَخْبَرَتْنِي أُمُّ حَكِيمٍ بِنْتُ أَسِيدٍ، عَنْ أُمِّهَا، أَنَّ زَوْجَهَا تُوُفِّيَ فَكَانَتْ تَشْتَكِي فَتَكْتَحِلُ بِكُحْلِ الْجِلَاءِ، فَأَرْسَلَتْ مَوْلَاةً لَهَا إِلَى أُمِّ سَلَمَةَ فَسَأَلَتْهَا عَنْ كُحْلِ الْجِلَاءِ، فَقَالَتْ: لَا تَكْتَحِلِي إِلَّا مِنْ أَمْرٍ لَا بُدَّ مِنْهُ يَشْتَدُّ عَلَيْكِ فَتَكْتَحِلُ بِاللَّيْلِ وَتَمْسَحُهُ بِالنَّهَارِ، ثُمَّ قَالَتْ عِنْدَ ذَلِكَ أُمُّ سَلَمَةَ: دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ تُوُفِّيَ أَبُو سَلَمَةَ وَقَدْ جَعَلْتُ عَلَى عَيْنِي صَبِرًا، فَقَالَ: "مَا هَذَا يَا أُمَّ سَلَمَةَ؟" قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّمَا هُوَ صَبِرٌ لَيْسَ فِيهِ طِيبٌ قَالَ: "إِنَّهُ يَشُبُّ الْوَجْهَ وَلَا تَجْعَلِيهِ إِلَّا بِاللَّيْلِ وَتَنْزِعِينَهُ بِالنَّهَارِ، وَلَا تَمْتَشِطِي بِالطِّيبِ وَلَا بِالْحِنَّاءِ فَإِنَّهُ خِضَابٌ"، قُلْتُ: بِأَيِّ شَيْءٍ أَمْتَشِطُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: "بِالسِّدْرِ تُغَلِّفِينَ بِهِ رَأْسَكِ"... (ابوداود: (۲۳۰۵)، نسائی: (۲۰۴/۶)، شرح مشکل الآثار: ۱۷۸/۳)

باب: ۱۷۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَسْمَائِهِ

﴿ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناموں کا بیان ﴾

۱۱۵۰ - حَدَّثَنَا يُونُسُ، قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي يُونُسُ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِنَّ لِي خَمْسَةَ أَسْمَاءٍ: أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَنَا أَحْمَدُ، وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ بِي الْكُفْرَ، وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِي يَحْشُرُ اللَّهُ النَّاسَ عَلَى قَدَمِي، وَأَنَا الْعَاقِبُ" وَالْعَاقِبُ الَّذِي لَيْسَ بَعْدَهُ أَحَدٌ، وَقَدْ سَمَّاهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ رَءُوفًا رَحِيمًا، قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنْ تَسْمِيَةِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ إِيَّاهُ رَءُوفًا رَحِيمًا إِمَّا مِنْ كَلَامِ جُبَيْرٍ وَإِمَّا مِنْ كَلَامِ مَنْ سِوَاهُ مِنْ رُوَاتِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۸۱/۳، ح:۱۱۵۰، البخاری، ص: ۴۴۴، ح:۳۵۳۲، مسلم: ص:۱۱۰۵، ح: ۲۳۵۴، سنن الترمذی: ص: ۶۶۱، ح:۲۸۴۰، سنن الدارمی: (۲۸۱۷) ومسند احمد: (۱۶۷۳۴))

خلاصۃ الحدیث:

جس طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء مبارک ہیں، جن میں سے کچھ کا ذکر قرآن کریم میں ہے تو کچھ کا سابقہ آسمانی کتابوں میں، اور کچھ کا ذکر انبیاء علیہم السلام کی مبارک زبان سے احادیث میں، تاہم اس کی کل تعداد متعین نہیں ہے، بہر حال صاحب کتاب یہاں اس باب کو قائم کر کے ان احادیث کو ذکر فرما رہے ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء مبارک کا تذکرہ ہے۔

چنانچہ بعض نام ذاتی ہیں اور بعض صفاتی، مثلاً حدیث الباب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: میرے پانچ نام ہیں، میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں (جس کے ذریعہ

اللہ تعالیٰ کفر وشرک کو مٹاتا ہے، میں حاشر ہوں، (لوگوں کو میرے نقش قدم پر اٹھایا جائے گا، میں عاقب ہوں (جس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔

تعارض:

حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پانچ نام مذکور ہیں، اس کے بعد ایک روایت ذکر کی ہے، جس میں نافع عبد الملک بن مروان سے سوال کرتے ہیں، کیا آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ اسماء یاد ہیں جن کو جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا تھا؟ تو عبد الملک بن مروان جواب دیتے ہیں: جی ہاں! مجھے وہ کل چھ نام یاد ہیں، (محمد، احمد، خاتم، عاقب، حاشر، ماحی)، چنانچہ اس روایت میں حدیث الباب کے برخلاف چھ اسماء کا ذکر ہے، (خاتم زائد ہے) اس اعتبار سے دونوں احادیث میں تعارض واقع ہوا۔

عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرٍ، أَنَّهُ دَخَلَ عَلَى عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَرْوَانَ فَقَالَ لَهُ: "أَتُحْصِي أَسْمَاءَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّتِي كَانَ جُبَيْرُ بْنُ مُطْعِمٍ يَعُدُّهَا قَالَ: نَعَمْ هِيَ سِتَّةٌ: مُحَمَّدٌ وَأَحْمَدُ وَخَاتَمٌ وَحَاشِرٌ وَعَاقِبٌ وَمَاحٍ، فَأَمَّا الْحَاشِرُ فَبُعِثَ مَعَ السَّاعَةِ نَذِيرًا لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ، وَأَمَّا عَاقِبٌ فَإِنَّهُ أَعْقَبَ الْأَنْبِيَاءَ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِمْ، وَأَمَّا مَاحٍ فَإِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ مَحَا بِهِ سَيِّئَاتِ مَنِ اتَّبَعَهُ". (شرح مشکل الآثار: ۱۸۲/۳، ح: ۱۱۵۱)

عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ، قَالَ: سَمَّى لَنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفْسَهُ بِأَسْمَاءٍ فَقَالَ: "أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَحْمَدُ وَالْمُقَفِّي وَالْحَاشِرُ وَنَبِيُّ التَّوْبَةِ وَنَبِيُّ الْمَلْحَمَةِ". (شرح مشکل الآثار: ۱۸۳/۳، ح: ۱۱۵۲)

اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی حدیث الباب سے مختلف اسماء ہیں، تو سائل کا سوال ہے کہ جو زائد اور مختلف اسماء ہیں ان کا کیا معنی ہے؟

رفع تعارض:

اس تعارض کا جواب امام طحاوی رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ نام کسی کے تعارف اور ایک دوسرے

سے ممتاز کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے، چنانچہ بعض نام بغیر کسی علت کے مطلق رکھ دیئے جاتے ہیں ، اور بعض مسمیٰ لہ کی صفت کے اعتبار سے رکھے جاتے ہیں، چوں کہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام تر صفات حسنہ کے مالک، خاتم النبیین اور امت کے لئے بے انتہا رحم دل تھے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانوروں کے حق میں بھی بڑے مہربان اور مشفق تھے، اسی بنا پر سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی نام مذکور ہیں، نیز قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں متعدد جگہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی نام مذکور ہیں، جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ [الفتح: ۲۹]

نیز ایک دوسری آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنی قوم کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں: ﴿إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ [الصف: ٦] ان دونوں آیتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی نام (محمد، احمد) ہے۔

وَكَانَتِ الْأَسْمَاءُ تَنْقَسِمُ قِسْمَيْنِ: فَقِسْمٌ مِنْهَا تَكُونُ الْأَسْمَاءُ فِيهِ لَا لِعِلَّةٍ، كَالْحَجَرِ وَكَالْجَبَلِ، وَكَمَا سِوَى ذَلِكَ مِمَّا لَمْ يُسَمَّ بِمَعْنًى فِيهِ وَمِنْهَا مَا يُسَمَّى بِهِ لِمَعْنًى فِيهِ مِنْ صِفَاتِهِ: كَمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْحَمْدِ، وَكَأَحْمَدَ مِنَ الْحَمْدِ أَيْضًا، فَكَانَ هَذَانِ الِاسْمَانِ مِنْ أَسْمَائِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۸۴/۳)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی نام میں سے ماحی، حاشر اور عاقب بھی ہے، جن کا مفہوم خلاصۃ الحدیث کے تحت اوپر آچکا ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام (خاتم) بھی ہے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے آخری نبی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناموں میں سے مقفی بھی ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نبی التوبہ بھی رکھا گیا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ توبہ کرنے والوں کی توبہ کو قبول کیا ہے، ارشاد باری ہے: ﴿لَقَدْ تَابَ اللهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ﴾ [التوبة: ۱۱۷] نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی نام میں سے ''نبی ملحم'' بھی ہے اور

حضرت جبیر بن مطعم کی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی نام میں سے ''رؤوف ورحیم'' کا بھی ذکر ہے، جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾[التوبہ:۱۲۸]

چنانچہ مذکورہ تمام آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر صفت سے الگ الگ نام رکھنا جائز ہے، لیکن ترک بعض سے یہ مراد لینا درست نہیں کہ وہ اسماء آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام میں سے نہیں، الغرض حدیث الباب میں جو پانچ نام مذکور ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء صرف اسی پر منحصر نہیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی بے شمار اسماء ہیں جن کا ذکر دوسری احادیث میں ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللَّهِ وَعَوْنِهِ أَنَّ الْأَسْمَاءَ إِنَّمَا هِيَ أَعْلَامٌ لِأَشْيَاءَ يُرَادُ بِهَا التَّفْرِيقُ بَيْنَهَا وَإِبَانَةُ بَعْضِهَا مِنْ بَعْضٍ، وَكَانَتِ الْأَسْمَاءُ تَنْقَسِمُ قِسْمَيْنِ: فَقِسْمٌ مِنْهَا تَكُونُ الْأَسْمَاءُ فِيهِ لَا لِعِلَّةٍ، كَالْحَجَرِ وَكَالْجَبَلِ، وَكَمَا سِوَى ذَلِكَ مِمَّا لَمْ يُسَمَّ بِمَعْنًى فِيهِ وَمِنْهَا مَا يُسَمَّى بِهِ لِمَعْنًى فِيهِ مِنْ صِفَاتِهِ: كَمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْحَمْدِ، وَكَأَحْمَدَ مِنَ الْحَمْدِ أَيْضًا........(شرح مشکل الآثار:۱۸۴/۳)

باب: ۱۷۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْعِيدَيْنِ يَجْتَمِعَانِ فِي الْيَوْمِ الْوَاحِدِ

﴿عید کے دن جمعہ کی نماز ادا کرنے کا حکم﴾

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِي سُفْيَانَ، وَهُوَ يَسْأَلُ زَيْدَ بْنَ أَرْقَمَ قَالَ: شَهِدْتَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِيدَيْنِ اجْتَمَعَا فِي يَوْمٍ وَاحِدٍ؟ فَقَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ فَكَيْفَ صَنَعَ؟ قَالَ: صَلَّى ثُمَّ رَخَّصَ فِي الْجُمُعَةِ فَقَالَ: ''مَنْ شَاءَ أَنْ يُصَلِّيَ فَلْيُصَلِّ''. (شرح مشکل الآثار:۱۸۶/۳،

ح:۱۵۸۶، أبوداود: ح:۱۰۷۰، دارمی: ح:۲۲۵)

خلاصۃ الحدیث:

جمعہ کا دن ایام میں سب سے بہتر دن ہے، جمعہ کا دن امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، نیز ہفتہ کے تمام ایام میں صرف جمعہ کے نام سے ہی ایک سورۃ نازل ہوئی ہے، عیدین کی طرح جمعہ کا دن بھی مسلمانوں کے لئے ہفتہ کے اعتبار سے عید کا دن ہے، اور بعض حدیث میں تو جمعہ کے دن کو عیدین سے افضل قرار دیا ہے۔ ”ان یوم الجمعۃ خیر من یوم الفطر ویوم العید الاضحی“ عیدین کی طرح جمعہ کے دن بھی شکرانہ کے طور پر دو رکعت ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللهِ﴾ [الجمعۃ: ۹] گویا جمعہ کی نماز ادا کرنا واجب ہے؛ لیکن جمعہ کے دن عید الاضحیٰ یا عید الفطر آجائے (عید الاضحیٰ یا عید الفطر اور ہفتہ واری عید کا دن یعنی جمعہ) تو کیا عید کی نماز ادا کرنے کے بعد جمعہ کی ادائیگی واجب ہوگی؟ یا عید کی نماز پر اکتفاء کر کے جمعہ کے بدلے ظہر کی نماز پڑھ لینا کافی ہوگا؟ مذکورہ حدیث الباب میں اسی سوال کا جواب مذکور ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار دیا ہے، چاہے جمعہ کی نماز ادا کرے یا نہ کرے۔

عَنْ إِيَاسِ بْنِ أَبِي رَمْلَةَ الشَّامِيِّ، قَالَ: شَهِدْتُ مُعَاوِيَةَ سَأَلَ زَيْدَ بْنَ أَرْقَمَ: أَشَهِدْتَ عِيدَيْنِ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اجْتَمَعَا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَمَا صَنَعَ؟ قَالَ: ”صَلَّى الْعِيدَ وَرَخَّصَ فِي الْجُمُعَةِ مَنْ شَاءَ أَنْ يَجْلِسَ فَلْيَجْلِسْ“. (شرح مشکل الآثار: ۱۸۷/۳)

مذکورہ حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترک جمعہ کی رخصت دی ہے، حالانکہ دیگر احادیث میں تو ترک جمعہ پر وعید شدید سنائی ہے، مثلا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”من ترک الجمعۃ یوما واحدا لم تکن لہ کفّارۃ دون یوم القیامۃ۔“ (مصنف عبدالرزاق: ۱۶۷/۲) جس نے ایک دن نماز جمعہ ترک کی تو قیامت سے پہلے اس کے لئے کوئی کفارہ نہیں ہوگا، اسی طرح قرآن

کریم میں جمعہ کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللهِ﴾ [الجمعة: ۹] تو الغرض حدیث الباب کے خلاف آیت اللہ اور حدیث ہے تو دونوں میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی؟

فَسَأَلَ سَائِلٌ عَنِ الْمُرَادِ بِمَا فِي هَذَيْنِ الْحَدِيثَيْنِ بَعْدَ اسْتِعْظَامِهِ مَا فِيهِمَا مِنَ الرُّخْصَةِ فِي تَرْكِ الْجُمُعَةِ وَنَفَى ذَلِكَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَقَالَ: كَيْفَ يَكُونُ لِأَحَدٍ أَنْ يَتَخَلَّفَ عَنِ الْجُمُعَةِ مَعَ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [الجمعة: ۹] (شرح مشکل الآثار: ۱۸۷/۳)

جواب:

امام طحاویؒ نے اس اعتراض کا جواب اس طرح دیا ہے کہ ترک جمعہ کی رخصت ان دیہاتیوں کے لئے ہے جن پر جمعہ واجب نہیں، ورنہ شہریوں پر جمعہ ادا کرنا واجب ہے، جب کہ حضرت علیؓ کی روایت میں ہے "لا جمعة ولا تشريق إلّا في مصر من الامصار" لہذا ترک جمعہ کی رخصت دیہاتیوں کے حق میں ہے اور وعید والی حدیث کا حکم شہریوں کے حق میں ہے، چونکہ گاؤں والے حضرات عید کی نماز ادا کرنے کے لئے شہر میں آتے تھے، تو جمعہ تک انتظار کرنا ان کے لئے دشوار تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترک جمعہ کا اختیار دیا، اسی طرح حضرت عثمان بن عفانؓ نے بھی دیہاتیوں کو جمعہ میں اختیار دیا تھا، جب کہ ایک دن میں عیدین جمع ہو گئے تھے مثلاً فرمایا: "من أحب من أهل العالية أن ينتظر الجمعة فلينظرها، ومن أحب أن يرجع فليرجع فقد أذنت له" اور بھی متعدد احادیث سے یہ مضمون اخذ کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیدین کے اجتماع کے وقت دیہاتیوں کو جمعہ کی ادائیگی میں رخصت دی ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ وَعَوْنِهِ أَنَّ الْمُرَادِينَ بِالرُّخْصَةِ فِي تَرْكِ الْجُمُعَةِ فِي هَذَيْنِ الْحَدِيثَيْنِ هُمْ أَهْلُ الْعَوَالِي الَّذِينَ مَنَازِلُهُمْ خَارِجَةٌ عَنِ الْمَدِينَةِ مِمَّنْ لَيْسَتِ

الْجُمُعَةُ عَلَيْهِمْ وَاجِبَةٌ ؛ لِأَنَّهُمْ فِي غَيْرِ مِصْرٍ مِنَ الْأَمْصَارِ , وَالْجُمُعَةُ فَإِنَّمَا تَجِبُ عَلَى أَهْلِ الْأَمْصَارِ...... (شرح مشکل الآثار: ۱۸۸/۳-۱۸۷)

اقوال المحدثین:

حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ اپنے شیخ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تقریر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اتفاقاً ایک مرتبہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عید اور جمعہ ایک ہی دن میں جمع ہو گئے، اور دیہاتی حضرات صرف عیدین کیلئے ہی جمع ہوتے تھے، دوسری نمازوں کیلئے جمع نہیں ہوتے تھے، جیسا کہ آج بھی اکثر دیہات والوں کی یہی عادت ہے۔ اب اگر عید کی نماز سے فراغت کے بعد وہ جمعہ کا انتظار کرتے تو حرج لازم آتا، لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب صلاۃ العید سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منادی نے آواز لگائی: "من شاء منکم ان یصلی فلیصل ومن شاء الرجوع فلیرجع" جو شخص نماز پڑھنا چاہتا ہو تو وہ نماز پڑھے اور جو شخص واپس جانا چاہتا ہو وہ جا سکتا ہے۔ اور یہ خطاب صرف اہل قریہ کے لئے تھا، اور اس بات پر قرینہ یہ ہے کہ آپ نے حدیث مبارک میں "انا مجمعون" کا جملہ ارشاد فرمایا، اور یہاں جمع متکلم کے صیغہ سے اہل مدینہ مراد ہیں، تو یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان "من شاء منکم ان یصلی" صرف اہل قریہ کے لئے تھا، نہ کہ اہل مدینہ کے لئے۔

ثم اقول کتب الشیخ مولانا محمد یحیی المرحوم من تقریر شیخه حضرة الشیخ مولانا رشید أحمد الکنکوهی رحمه الله تعالیٰ . ما حاصله: أنه اتفق ذلك فی عهد النبی صلی الله علیه وآله وسلم بأنه وافق یوم الجمعة یوم عید، وکان أهل القری یجتمعون لصلاة العیدین مالا یجتمعون بغیرهما کما هو العادة فی أکثر أهل القری، فکان فی انتظارهم الجمعة بعد الفراغ من صلوة العید حرج علی أهل القری، فلما فرغ رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم من صلاة العید نادی منادی: من شاء منکم أن یصلی فلیصل ومن شاء الرجوع فلیرجع، وکان ذلك خطابا لاهل القری المجتمعین ثم، والقرینة علی ذلك بأنه قد صرح فیه بانا مجمعون، والمراد فیه

مِنْ جمعِ المتكلم أهل المدينة، فهذا يدل دلالةً واضحةً بأن الخطاب فى قوله "من شاء منكم أن يصلى" إلى أهل القرى لا إلى أهل المدينة. (بذل المجهود فى حل سنن ابى داود: کتاب الصلاة، باب اذا وافق يوم الجمعة بوم عيد، رقم الحديث: ۱۰۷۰، ج:۵، ص:۷۷، ۷۶، ط: مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث ہے جس کا مفہوم بالکل عام ہے اور بڑی عجیب حدیث ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں عید کی نماز میں رخصت دی ہے، یعنی عید کی نماز ادا کر کے جمعہ کو چھوڑنا چاہو تو چھوڑ سکتے ہو اور عید کی نماز کو چھوڑ کر جمعہ کے لے آنا چاہو تو آ سکتے ہو۔

فَقَالَ: فَقَدْ رَوَيْتُمْ أَيْضًا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا الْمَعْنَى حَدِيثًا هُوَ أَعْجَبُ مِنْ هَذَا-

- يَعْنِي مَا حَدَّثَنَا بِهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ دَاوُدَ الْبَغْدَادِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ عَبْدِ رَبِّهِ الْجُرْجُسِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ بْنُ الْوَلِيدِ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ مُغِيرَةَ، عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ رُفَيْعٍ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: اجْتَمَعَ عِيدَانِ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي يَوْمٍ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَيُّمَا شِئْتُمْ أَجْزَأَكُمْ" قَالَ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ رَدُّهُ الْمَشِيئَةَ إِلَيْهِمْ فِي الْإِتْيَانِ إِلَى صَلَاةِ الْعِيدِ وَتَرْكِ الْإِتْيَانِ لِمَا سِوَاهَا مِنْ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ أَوْ إِتْيَانِ الْجُمُعَةِ وَتَرْكِ مَا قَبْلَهَا مِنْ صَلَاةِ الْعِيدِ....الخ۔ (شرح مشکل الآثار: ۳/ ۱۹۱، ۱۹۰)

باب: ۱۸۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي السَّبَبِ الَّذِي مِنْ أَجْلِهِ قَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُودٍ مَا كَانَ بَيْنَ إِسْلَامِنَا وَبَيْنَ أَنْ عَاتَبَنَا اللهُ عَزَّ وَجَلَّ بِقَوْلِهِ: ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ﴾ [الحديد: ١٦] الْآيَةَ

﴿ فتح ونصرت کے بعد ذکر اللہ سے غفلت پر وعید ﴾

حَدَّثَنَا يُونُسُ بْنُ عَبْدِ الْأَعْلَى قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ وَهْبٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَمْرُو بْنُ الْحَارِثِ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي هِلَالٍ عَنْ عَوْنِ بْنِ عَبْدِ اللهِ يَعْنِي ابْنَ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ قَالَ: "مَا كَانَ بَيْنَ إِسْلَامِنَا وَبَيْنَ أَنْ عَاتَبَنَا اللهُ بِهَذِهِ الْآيَةِ: ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ﴾ [الحديد: ١٦] إِلَّا أَرْبَعُ سِنِينَ". (شرح مشکل الآثار: ۱۹۴/۳، ح:۱۱۵۷، مسلم: ص:۱۳۷۷، ح:۳۰۲۷، سنن ابن ماجه: ص: ٦٨١، ح:۴۱۹۲)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ اپنے نیک بندوں پر خصوصی انعام فرماتے ہیں، اور موقع بموقع انہیں آزمائش میں ڈال کر ان کا امتحان لیتے ہیں، پھر اگر ان میں کوئی کمی آتی ہے تو ان کی زجر وتوبیخ بھی کرتے ہیں، ایسا ہی ایک واقعہ عہد نبوی میں بھی پیش آیا کہ فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کی معاشی حالت بہت زیادہ خستہ تھی، بڑے فقر وفاقہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا، پھر جب مکہ فتح ہوا اور مسلمانوں کے قبضہ میں بہت سارا مال آیا اور ان سے فقر وفاقہ دور ہو گیا، تو نتیجۃً بعض صحابہ غفلت میں پڑنے لگے، اور ان کی مجلسوں میں کثرت سے ہنسی مذاق ہونے لگا، یہاں تک کہ وہ قرآن کریم سے نصیحت حاصل کرنے کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پچھلی قوموں کے واقعات اور قصے دریافت کرنے لگے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی تنبیہ کے لئے سورہ حدید کی آیت ١٦ نازل کی، صاحب کتاب یہاں اس باب کو قائم کر کے ان وجوہات کو واضح کرنا چاہتے ہیں جن کی بنا پر یہ آیت عتاب نازل ہوئی۔

اشکال:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مذکورہ روایت سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ آخر کس بنا پر اس

آیت میں اظہار ناراضگی کی گئی، اس کے وجوہات کیا ہیں؟

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَطَلَبْنَا السَّبَبَ الَّذِي مِنْ أَجْلِهِ عُوتِبُوا بِمَا فِي هَذِهِ الْآيَةِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۹۵/۳)

جواب:

فتح مکہ کے بعد جہاں اسلام میں شمولیت کی عمومی ہوا چلی، اور مسلمانوں کے مال و دولت میں فراوانی آئی، وہیں بعض مسلمانوں کے اعمال میں سستی آنے لگی، نتیجۃً یہ ہوا کہ قرآن کریم میں غور وفکر کرنے کے بجائے پچھلی قوموں کے واقعات سننے کی درخواست کرنے لگے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو قرآن کی طرف متوجہ کیا کہ پچھلی قوموں کے قصے اور واقعات کے بنسبت قرآن کریم کی آیات واحکام نصیحت حاصل کرنے کے لئے کافی ہیں، جیسا کہ امام طحاویؒ کی توجیہ سے یہ معنی واضح ہورہا ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ سُؤَالُهُمْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَصَصَ عَلَيْهِمْ، أَيْ: لِتَلِينَ بِذَلِكَ قُلُوبُهُمْ فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (یوسف:۳) فَأَعْلَمَهُمْ عَزَّ وَجَلَّ أَنَّهُ لَا حَاجَةَ بِهِمْ إِلَى الْقَصَصِ مَعَ الْقُرْآنِ؛ لِأَنَّهُ لَا يَقُصُّ عَلَيْهِمْ أَنْفَعَ لَهُمْ مِنْهُ، ثُمَّ سَأَلُوا أَنْ يُحَدِّثَهُمْ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ فِي ذَلِكَ مَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ مِنْ أَجْلِهِ مِمَّا ذُكِرَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ، وَكُلُّ ذَلِكَ يَرُدُّهُمْ إِلَى الْقُرْآنِ؛ لِأَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ إِلَى شَيْءٍ يَجِدُونَ فِيهِ الَّذِي يَجِدُونَ فِي الْقُرْآنِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۹۷/۳)

اقوال المحدثین:

(۱) امام ابومنصور ماتریدیؒ کا قول ہے کہ یہ آیت منافقین سے متعلق ہے جو بظاہر مسلمان تھے، لیکن ان کے دلوں میں کفر چھپا ہوا تھا۔

قال بعض اهل التأويل: إنها نزلت فی المنافقين الذين أظهروا الايمان وأضمروا

الکفر. (تأویلات أھل السنۃ، تفسیر ماتریدی، ج:۹، ص:۵۲۴)

(۲) امام رازیؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس آیت کے سلسلہ میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، اور بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت سے کامل مومن مراد ہے، البتہ ایمان کے درجات میں، بعض خشوع وخضوع میں اعلیٰ درجہ پر فائز ہوتے ہیں، تو بعض اس سے ادنی درجہ پر، اس لئے اس آیت سے وہ مؤمنین مراد ہیں جو پہلے بہت زیادہ خشوع وخضوع والے تھے؛ لیکن بعد میں ان کے اندر کمی آگئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسی بات کو نمایاں کیا ہے۔

اختلف فی قولہ (ألم یأن للذین آمنوا۔۔۔) فقال بعضھم نزل فی المنافقین الذی اظھروا الایمان وفی قلوبھم النفاق المباین للخشوع. وقال آخرون: بل المراد من ھو مؤمن علی الحقیقۃ، لکن المؤمن قدیکون لہ خشوع وخشیۃ، وقد لا یکون کذلک، فحثّوا علیہ بھذہ الآیۃ (وثانیھا) لعل قوما کان فیھم خشوع کثیر ثم زال منھم شدۃ ذلک الخشوع، فحثّوا علی المعاودۃ الیھا. (تفسیر رازی: ج:۱۵، ص:۲۳۰)

(۳) علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی رائے یہ ہے کہ جب صحابہ کثرت سے ہنسی مذاق کرنے لگے تو ان کی تنبیہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

(ألم یأن للذین آمنوا۔۔۔) نزلت فی شأن الصحابۃ لما أکثروا المزاح أن تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل بالتخفیف والتشدید من الحق. (جلالین: ص:۴۵)

(۴) صاحب معارف القرآن نے اس آیت کے شان نزول میں حضرت حذیفہؓ کی حدیث کو پیش کیا ہے، حضرت حذیفہؓ خود بیان کرتے ہیں: کہ ہمیں قدرت خداوندی کی طرف سے دو آزمائشوں میں آزمایا گیا، (ابتلینا بالضراء فصبرنا وابتلینا بالسراء فلم نصبر) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: مکان بین اسلامنا وبین ان عاتبنا اللہ بھذہ الآیہ (الم یأن

للذين آمنوا أن تخشع قلوبهم لذكر الله)، الا اربع سنين۔(صحیح مسلم)(معارف القرآن: ج:۷،ص: ۶۶۵)

باب: ۱۸۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْلِهِ فِي أَبِي مُوسَى: "لَقَدْ أُوتِيَ مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"

حضرت داوٗد علیہ السلام کی خصوصیت

۱۱۵۸ - حَدَّثَنَا بَكَّارُ بْنُ قُتَيْبَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ أَبِي الْوَزِيرِ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِرَاءَةَ أَبِي مُوسَى فَقَالَ: "لَقَدْ أُوتِيَ هَذَا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ". (شرح مشکل الآثار: ۱۹۸/۳، وأخرجه الطبری فی جامع البیان: ۹۷/۱۷، الدر المنثور: ۶۷۹/۵، خ-ح: ۵۰۴۸، م-۷۹۳، ت-۳۸۵۹، ن-۱۰۲۱)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر انسان کو کسی نہ کسی خوبی سے متصف فرمایا ہے، جس کی وجہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، حتی کہ صحابۂ کرام شرفِ صحابیت میں تو باہم شریک ہیں؛ لیکن ان میں بھی ایک کو دوسرے پر انفرادی خصوصیت کی وجہ سے امتیازی شان حاصل ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کو صدیق، حضرت عمرؓ کو فاروق، حضرت عثمانؓ کو صاحب الحیاء والوقار جیسے القاب سے موسوم کیا جاتا ہے، اسی طرح حضرت ابوموسی اشعریؓ کی شیریں آواز اور خوش الحان میں تلاوت قرآن کرنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو آلِ داود کی خوش الحانی کی نعمت سے مالا مال کیا گیا ہے، جیسا کہ اس باب کی پہلی حدیث میں ذکر ہے۔

سوال:

حضرت داوٗد علیہ السلام تنہا خوش الحان تھے، تو حضرت ابوموسیٰؓ کی خوش الحانی کی نسبت حضرت داوٗدؑ کی طرف کرنی چاہئے نہ کہ آلِ داوٗد کی طرف، سوال یہ ہے کہ آلِ داوٗد کی طرف کیوں نسبت کی گئی ہے؟

جواب:

چوں کہ حضرت داوٗدؑ کو خوش الحانی کی جو نعمت حاصل تھی، اس میں آپ منفرد تھے، البتہ ان کے ساتھ چرند، پرند اور پہاڑ بھی تسبیح بیان کرتے تھے، جیسا کہ قرآن کریم نے کہا: ﴿يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ﴾ [سبأ: ۱۰] ای سَبِّحِي، اس لئے ذکر اللہ اور تلاوتِ قرآن میں حضرت داوٗدؑ کی پیروی کرنے والوں کو آل داوٗد کہہ دیا، جس طرح حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنے والوں کو آلِ محمد کہتے ہیں "اللھُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ" اور فرعون کی پیروی کرنے والوں کو الِ فرعون کہتے ہیں ﴿أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (سورۂ غافر: ۴۶) اور فرعون کے ساتھ متبعین بھی عذاب کے مستحق ہوئے، اسی طرح حدیث الباب میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی خوش الحانی کی نسبت آل داوٗد کی طرف کی گئی ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللهِ وَعَوْنِهِ أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ ذَكَرَ دَاوُدَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي كِتَابِهِ فَقَالَ: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ﴾ إِلَى قَوْلِهِ جَلَّ وَعَزَّ: ﴿اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا﴾، فَكَانَ الَّذِي......

وَكَانَ التَّسْبِيحُ سَبَبُهُ دَاوُد عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَكَانَتْ تِلْكَ الْأَشْيَاءُ مَأْمُورَةً بِالتَّسْبِيحِ مَعَهُ كَانَ كُلُّ مُسَبِّحٍ مَعَهُ آلًا لَهُ، كَقَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ [غافر:46] فَسَمَّاهُمُ اللَّهُ: آلًا لَهُ، لِاتِّبَاعِهِمْ إِيَّاهُ وَلِعَمَلِهِمْ بِعَمَلِهِ حَتَّى...

فَمعقُول وَأَنَّ مَا أُضِيفَ مِنَ الْمَزَامِيرِ إِلَيْهِمْ مُضَافَةٌ إِلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَنَّ مَا رَوَيْنَا عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "لَقَدْ أُوتِيَ أَبُو مُوسَى مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ"... (شرح مشکل الآثار:۲۰۳/۳)

باب: ۱۸۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَنْبَغِي أَنْ يُفْعَلَ بِمَنْ رَأَى مِنْهُ مُنْكَرًا وَبِقَوْلِهِ فِي ذَلِكَ: "وَلَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا"

﴿ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے چھوڑنے پر وعید ﴾

عَنْ أَبِي مُوسَى، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كَانَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذَا عَمِلَ الْعَامِلُ مِنْهُمْ بِالْخَطِيئَةِ نَهَاهُمُ النَّاهِي تَعْزِيرًا، فَإِذَا كَانَ مِنَ الْغَدِ جَالَسَهُ وَآكَلَهُ وَشَارَبَهُ كَأَنَّهُ لَمْ يَرَهُ عَلَى خَطِيئَةٍ بِالْأَمْسِ، فَلَمَّا رَأَى اللّٰه عَزَّ وَجَلَّ ذَلِكَ مِنْهُمْ ضَرَبَ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ عَلَى بَعْضٍ، ثُمَّ لَعَنَهُمْ عَلَى لِسَانِ نَبِيِّهِمْ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ (صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِمَا وسلم)، ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ، وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذُنَّ عَلَى يَدَيِ السَّفِيهِ وَلَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا أَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ قُلُوبَ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ وَيَلْعَنَكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ". (شرح مشکل الآثار: ۲۰۵/۳، وأورده الهیثمی فی المجمع: ۲۶۹/۷، ورواه أحمد: ۳۹۱/۱،وأبوداود(۴۳۳۶) والترمذی:(۳۰۴۷)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام ایک عالمی اور آفاقی مذہب ہے،اس کے پانچ ارکان ہیں،کلمہ شہادت، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج،ان میں سے کسی کا انکار درست نہیں،اسی طرح شیطان کے بہکاوے میں آکر

ان کی ادائیگی میں سستی وکاہلی برتنا موجب فسق اور گناہ کبیرہ ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ارکان خمسہ کے علاوہ بھی کچھ اور امور ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے امت پر فرض قرار دیا ہے، گرچہ ان میں سے بعض فرض عین ہیں تو بعض فرض کفایہ؛ لیکن ثانی الذکر فرائض کے قبیل سے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' بھی ہے، جو نہ صرف اس امت پر فرض ہے؛ بلکہ اس کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے، چنانچہ حدیث الباب میں اسی فریضہ کی ادائیگی کی تاکید آئی ہے، اور بنی اسرائیل کی روش اختیار کرنے سے منع کیا ہے کہ انہوں نے اچھے کاموں کا حکم کرنا اور بُرے کاموں سے روکنے کو چھوڑ دیا تھا، یہاں تک کہ ان کے احباب اور ہم نشیں نے ان کی نافرمانیوں کو گناہ بھی نہیں سمجھا، تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ اور داودؑ کے ذریعہ لعنت بھیجی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو متنبہ کیا کہ لوگو! ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے فریضہ کو ادا کرتے رہنا اور ثابت قدم رہنا، ورنہ بنی اسرائیل کی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب کو دوسروں کے مشابہ کر دے گا، اور تم پر لعنت بھیجے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ میں اس بات کو واشگاف کیا ہے۔

﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ [مائدہ: ۷۸)

بنی اسرائیل کے جو لوگ کافر ہو گئے، ان پر حضرت داوٗد اور حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی زبان میں لعنت بھیجی گئی، یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی تھی، اور حد سے گزر گئے تھے، اسی طرح اس باب کی دوسری حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی ہے اس میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

''وَلَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الحَقِّ أَطْرًا'' کی وضاحت:

اہل لغت میں سے خلیل بن احمد فرماتے ہیں کہ ''اطرت الشیئ'' اس وقت استعمال کیا

جاتا ہے جب کسی کو چاروں سمت سے گھیر لیا جائے، جس کو اردو میں (فریم کرنا) کہتے ہیں، اور اسی طرح کسی شئ کو موڑ دیا جائے اس کو بھی ''اطرت الشیئ'' کہتے ہیں، مثلاً درانتی (ہاکی) وغیرہ؛ چونکہ ان کا سر مڑا ہوتا ہے، جب کے اہل لغت میں سے اصمعی فرماتے ہیں کہ ''اطرت الشیئ'' اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کہ کسی چیز کو اپنی طرف کھینچا جائے، مائل کیا جائے، اپنی طرف بلایا جائے، وغیرہ۔

الغرض مذکورہ دونوں اقوال سے حدیث کا مطلب یہ ظاہر ہوا کہ تم لوگوں کو حق بات کی طرف اس طرح مائل کرو اور متوجہ کرو کہ وہ عمل صالح سے باہر نہ نکل سکے، جس طرح فریم اور چوکھٹ میں موجود چیز بند ہو جاتی ہے، جب تک خود نہ نکالے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَتَأَمَّلْنَا قَوْلَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ "وَلَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا" فَوَجَدْنَا أَهْلَ اللُّغَةِ يَحْكُونَ فِي ذَلِكَ عَنِ الْخَلِيلِ بْنِ أَحْمَدَ أَنَّهُ قَالَ: يُقَالُ: أَطَرْتَ الشَّيْءَ إِذَا ثَنَيْتَهُ وَعَطَفْتَهُ، وَأَطْرُ كُلِّ شَيْءٍ عَطْفُهُ كَالْمِحْجَنِ وَالْمِنْجَلِ وَالصَّوْلَجَانِ وَوَجَدْنَاهُمْ يَحْكُونَ فِي ذَلِكَ عَنِ الْأَصْمَعِيِّ أَنَّهُ قَالَ: يُقَالُ: أَطَرْتُ الشَّيْءَ, وَأَصَرْتُهُ إِذَا أَمَلْتَهُ إِلَيْكَ وَرَدَدْتُهُ إِلَى حَاجَتِكَ فَكَانَ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنْ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَلَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا" أَيْ تَرُدُّونَهُ إِلَيْهِ وَتَعْطِفُونَهُ عَلَيْهِ وَتُمِيلُونَهُ إِلَيْهِ حَتَّى يَكُونَ فِيمَا تَفْعَلُونَهُ بِهِ مِنْ ذَلِكَ كَالْمِحْجَنِ وَالْمِنْجَلِ وَكَالصَّوْلَجَانِ الَّذِي لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يَخْرُجَ مِمَّا عُطِفَ عَلَيْهِ وَثُنِيَ عَلَيْهِ وَرُدَّ إِلَيْهِ إِلَى خِلَافِ ذَلِكَ أَبَدًا. وَاللّٰهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۰۷)

باب: ۱۸۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمُرَادِ بِقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ

وَجَلَّ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ [المائدة:۱۰۵]

فتنوں کے زمانے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم

۱۱۶۵ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ شَيْبَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ هَارُونَ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي خَالِدٍ، عَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: إِنَّكُمْ لَتَقْرَءُونَ هَذِهِ الْآيَةَ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ [المائدة: ۱۰۵] وَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوَا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَى يَدَيْهِ يُوشِكُ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللهُ بِعِقَابٍ". (شرح مشکل الآثار: ۲۰۸/۳، والترمذی:(۲۱۶۸)،وابن ماجه:(۴۰۰۵)،(ابوداود:ح:۴۳۳۹)

خلاصۃ الحدیث:

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو حضرت جبرئیلؑ کے واسطے سے آخری رسول حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر (۲۳) سال میں نازل ہوا، قرآن مجید آسمانی کتابوں میں منفرد کتاب ہے، جس میں زندگی صحیح طریقہ پر گزارنے کے لئے اصول وقوانین بیان کئے گئے ہیں، جن پر عمل کرنے میں نہ صرف زندگی میں سکون حاصل ہوتا ہے، بلکہ رضاء الٰہی اور دخولِ جنت کا پروانہ بھی حاصل ہوتا ہے، آسمانی کتابوں میں قرآن پاک ہی وہ کتاب ہے جو اپنے ماننے والوں کی من چاہی تحریفوں اور تبدیلیوں کا نشانہ نہیں بنی، اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن مجید کے صرف الفاظ ہی نہیں، بلکہ اس کے معانی اور تشریحات بھی محفوظ ہیں، یہ دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کے وعدۂ حفاظت کا فیض ہے، "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ". [الحجر:۹] اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم میں احکام کی تمام آیات محکم نہیں، بل کہ بعض واضح ہیں تو بعض مجمل،

بعض مؤول ہیں تو بعض مشترک، جن سے احکام کے استنباط میں اور معنی کی تفہیم میں تفسیر اور اصولِ تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی ذمہ داری دی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وظیفہ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی، چنانچہ امام طحاویؒ نے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ [المائدة: ۱۰۵] آیت کی مراد کو واضح کرنے کے لئے اس باب کو قائم کیا اور حدیث کی روشنی میں اس کی صحیح مراد کو واضح کیا، کہ فتنوں کے زمانہ میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، (تمہاری بات کو کوئی قبول نہیں کرے گا) تو ان کو ان کی حال پر چھوڑ دینا اور اپنی فکر میں لگ جانا، اپنے افعال کو درست کرلینا، اور ان کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

تعارض:

مذکورہ آیت کریمہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' واجب نہیں، جبکہ بہت سی احادیث میں بغیر عذر کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کرنے پر وعیدِ شدید سنائی گئی ہے، مثلاً حدیث الباب میں: "إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَى يَدَيْهِ يُوشِكُ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللهُ بِعِقَابٍ". (شرح مشکل الآثار: ۲۰۸/۳)

الغرض اس طور پر آیت مائدہ اور حدیث الباب میں تعارض واقع ہے؟

جواب:

امام طحاویؒ آیت کے صحیح مفہوم کو حدیث ثعلبہ سے واضح کرنا چاہتے ہیں، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا فریضہ انجام دیتے رہو، یہاں تک کہ اخیر زمانہ میں جب حرص وخودرائی، اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی جائے گی، دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جائے گی، اور ایسی بُرائی کا دور دورہ ہوگا کہ جبلتِ طبعی کی بنا پر بے اختیار اس برائی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہوگا، تو اس صورت میں عوام کو چھوڑ کر اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جانا، یہی

آیت کا صحیح مفہوم ہے، جو مذکورہ حدیث ثعلبہ ذیل میں ہے:۔

عَنْ أبي أمية قال: سَأَلْتُ أَبَا ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيَّ قُلْتُ: كَيْفَ تَصْنَعُ فِي هَذِهِ الْآيَةِ؟ قَالَ: أَيُّ آيَةٍ؟ قُلْتُ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ [المائدة: ١٠٥] فَقَالَ لِي: أَمَا وَاللهِ لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْهَا خَبِيرًا، سَأَلْتُ عَنْهَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "بَلِ ائْتَمِرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ، حَتَّى إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ، وَرَأَيْتَ أَمْرًا لَا بُدَّ لَكَ مِنْهُ فَعَلَيْكَ بِنَفْسِكَ، وَإِيَّاكَ وَأَمْرَ الْعَوَامِّ، فَإِنَّ مِنْ وَرَائِكُمْ أَيَّامَ الصَّبْرِ، صَبْرٌ فِيهِنَّ مِثْلُ قَبْضٍ عَلَى الْجَمْرِ، لِلْعَامِلِ مِنْكُمْ يَوْمَئِذٍ كَأَجْرِ خَمْسِينَ رَجُلًا يَعْمَلُونَ مِثْلَ عَمَلِهِ". (شرح مشكل الآثار: ۲۱۲/۳، ورواه ابن ماجه: ۴۰۱۴)

ہاں! اگر کوئی اس زمانۂ فتنہ کے آنے سے پہلے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' ترک کردے، تو وہ ان احادیث کا مصداق ہوگا جن میں وعید سنائی گئی ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِيمَا ذَكَرْنَا تَوْكِيدُ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ حَتَّى يَكُونَ الزَّمَانُ الَّذِي يَنْقَطِعُ ذَلِكَ فِيهِ، وَهُوَ الزَّمَانُ الَّذِي وَصَفَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَدِيثِ أَبِي ثَعْلَبَةَ الَّذِي لَا مَنْفَعَةَ فِيهِ بِأَمْرٍ بِمَعْرُوفٍ وَلَا بِنَهْيٍ عَنْ الْمُنْكَرِ، وَلَا قُوَّةَ مَعَ مَنْ يُنْكِرُهُ عَلَى الْقِيَامِ بِالْوَاجِبِ فِي ذَلِكَ فَسَقَطَ الْفَرْضُ عَنْهُ فِيهِ، وَيَرْجِعُ أَمْرُهُ فِيهِ إِلَى خَاصَّةِ نَفْسِهِ، وَلَا يَضُرُّهُ مَعَ ذَلِكَ مَنْ ضَلَّ.. (شرح مشكل الآثار: ۲۱۶/۳-۲۱۵، جلالين، سورۂ مائدہ، تحفة الاحوذی: ج:٦، ص:۳۲۴، بذل المجهود: ج:۱۲، ص:۳۵۹)

اقوال المفسرین:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضراتِ مفسرین نے مذکورہ آیت میں تاویل سے کام لیا ہے کہ "علیکم انفسکم" میں اپنی ذات کی اصلاح کرنے کا حکم دیا ہے اور دوسرے عوام الناس کی اصلاح کے تعلق سے فرمایا کہ بقدرِ طاقت ان میں محنت کرتے رہو، اور دین وایمان کی باتیں ان تک پہنچاتے رہو، اگر وہ راہِ راست پر نہ آئیں تو اس کی فکر میں نہ پڑو، اس لئے کہ

ہدایت دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ [البقرة: ۲۷۲] الغرض ﴿إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ [المائدة: ۱۰۵] میں واجبات شرعیہ کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے، جن میں جہاد اور ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' بھی داخل ہے، تو معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی نفی نہیں کی گئی ہے؛ بلکہ ان کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے حدیث الباب اور آیت کریمہ میں کوئی تعارض باقی نہیں رہے گا۔

وَأَمَّا مَنْ سِوَاهُمْ مِمَّنْ يَتَعَلَّقُ بِالتَّأْوِيلِ فَيَذْهَبُ إِلَى أَنَّ قَوْلَهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ﴾ [المائدة: ۱۰۵] لَيْسَ عَلَى سُقُوطِ مَفْرُوضٍ عَلَيْهِمْ مِنْ أَمْرٍ بِمَعْرُوفٍ وَمِنْ نَهْيٍ عَنْ مُنْكَرٍ، وَأَنَّهُمْ لَا يَكُونُونَ مُهْتَدِينَ إِذَا لَمْ يَفْعَلُوا ذَلِكَ، وَأَنَّهُمْ إِنَّمَا يَدْخُلُونَ فِي قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ ﴿إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ [المائدة: ۱۰۵] إِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ لَا إِذَا قَصَّرُوا عَنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲۱۶/۳، معارف القرآن: ج:۳، ص: ۲۵۱، بیان القرآن: ج: ۱، ص: ۵۱۹، تفسیر بحر محیط، سورۃ البقرۃ)

(۲) علامہ ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ آیت کا ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنے آباء واجداد کی تقلید کرتے تھے اور گمراہی کی حالت میں ان کے باپ دادا کا انتقال ہوگیا، تو قرآن نے آگاہ کیا اور یہ تعلیم دی کہ تمہارے اجداد کی گمراہی اور بددینی کی وجہ سے آپ حضرات پر کوئی عتاب نہیں ہوگا، اب تم اپنی ذات کی فکر میں لگ جاؤ اور واضح راہ کو اختیار کرلو، تمہارا ایمان اور ہدایت پر جمنا تمہاری نجات کے لئے کافی ہے، وللہ الحمد۔

شیخ شعیب الارنوطؒ فرماتے ہیں کہ دوسری تفسیر میرے نزدیک بہتر اور عمدہ ہے۔

قال ابن الجوزی:۔۔۔۔۔۔اعلمهم بهذه الأية ان المكلف انما يلزمه حكم نفسه وانه لا يضره ضلال من ضل اذا كان مهتديا۔۔۔۔واذا تلمحت هذه المناسبة بين الآيتين لم يكن للامر بالمعروف والنهى عن المنكر ههنا مدخل........(شرح مشکل الآثار: ۲۱۶/۳)

علامہ آلوسیؒ نے مذکورہ بالا تفسیر کے علاوہ اس آیت کے نزول کے مقاصد بیان کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ ہدایتِ انسانی کی تکمیل ''امر بالمعروف اور نہی عن المعروف'' پر موقوف ہے، اس پر قدرت کے باوجود اس کو ترک کرنا گمراہی کا سبب ہے۔

۲۔ وحی کے زمانہ کے بعد فسق و فجور کے عام ہونے کے وقت ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے فرائض کو ادا کرنے پر ثابت قدمی کی وجہ سے تسلی اور حوصلہ دیا گیا ہے۔

۳۔ اس آیت میں ان مومنین کو اپنے زمانے کے کفار، فساق اور گمراہ لوگوں کی ہلاکت پر افسوس کر کے اپنے آپ کو ضرر و تکلیف میں مبتلا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

۴۔ جب دنیا میں فساد عام ہو جائے، اس وقت مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنے کی گنجائش دی گئی ہے۔

۵۔ اس آیت میں مومنین کو اپنے ایمان پر ہر حال میں ثابت قدم رہنے کی ترغیب ہے، چاہے اس پر اس کو اور اس کے آباء واجداد کو لوگ بے وقوف اور سفیہ العقل سمجھیں، یا عقلمند، اس کی پرواہ نہ کرے، واجب عنه لوجوه: الأول: أن الإهتداء لا يتم الا بالامر بالمعروف والنهي عن المنكر، فإن ترك ذلك مع القدرة عليه ضلال.

والثاني: أن الآية تسلية لمن يأمر وينهي ولا يقبل منه عند غلبة الفسق وبعد عهد الوحي.

الثالث: انها للمنع عن هلاك النفس حسرة وأسفا على ما فيه الكفرة والفسقة من الضلال. فقد كان المومنون يتحرسون على الكفرة، ويتمنون ايمانهم، فنزلت.

الرابع: انها للرخصة في ترك الأمر والنهي اذا كان فيهما مفسدة.

والخامس: انها للأمر بالثبات علی الایمان من غیر مبالاۃ بنسبۃ الآباء الی السفہ، فقد قیل کان الرجل إذا أسلم قالوا له سفهت آباك نزلت . (ملخصاً من روح المعانی: ج: ۴/۴۴، مطبع: دار الکتب العلمیة بیروت، لبنان)

باب: ۱۸۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الزَّمَانِ الَّذِي يَجِبُ عَلَى النَّاسِ فِيهِ الْإِقْبَالُ عَلَى خَاصَّتِهِمْ وَتَرْكُ عَامَّتِهِمْ

﴿ فتنوں کے زمانے میں مومنین کا کردار ﴾

۱۱۷۶ - حَدَّثَنَا يُونُسُ بْنُ عَبْدِ الْأَعْلَى، قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ عُمَارَةَ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "كَيْفَ بِكُمْ وَبِزَمَانٍ. أَوْ قَالَ: - يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ زَمَانٌ - يُغَرْبَلُ النَّاسُ فِيهِ غَرْبَلَةً وَتَبْقَى حُثَالَةٌ مِنَ النَّاسِ قَدْ مَرِجَتْ عُهُودُهُمْ وَأَمَانَاتُهُمْ وَاخْتَلَفُوا فَصَارُوا هَكَذَا " وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ، قَالُوا: كَيْفَ بِنَا يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: " تَأْخُذُونَ بِمَا تَعْرِفُونَ وَتَذَرُونَ مَا تُنْكِرُونَ وَتُقْبِلُونَ عَلَى أَمْرِ خَاصَّتِكُمْ وَتَذَرُونَ أَمْرَ عَامَّتِكُمْ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۱۷، ورواہ الحاکم: ۴/۴۳۵، ورواہ احمد: ۲/۱۶۲)

خلاصۃ الحدیث:

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا دار الفتن ہے، ایک فتنہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا سر اٹھالیتا ہے، آنے والا ہر دن گزرے ہوئے ایام کے بنسبت زیادہ مشکلات اور مصیبتوں والا ہے، اپنے ہندوستان ہی کی حالت کو دیکھیں کہ کبھی NPR، NRC جیسے فتنے سے پریشان ہوئے، تو کبھی کرونا وائرس جیسی آسمانی وباء وبالِ جان بن گئی، الغرض آخرت کا یہ سفر آسمانی وباء اور

زمینی فتنوں سے گھرا ہوا ہے، ہمارے آقا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج سے ۱۴۰۰ سال قبل قیامت تک ظاہر ہونے والے فتنوں کی پیشنگوئی فرمادی اور ہر دور کے فتنوں سے نمٹنے کے لئے صحیح لائحہ عمل بتادیا ہے، جس کو اختیار کرنے سے انسان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے، اور صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکتا ہے، چنانچہ حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک فتنہ کی پیشنگوئی فرمائی ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس وقت قتل وغارت گری عام ہوجائے گی، صرف گھٹیا لوگ باقی رہ جائیں گے، جن کی اخلاقی وسماجی حیثیت اور دینی معاملات اس قدر خلط ملط اور الجھے ہوئے ہوں گے کہ امین وخائن اور نیک وبد کے درمیان تمیز کرنا ناممکن ہوجائے گا، ہمارے آقا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احسان ہے کہ آپ نے ایسے حالات میں زندگی گزارنے کا صحیح لائحہ عمل بتلادیا کہ اے لوگوں! ایسے ماحول میں اپنے نفس کی اصلاح اور اپنی اخروی بھلائی کے کاموں میں مشغول ہوجانا اور دوسروں کی دینی واصلاحی فکر میں نہ رہنا۔

اسی طرح امام طحاویؒ اس باب کے تحت متعدد احادیث کو جمع کرکے ماقبل باب سے ثابت ہونے والے حکم کی تائید کرنا چاہتے ہیں کہ قربِ قیامت میں جب فتنے نمودار ہونگے تو ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کو ترک کرکے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو طرزِ عمل بتلادیا ہے (اپنے گھر کو لازم پکڑنا، ایک روایت میں ہے کہ زبان کو قابو میں رکھنا وغیرہ) (سنن ابوداود: ۴۳۴۳) اس کو مضبوطی سے تھامے رہنا اور اسی طرز کو ذریعۂ نجات خیال کرنا، واللہ اعلم بالصواب۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فِي هَذِهِ الْآثَارِ تَشْدِيدُ مَا فِي الْآثَارِ الَّتِي فِي الْبَابِ الْأَوَّلِ، وَكُلُّهَا يُصَدِّقُ بَعْضُهَا بَعْضًا وَتُخْبِرُ أَنَّ الْأَزْمِنَةَ تَخْتَلِفُ وَتَتَبَايَنُ، وَأَنَّ كُلَّ زَمَانٍ مِنْهَا لَهُ حُكْمُهُ الَّذِي قَدْ بَيَّنَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأُمَّتِهِ وَأَعْلَمَهُمْ إِيَّاهُ وَعَلَّمَهُمْ بِمَا يَعْمَلُونَهُ فِيهِ، فَعَلَى النَّاسِ التَّمَسُّكُ بِذَلِكَ، وَلُزُومُهُ وَوَضْعُ كُلِّ أَمْرٍ مَوْضِعَهُ الَّذِي أَمَرَهُمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَضْعِهِ فِيهِ، وَأَنْ لَا يَخْرُجُوا عَنْ ذَلِكَ إِلَى مَا سِوَاهُ. وَاللهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۲۴)

باب: ۱۸۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: ”إِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِي طَرِيقٍ فَاجْعَلُوهُ سَبْعَةَ أَذْرُعٍ“

﴿مشترک زمین پر آمد و رفت کے لئے راستہ کا حکم﴾

۱۱۸۸ - حَدَّثَنَا فَهْدُ بْنُ سُلَيْمَانَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَعِيدٍ الْأَصْبَهَانِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا حُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ الْجُعْفِيُّ، عَنْ زَائِدَةَ، عَنْ سِمَاكٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”إِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِي طَرِيقٍ فَاجْعَلُوهُ سَبْعَةَ أَذْرُعٍ“. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۲۵، ح: ۱۱۸۸، ومسند احمد: ۲/۵۱۸، ح: ۲۰۹۸)

خلاصۃ الحدیث:

انسانی زندگی میں راستہ کا ایک اہم رول رہا ہے، راستہ انسان کو منزل مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ ہے، قرآن کی پہلی اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورہ (فاتحہ) میں بھی سیدھے راستہ کو انسان کی آرزو بتادیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راسطہ سے تکلیف دہ چیزوں کو دور کرنا صدقہ اور ایمان کا ادنی درجہ قرار دیا ہے، اسی اہمیت کے پیشِ نظر انسان جہاں بھی رہا ہے راستہ کی فکر اسے پہلے سے ہی دامن گیر رہی ہے، راستہ کی اس غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے یہ ہمیشہ ہی انسان کے لئے مرکز توجہ رہا ہے، اور انسان کے ساتھ ساتھ اس نے بھی ترقی کرلی ہے، یہاں تک کہ معاملہ گلیوں کوچوں سے بڑھ کر شاہ راہوں، ہائیویز (Highway) تک جا پہنچا ہے، اور موجودہ دور میں راستہ سے متعلق مستقل نظام وجود میں آچکا ہے، قانون کی لمبی چوڑی فہرست ہے، راستہ کی اہمیت کا یہ شعور جو انسانوں میں اب عام ہوا ہے، اسلام نے اس کی جانب بہت پہلے رہنمائی کی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی چوڑائی کم سے کم سات ذراع (یعنی سات گز) ذکر فرمائی ہے: (اذا اختلفتم فی طریق فاجعلواہ سبعة اذرع) صاحب

کتاب نے یہاں اس باب کو قائم کر کے راستہ سے متعلق احادیث کو جمع کیا ہے اور اس اہم معاملہ کو حل کر دیا ہے۔

الغرض، حدیث الباب سے متعلق امام طحاویؒ کا نظریہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مشترک زمین پر آمدورفت کے لئے راستہ بنانا چاہے، تو صرف سات گز میں راستہ بنانے کا حق ہوگا، اس سے زیادہ جگہ لینے کی گنجائش نہیں، اس کی نظیر بنجر زمین ہے جسے ملک کے ولی آب پاشی کے لئے کسی شہری شخص کو بخشش کرے تو وہاں آمدورفت کے لئے اسی مقدار (یعنی سات گز) میں راستہ بنانے کی اجازت دیتے ہیں، امام طحاویؒ نے اپنی اس عبارت سے اس کو واضح کیا ہے۔

. وَمِثْلُ ذَلِكَ أَيْضًا الْأَرْضُ الْمَوَاتُ يُقْطِعُهَا الْإِمَامُ رَجُلًا , وَيَجْعَلُ إِلَيْهِ إِحْيَاءَهَا وَدَفْعَ طَرِيقٍ مِنْهَا لِاجْتِيَازِ النَّاسِ فِيهِ مِنْهَا إِلَى مَا سِوَاهَا , فَيَكُونُ ذَلِكَ الطَّرِيقُ كَذَلِكَ سَعَتُهُ هَذَا الْمِقْدَارُ، وَلَمْ نَجِدْ لِهَذَا الْحَدِيثِ مَعْنًى هُوَ أَوْلَى بِهِ مِنْ هَذَيْنِ الْمَعْنَيَيْنِ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُمَا وَإِيَّاهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۲۸/۳)

باب: ۱۸٦

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "وَارْفَعُوا عَنْ بَطْنِ عُرَنَةَ" يَعْنِي فِي الْوُقُوفِ

﴿مقام عرفہ میں وقوف کا حکم﴾

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "عَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ، وَارْفَعُوا عَنْ بَطْنِ عُرَنَةَ، وَالْمُزْدَلِفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ، وَارْفَعُوا عَنْ بَطْنِ مُحَسِّرٍ، وَشِعَابُ مِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ". (شرح مشکل الآثار: ۲۲۹/۳، ومستدرك حاكم: ۴٦۲/۱، والبيهقي: ۱۱۵/۵، ابن خزيمة: (۲۸۱٦) والطبراني: (۱۱۰۰۱) والبزار: (۱۱۲۷)

خلاصۃ الحدیث:

حج ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے، جو صاحبِ استطاعت پر فرض ہے، اگر کوئی اس کا انکار کرے تو وہ مسلمان باقی نہیں رہے گا، حج ایک عاشقانہ عبادت ہے، کیونکہ حاجی کے ہر عمل سے خشوع وخضوع ظاہر ہوتا ہے، اور حج اس لحاظ سے بھی بڑی مہتم بالشان عبادت ہے کہ یہ بیک وقت روحانی، مالی اور بدنی تینوں پہلوؤں پر مشتمل ہے، حج کے بنیادی ارکان دو ہیں: (۱) وقوف عرفہ (۲) طواف زیارت؛ عرفات کے پورے میدان میں کہیں بھی وقوف کرنے سے وقوف کا فریضہ ادا ہوجائے گا، ہاں! مقام ''عرنہ'' میں ٹھہرنے سے حدیث میں منع کیا گیا ہے جو دراصل عرفہ کے میدان کا ایک حصہ ہے، اسی طرح حج میں ایک عمل وقوف مذدلفہ ہے، جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وادیٔ محسر کے علاوہ مزدلفہ کی تمام جگہ میں وقوف کرنا صحیح ہے۔

اسی طرح قربانی حج کے اعمال میں سے ایک اہم عمل ہے، جس کی ادائیگی کے لئے پورے منیٰ کے حدود کو مَنحرَ قرار دیا ہے، یعنی اس کے جس حصہ میں قربانی کی جائے گی، قربانی صحیح ہوجائے گی۔

توضیح:

امام طحاویؒ مذکورہ حدیث کے سندی اختلاف کو بیان فرمارہے ہیں، کہ سفیان بن عیینہ کے دوشاگردوں نے یہ روایت نقل کی ہے: (۱) ابوالاشعث (۲) عیسی بن ابراہیم، ابوالاشعث نے زیاد بن سعد کا واسطہ ذکر کیا ہے؛ جبکہ عیسیٰ بن ابراہیم کی سند میں واسطہ کا ذکر نہیں ہے، اس بنا پر امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ ابوالاشعث کی روایت کامل ومکمل ہے، اس لئے کہ وہ ''مزید فی متصل الاسانید'' کے قبیل سے ہے، لیکن روایت دونوں صحیح ہیں، اس لئے کہ عین ممکن ہے کہ ابن عیینہ نے ابی الزبیر کے واسطہ سے بھی سنا ہو اور بلاواسطہ بھی، اس لئے مسئلہ اظہر من الشّمس ہوگیا،

اور اب کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَلَمْ نَجِدْ هَذَا الْحَدِيثَ مِنْ رِوَايَةِ أَحَدٍ مِنْ أَصْحَابِ ابْنِ عُيَيْنَةَ فِي إِسْنَادِهِ أَتَمَّ مِنْهُ مِنْ رِوَايَةِ أَبِي الْأَشْعَثِ وَقَدْ حَدَّثَنَا عِيسَى بْنُ إِبْرَاهِيمَ الْغَافِقِيُّ بِهِ نَاقِصًا فِي إِسْنَادِهِ وَفِي مَتْنِهِ جَمِيعًا.

اسناده صحيح على شرط مسلم، ورواية ابن عيينة عن ابى الزبير بلا واسطة عند مسلم وغيره۔۔۔۔فهو على هذا من المزيد فى متصل الاسانيد. (شرح مشكل الآثار: ۲۳۰/۳ مع الحاشية)

سوال:

حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقام عُرَنہ میں وقوف سے جو منع فرمایا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ آیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وقوف عرفہ میں سے نہیں ہے، یا کوئی اور وجہ ہے؟ حالانکہ حضرت جابر اور حضرت علیؓ کی روایت میں مقام عُرنہ کو حدود عرفہ میں شامل کیا ہے؟

جیسے :

(۱) عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: وَقَفَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَفَةَ فَقَالَ: "هَذِهِ عَرَفَةُ وَهَذَا الْمَوْقِفُ وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ وَجُمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ". (شرح مشكل الآثار: ۲۳۱/۳)

(۲) عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ اللَّيْثِيِّ، أَنَّ عَطَاءَ بْنَ أَبِي رَبَاحٍ، حَدَّثَهُ أَنَّهُ، سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ، يُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: "كُلُّ عَرَفَةَ مَوْقِفٌ، وَكُلُّ الْمُزْدَلِفَةِ مَوْقِفٌ". (شرح مشكل الآثار: ۲۳۲/۳)

جواب:

چونکہ بطن عرنہ میں جنات رہتے تھے، ان کی طرف سے ضرر پہنچنے کا خدشہ تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں وقوف سے منع فرمایا تھا کہ ان کے شر سے محفوظ ہو جائے، پھر جب بعد میں انہوں نے اسلام قبول کرلیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں (بطن عرنہ) سے بھی گزرنے کا حکم دیا اور کہا کہ اب تمہارے بھائی جنات مسلمان ہو چکے ہیں، اس لئے اب ضرر پہنچے کا خدشہ باقی نہیں رہا۔

فَقَالَ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَجِيزُوا إِلَيْهِمْ فَإِنَّهُمْ إِنْ أَسْلَمُوا إِخْوَانُكُمْ" قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّهُمْ كَانُوا يَقِفُونَ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ بِبَطْنِ عُرَنَةَ خَوْفًا مِنْهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَنْ يَخْطَفَهُمُ الْجِنُّ وَأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُمْ أَنْ يُجِيزُوا إِلَيْهِمْ، أَيْ: مَا سِوَى بَطْنِ عُرَنَةَ مِنْ عَرَفَةَ، وَهِيَ الْمَوَاضِعُ الَّتِي كَانَتِ الْجِنُّ فِيهَا قَبْلَ ذَلِكَ، وَكَانُوا يَتَخَوَّفُونَ إِنْ وَقَفُوا بِهَا مِنْ غَوَائِلِهِمْ مَا كَانُوا يَتَخَوَّفُونَهُ، فَأَعْلَمَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُمْ إِخْوَانُهُمْ إِذْ قَدْ أَسْلَمُوا، وَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى أَنَّ أَمْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ بِذَلِكَ كَانَ بَعْدَ إِسْلَامِ الْجِنِّ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۳۴)

سوال:

ماقبل کی حدیث سے معلوم ہوا کہ جنات اسلام قبول کرنے سے پہلے حج کے دوران بطن عرنہ میں ٹھہرتے تھے، اس وقت ان کی طرف سے ضرر کا خوف تھا؛ لیکن ان کے اسلام لانے کے بعد وہ خوف ختم ہو گیا، اس لئے وہاں ٹھہرنے میں کوئی حرج نہیں (حالانکہ مقام عرنہ میں وقوف نہ کرنے کا حکم اب بھی باقی ہے) تو اب سوال یہ ہے کہ کیا جنات اسلام قبول کرنے سے پہلے حج کرتے تھے؟

وَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى أَنَّ أَمْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ بِذَلِكَ كَانَ بَعْدَ إِسْلَامِ الْجِنِّ. فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: أَفَيَجُوزُ أَنْ يَكُونَ الْجِنُّ كَانُوا قَبْلَ إِسْلَامِهِمْ يَحُجُّونَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۳۵/۳)

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح کفارِ مکہ اسلام قبول کرنے سے پہلے حج کرتے تھے، بعد میں قرآن کریم میں ان کو منع کر دیا کہ وہ ناپاک لوگ ہیں، مسجد حرام کے قریب نہ آئیں، ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا﴾ [التوبة:۲۸]

اسی طرح جنات کا اسلام قبول کرنے سے پہلے حج کرنا بھی ممکن ہے، اس میں کیا بعید بات ہے۔

قِيلَ لَهُ: وَمَا تُنْكِرُ مِنْ ذَلِكَ، قَدْ كَانَ كُفَّارُ الْآدَمِيِّينَ يَحُجُّونَ كَمَا يَحُجُّ الْمُسْلِمُونَ حَتَّى نَسَخَ اللّٰهُ ذَلِكَ بِقَوْلِهِ: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا﴾ [التوبة:۲۸] (شرح مشکل الآثار: ۲۳۵/۳)

اقوال المحدثین:

علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے بطنِ عُرَنہ میں وقوف کیا تو اس کا وقوف ہی نہیں ہوگا۔

واعلم أن ظاهر كلام القدوری والهداية وغيرهما فی قولهم مزدلفة كلها موقف إلّا وادی محسر، وكذا عرفة كلها موقف إلّا بطن عرنة أن المكانين ليسا مكان وقوف، فلو وقف فيهما لا يجزيه كما لو وقف فی منی سواء قلنا إن عرنة ومحسرا من عرفة ومزدلفة

اَوَّلاً. (فتح القدير: كتاب الحج، باب الاحرام، ۱۷۳/۲)

علامہ ابوبکر کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ وادی محسر میں وقوف کراہت کے ساتھ اداء ہوجائے گا، لیکن بطن عرنہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا، بظاہر ان کے خیال کے مطابق کہ بطنِ عرنہ میں بھی وقوف کراہت کے ساتھ ادا ہوجائے گا۔

اس لئے کہ انہوں نے وادی محسر میں وقوف کو مکروہ قرار دیا ہے، چنانچہ وہ رقم طراز ہیں: ''عرفات كلها موقف الا بطن عرنة ومزدلفة كلها موقف الا وادى محسر'' اور ''مزدلفة موقف وارتفعوا عن المحسر'' یعنی انہوں نے اس کو کراہت پر محمول کرکے وادی محسر میں وقوف کو مکروہ کہا ہے، پھر چونکہ اول الذکر روایت میں ''محسر'' کے ساتھ ساتھ ''عرنہ'' کا بھی ذکر ہے، اس لئے جو حکم محسر کا ہوگا وہی عرنہ کا ہوگا۔

وأما مكانه فجزء من أجزاء مزدلفة، أيّ جزء كان، وله أن ينزل فى أيّ موضع شاء منها، إلّا أنه لا ينبغى أن ينزل فى وادى محسر، لقول النبى ﷺ: ''عرفات كلها موقف الا بطن عرنة، ومزدلفة كلها موقف الا وادى محسر، وروي أنه قال مزدلفة كلها موقف وارتفعوا عن المحسر'' فيكره النزول فيه، ولو وقف به أجزأه مع الكراهة. (بدائع الصنائع: كتاب الحج، فصل فى الوقوف بمزدلفة، فصل، ج:۳۰، ص:۸۸-۸۹، ط: دار الكتب العلمية)

علامہ یوسف بنوریؒ کی توجیہ:

نیز حضرت مولانا یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں یہ لکھا ہے کہ اگر بطن عُرَنہ کا عرفات میں اور محسر کا مزدلفہ میں شامل ہونا ثابت ہوجائے تو امام مالک اور صاحب بدائع کا قول قوی ہونا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ قرآن کریم میں عرفات اور مشعر الحرام کے الفاظ آتے ہیں، ارشاد ربانی ہے: ﴿فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ

وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاس﴾ [البقرة: ۱۹۹] لہذا بطن عرنہ اور محسر میں وقوف کرنے سے مطلق قرآن پر عمل ہوگیا، البتہ اخبار آحاد کی وجہ سے کراہت باقی رہی، ہاں اگر یہ ثابت ہوجائے کہ عرنہ اور محسر بالترتیب عرفات اور مزدلفہ کا جزء ہی نہیں ہیں، تو پھر وہاں وقوف ہی درست نہ ہوگا، اور حدیث میں عرنہ کو عرفہ سے مستثنی کرنا جزئیت کی دلیل ہے، لان الاصل فی الإستثناء الاتصال۔ (درس ترمذی از مفتی تقی عثمانی: ۳/ ۱۴۴)

والفصل فيه: ان ثبت كون عرفة هو كون محسر من مزدلفة والمشعر الحرام صح الوقوف للعمل بالقاطع مع الكراهة لمخالفته اخبار الاحاد وإلا فلا. (معارف السنن، باب ماجاء ان عرفة كلها موقف: ج:٦، ص:٤٤٠)

باب: ۱۸۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الدَّلِيلِ عَلَى مُرَادِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ بِقَوْلِهِ: ﴿فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة:۱۹۸] الْآيَةَ

﴿حج کی تکمیل کے لیے وقوف عرفہ تمام حجاج کرام کے لئے لازم ہے﴾

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، فِي حَدِيثِهِ عَنْ حَجَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا صَلَّى الصُّبْحَ يَوْمَ عَرَفَةَ بِمِنًى مَكَثَ قَلِيلًا حَتَّى طَلَعَتِ الشَّمْسُ فَرَكِبَ وَأَمَرَ بِقُبَّةٍ مِنْ شَعْرٍ فَنُصِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ فَسَارَ، وَلَا تَشُكُّ قُرَيْشٌ إِلَّا أَنَّهُ وَاقِفٌ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ كَمَا كَانَتْ قُرَيْشٌ تَصْنَعُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، فَأَجَازَ حَتَّى أَتَى عَرَفَةَ، فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ فَنَزَلَ بِهَا حَتَّى إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ فَرَكِبَ حَتَّى إِذَا أَتَى بَطْنَ الْوَادِي فَخَطَبَ النَّاسَ ". (شرح مشكل الآثار: ۲۳۶/۳، ح:۱۲۰۱، ورواه ابن

حبان:(۱۴۵۷)و(۳۹۴۴)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن حج ہے، اور صاحب استطاعت حضرات پر زندگی میں ایک مرتبہ حج بیت اللہ کرنا فرض ہے، حج ایک عاشقانہ عبادت ہے، حج میں صفت عبدیت کا ظہور زیادہ ہوتا ہے، اس لئے حج ایک عظیم الشان عبادت ہے، حج کے بنیادی دو ارکان میں سے سب سے اہم رکن وقوف عرفہ ہے، اور دوسرا رکن طواف زیارت ہے، لہذا اگر اس میں کوتاہی ہوجائے، اور طواف نہ کرسکے تو اس پر دم واجب ہوتا ہے، لیکن اگر وقوف عرفہ رہ گیا تو تلافی کی کوئی صورت نہیں، اس لئے کہ وہ احرام کھولنے کے بعد حلال ہوجائے گا، اور آئندہ سال اس کی قضاء اس پر واجب ہوگی، اس لحاظ سے وقوف عرفہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے، وقوف عرفہ کی اتنی اہمیت کے باوجود زمانۂ جاہلیت میں قبیلۂ قریش میں جو خرابیاں تھیں، ان میں سے ایک خرابی یہ بھی تھی کہ وہ اور ان کے ہم خیال نویں ذی الحجہ کو عرفہ نہیں جاتے تھے، مزدلفہ میں رک جاتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اس خرابی کو ختم فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب آخری حج ۱۰ھ میں کیا، تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ آپ عرفات میں جائیں پھر وہاں وقوف کریں، پھر طواف زیارت کے لئے مکہ آجائیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزدلفہ کو چھوڑ کر پورے مجمع کے ساتھ میدان عرفات میں تشریف لے گئے جیسا کہ سورہ بقرہ آیت (۱۹۸) میں اور حدیث الباب میں اس سلسلہ میں وضاحت کی گئی ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ قُرَيْشًا كَانَتْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ تَقِفُ يَوْمَ عَرَفَةَ فِي خِلَافِ الْمَوْضِعِ الَّذِي يَقِفُ النَّاسُ بِهِ الْيَوْمَ بِعَرَفَةَ لِحَجِّهِمْ, وَذَلِكَ عِنْدَنَا وَاللَّهُ أَعْلَمُ; لِأَنَّ عَرَفَةَ لَيْسَتْ مِنَ الْحَرَمِ وَكَانَتْ قُرَيْشٌ لَا تُجَاوِزُ الْحَرَمَ وَلَا تَقِفُ لِحَجِّهَا فِي يَوْمِ عَرَفَةَ إِلَّا فِي مَوْضِعٍ مِنَ الْحَرَمِ، وَكَانَ الْمَوْضِعُ الَّذِي كَانَتْ تَقِفُهُ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ فِيهِ هُوَ الْمُزْدَلِفَةُ. (شرح

مشکل الآثار: ۲۳۷/۳)

اور امام طحاویؒ اس کی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ قریش مکہ مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور اس کے آگے نہیں جاتے تھے۔

(۱) حدیث اول: حضرت جبیر بن مطعمؓ کہتے ہیں کہ میرا اونٹ گم ہو گیا، میں عرفہ کے دن اس کو تلاش کرنے کے لئے نکلا، بس میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرفہ میں وقوف کرتے ہوئے دیکھا، میں نے دل میں سوچا بخدا! یہ تو حُمس میں سے ہیں، یہاں کیوں ہے؟ حُمس کے لغوی معنی ہیں، دین میں ٹھوس اور مضبوط ہونا، حدیث میں حُمس سے مراد قریش ہیں، اور قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم حُمس ہیں، ہم حرم سے تجاوز نہیں کرتے ہیں۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: "ذَهَبْتُ أَطْلُبُ بَعِيرًا لِي يَوْمَ عَرَفَةَ فَخَرَجْتُ، فَإِذَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاقِفٌ بِعَرَفَةَ بَيْنَ النَّاسِ، فَقُلْتُ: إِنَّ هٰذَا مِنَ الْحُمْسِ، فَمَا لَهُ خَرَجَ مِنَ الْحَرَمِ يَعْنِي بِالْحُمْسِ قُرَيْشًا وَكَانَتْ قُرَيْشٌ تَقِفُ بِالْمُزْدَلِفَةِ وَتَقُولُ: نَحْنُ الْحُمْسُ لَا نُجَاوِزُ الْحَرَمَ". (شرح مشکل الآثار: ۲۳۷/۳)

لفظ حُمس کی وضاحت:

حُمس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت عروہ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں حُمس کے علاوہ سب لوگ ننگے طواف کیا کرتے تھے، اور حُمس قریش اور ان کی اولاد تھی، اور حمس بنیت ثواب لوگوں کو کپڑے دیا کرتے تھے، مرد مردوں کو دیتے، وہ ان کو پہن کر طواف کرتے، اور عورتیں عورتوں کو دیتی تھیں، وہ ان میں طواف کرتی، اور جس کو حُمس کپڑے نہیں دیتے وہ ننگا طواف کرتے، اور سب لوگ عرفات سے لوٹتے اور حُمس مزدلفہ سے لوٹتے۔ (بخاری شریف، کتاب المناسک، باب الوقوف بعرفۃ: رقم الحدیث: ۱۶۶۵)

(۲) حدیث دوم: حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے ،اور وہ حُمس نام سے جانے جاتے ، اور باقی عرب عرفات میں وقوف کرتے ، پھر جب اسلام کا زمانہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ عرفات میں جائیں ، پھر وہاں سے طواف زیارت کے لئے لوٹیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: ﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾ [البقرة:۱۹۹]

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: "كَانَتْ قُرَيْشٌ تَقِفُ بِالْمُزْدَلِفَةِ وَتَسَمَّوا الْحُمْسَ , وَسَائِرُ الْعَرَبِ تَقِفُ بِعَرَفَةَ فَأَمَرَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ نَبِيَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَقِفَ بِعَرَفَةَ ثُمَّ يَدْفَعَ مِنْهَا وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾ [البقرة: ۱۹۹] ". (شرح مشکل الآثار: ۲۳۸/۳، ورواه البخاری: (۴۵۲۰)، ومسلم: (۱۲۱۹) و ابوداود:(۱۹۱۰) والبیہقی: (۱۱۳/۵) و البغوی: (۱۹۲۵)

خلاصۃ الکلام:

امام ابوجعفر طحاویؒ فرماتے ہیں: ماقبل میں ذکر کردہ دونوں حدیث اس بات پر دال ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمانۂ جاہلیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور توجہ وعنایت سے اسی جگہ پر وقوف فرماتے جہاں قریش کے علاوہ دوسرے لوگ وقوف کرتے تھے، انبیاء کرامؑ کی نبوت سے پہلے بھی نامناسب باتوں سے حفاظت کی جاتی تھی، مثلاً تعمیر کعبہ کے وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مناسب پتھر ملا حضرت عباسؓ نے آپ کی لنگی کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر پر رکھنے کی کوشش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہوکر گر پڑے، جب ہوش آیا تو لنگی بندھی ہوئی تھی، اسی طرح مکہ میں ایک تقریب میں آپ تشریف لے گئے، جاتے ہی سو گئے، جب ناچ گانا ختم ہوگیا، تب آپ کی آنکھ کھلی، اسی طرح مذکور حدیث میں جو واقعہ پیش آیا کہ قریش عرفہ نہیں جاتے تھے، مزدلفہ میں ہی رک جاتے تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کوئی سبب بنا اور آپ عرفہ تشریف لے گئے، بہر حال

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾ [البقرة: ۱۹۹]

اس بات کی واضح دلیل ہے کہ افاضہ (وقوف عرفہ) اس جگہ پر تھا جہاں لوگ قریش سے پہلے وقوف کیا کرتے تھے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَدَلَّ هَذَانِ الْحَدِيثَانِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ لِتَوْفِيقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ إِيَّاهُ وَلِتَوَلِّيهِ لَهُ قَدْ كَانَ يَقِفُ يَوْمَ عَرَفَةَ حَيْثُ يَقِفُ النَّاسُ سِوَى قُرَيْشٍ , وَكَانَ قَوْلُ اللّٰهِ جَلَّ وَعَزَّ: ﴿فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾ [البقرة: ۱۹۹] دَلِيلًا عَلَى أَنَّ الْإِفَاضَةَ مِنْ ذَلِكَ الْمَكَانِ قَدْ كَانَ مِنْهُمْ قَبْلَهَا وُقُوفٌ فِيهِ. وَقَدْ رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا الْمَعْنَى. (شرح مشکل الآثار: ۲۳۸/۳)

یہاں امام ابوجعفر طحاویؒ دو حدیثیں اس بات کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

دونوں حدیثوں کا خلاصہ درج ذیل ہیں:

(۱) حدیث اول: حضرت یزید بن شیبانؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت ہم حجۃ الوداع میں عرفات میں ٹھہرے ہوئے تھے تو ہمارے پاس ابن مربع انصاریؓ آئے، اور انہوں نے آ کر فرمایا کہ میں رسول اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ پیام لایا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم لوگ جس جگہ پر ٹھہرے ہوئے ہو وہیں ٹھہرے رہو، اس لئے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی میراث پر ہو، یعنی ان کے طریقہ پر ہو، اور تمہارا وقوف ان کی سنت کے مطابق ہے۔

عَنْ يَزِيدَ بْنِ شَيْبَانَ، قَالَ: أَتَانَا ابْنُ مِرْبَعٍ الْأَنْصَارِيُّ بِعَرَفَةَ وَنَحْنُ بِمَكَانٍ مِنَ الْمَوْقِفِ بَعِيدٍ، يُبَعِّدُهُ عَمْرٌو، فَقَالَ: أَنَا رَسُولُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْكُمْ يَقُولُ:

"كُونُوا عَلَى مَشَاعِرِكُمْ هَذِهِ، فَإِنَّكُمْ عَلَى إِرْثٍ مِنْ إِرْثِ إِبْرَاهِيمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ".

(شرح مشکل الآثار: ۲۳۸/۳، احمد ۱۳۷/۴، ابوداود (۱۹۱۹)، الترمذی (ح: ۸۱۱۳) النسائی: ۲۵۵/۵، ابن ماجه (ح: ۳۰۱۱) ابن خزیمة: (۲۸۱۲)

(۲) حدیث دوم: حضرت عبداللہ بن صفوانؓ اپنے ماموں سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم عرفہ میں جاتے وقوف میں ٹھہرتے تھے اور اس کے بعد مکمل حدیث ماقبل کی طرح بیان فرمائی۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ صَفْوَانَ، وَلَمْ يَذْكُرْ عَمْرًا عَنْ خَالٍ لَهُ، قَالَ: كُنَّا فِي مَوْقِفٍ لَنَا بِعَرَفَةَ ثُمَّ ذَكَرَ بَقِيَّةَ هَذَا الْحَدِيثِ. (شرح مشکل الآثار: ۲۳۹/۳)

امام ابوجعفر طحاویؒ ماقبل میں مذکور دونوں حدیثوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں اس بات پر دال ہیں کہ عرفہ مواقف ابراہیم میں سے ہے، جہاں لوگ آج حج کے موقع پر وقوف کرتے ہیں۔

سوال:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو محسّر سے آگے جانے کا کیوں حکم دیا جب کہ محسّر مزدلفہ میں سے ہے؟

جواب:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کو ارتفاع عن محسّر کا جو حکم دیا ہے، تو یہاں اس کا سبب کچھ اور ہے، اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ محسر مشاعر ابراہیم سے خارج ہو، اور اسی بناء پر لوگوں کو وہاں سے آگے جانے کا حکم فرمایا، اور مشاعر

ابراہیم کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرمایا، اللہ تعالیٰ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد کو زیادہ جاننے والے ہیں، وباللہ التوفیق۔

وَأَمَّا أَمْرُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ بِالِارْتِفَاعِ عَنْ مُحَسِّرٍ، وَمُحَسِّرٌ مِنْ مُزْدَلِفَةَ فَذَلِكَ لِمَعْنًى سِوَى هَذَا الْمَعْنَى قَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ لِخُرُوجِهِ عَنْ مَشَاعِرِ إِبْرَاهِيمَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَمَرَ النَّاسَ بِالرَّفْعِ عَنْهُ وَبِالرُّجُوعِ إِلَى مَشَاعِرِ إِبْرَاهِيمَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِهِ فِي ذَلِكَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ.

(شرح مشکل الآثار: ٣/٢٣٩)

ملا علی قاریؒ کی توضیح:

وادی محسّر :۔ وادی محسّر مزدلفہ اور منی کے درمیان ایک گھاٹی کا نام ہے، کہا جاتا ہے کہ اصحاب فیل یہیں عذاب خداوندی میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مشعر حرام (مزدلفہ) سے روانہ ہوئے، اور اس وادی میں پہنچے تو اپنی سواری کو تیز کردیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وادی کی مسافت کو تیزی سے گزار کر پورا کیا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جس جگہ کسی قوم پر عذاب نازل ہوا ہوتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازراہ عبرت اس جگہ سے تیزی سے گزر جاتے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حج کے موقع پر نصاری یا مشرکین عرب وادی محسّر میں ٹھہرا کرتے تھے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مخالفت کے پیش نظر اس وادی میں اپنی سواری کو تیزی سے چلا کر وہاں سے جلد گزر گئے، بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کے پیش نظر ہر شخص کے لئے مستحب ہے کہ اس وادی میں تیزی سے گزرے۔

المحسّر: بكسر السين المهملة المشددة، وهو ما بين مزدلفة ومنى۔۔۔۔ الى

قوله ولا يبعد ان يستحب الاسراع فيه لكل مار من حاج وغيره خاهبا وآيبالكونه محل نزول العذاب واللّٰه تعالىٰ اعلم بالصواب. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ح(٢٥٥٥))

باب: ١٨٨

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي تَأْوِيلِ قَوْلِ اللهِ جَلَّ وَعَزَّ: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ [الحجر:٨٧]

﴿سبع مثانی اور قرآن عظیم کا معنی اور مواد﴾

١٢٠٦ - حَدَّثَنَا بَكَّارُ بْنُ قُتَيْبَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو دَاوُدَ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: أَخْبَرَنِي خُبَيْبُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، قَالَ: سَمِعْتُ حَفْصَ بْنَ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يُحَدِّثُ عَنْ أَبِي سَعِيدِ بْنِ الْمُعَلَّى، أَنَّهُ كَانَ فِي الْمَسْجِدِ قَائِمًا يُصَلِّي، فَدَعَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا صَلَّى أَتَاهُ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا مَنَعَكَ أَنْ تُجِيبَنِي، أَمَا سَمِعْتَ اللهَ يَقُولُ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ﴾ [الأنفال:٢٤] الْآيَةَ, ثُمَّ قَالَ لِي: أَلَا أُعَلِّمُكَ سُورَةً أَعْظَمَ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ أَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ" فَمَشَيْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى كَادَ أَنْ يَبْلُغَ بَابَ الْمَسْجِدِ فَذَكَّرْتُهُ، قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيتُهُ". (شرح مشکل الآثار: ٢٤١/٣، والحاکم: ٣٧٠٣، نسائی: ح:٩١٣، د-ح:١٤٥٨، مہ-ح:٣٧٨٥)

خلاصۃ الحدیث:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یہ واحد ایسی کتاب ہے جو پوری انسانیت کے لئے رشد وہدایت کا ذریعہ ہے، قرآن مجید تمام پہلی کتابوں کی تعلیمات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، یہ

ایک بے مثال کتاب ہے،اس کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے؛لیکن قرآن کوفقط قرآن سے سمجھنا ناممکن ہے کیوں کہ قرآن پاک میں تمام آیات محکم نہیں ؛ بلکہ بعض مجمل ہیں تو بعض مشترک اور بعض مؤول اس لئے ان کی تشریح بغیر احادیث مبارکہ کے دشوار ہے، مثلاً صلوۃ ،زکوۃ ،تیمم ،حج اور عمرہ قرآن میں محض الفاظ کی صورت میں ان کوادا کرنے کا حکم دیا گیا، جن کی پوری تشریح احادیث میں ہے، الغرض قرآن کریم کے بیان کردہ اکثر الفاظ کی تشریح اور احکام کی تفصیل ہمیں اقوالِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ملتی ہے،اس لئے یہاں امام طحاویؒ نے اس باب میں سورہ حجر ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ [الحجر:۸۷] سے کیا مراد ہے؟ اس کو واضح کیا ہے، اس کے لئے انہوں نے حضرت ابوسعید بن المعلی ابوہریرہؓ کی سند سے دو احادیث کو جمع کیا ہے،اور سب کا خلاصہ یہ تحریر کیا ہے کہ سورہ فاتحہ وہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنْ كَلَامِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ. (شرح مشکل الآثار:۲۴۴/۳)

احادیث رسول سے ثابت کرنے کے بعد آثار صحابہ سے بھی واضح کیا ہے مثلاً حضرت ابن عباسؓ کی حدیث قلم بند کرنے کے بعد لکھا ہے کہ انہوں نے بھی ''السَّبْعُ الْمَثَانِي ''اور'' وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ '' سے سورہ فاتحہ ہی مراد لیا ہے، چنانچہ یہاں حدیث ابن عباسؓ بطور ثبوت کے پیش کی جارہی ہے:

عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ [الحجر:۸۷] قَالَ: وَقَرَأَهَا عَلَيَّ سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ... الْآيَةَ السَّابِعَةَ. (شرح مشکل الآثار:۲۴۵/۳)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنْ كَلَامِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ هِيَ

السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ. (شرح مشکل الآثار:۲۴۵/۳)

تعارض:

اس باب میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث دوطریق سے مروی ہے، ابراہیم بن مرزوق کے طریق کی حدیث میں "انها السبع المثانی"، "القرآن العظیم" ہے، یعنی سورہ فاتحہ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم دونوں کا حامل قرار دیا ہے، جب کہ حدیث بکار بن قتیبہ میں اس کے خلاف ہے، یعنی صرف سبع مثانی ہے "القرآن العظیم" مذکور نہیں ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي﴾ [الحجر:۸۷]، قَالَ: "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ". (شرح مشکل الآثار:۲۴۵/۳)

جمع وتطبیق:

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں بھی قول ابن عباس سے دونوں مراد ہیں، سبع مثانی سے سورہ فاتحہ اور قرآن عظیم سے قرآن پاک مراد ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ''والقرآن العظیم'' نصب کی حالت میں آیا ہے اور ''سبع مثانی'' پر عطف ہے، اس لئے حقیقت میں دونوں حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

فَاحْتُمِلَ أَنْ يَكُونَ مَعْنَى قَوْلِ ابْنِ عَبَّاسٍ ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي﴾ [الحجر:۸۷] فَاتِحَةَ الْكِتَابِ الْمُرَادَةَ بِأَنَّهَا السَّبْعُ الْمَثَانِي. وَأَنَّ مَعْنَى: وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ، أَيْ: وَآتَيْنَاكَ الْقُرْآنَ الْعَظِيمَ، وَالدَّلِيلُ عَلَى ذَلِكَ أَنَّهُ جَاءَ بِالنَّصْبِ وَلَمْ يَجِئْ بِالْخَفْضِ. (شرح مشکل الآثار:۲۴۵/۳)

سوال:

آیت مذکورہ میں ''السَّبْعُ الْمَثَانِي اور الْقُرْآنَ الْعَظِيمَ'' سے کیا مراد ہے؟

جواب:

اصل بات یہ ہے کہ اس آیت کے دو جزء ہیں، اور دونوں جز سے کیا مراد ہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کے کئی اقوال ہیں، امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت سعید بن المعلیؓ کی حدیث "فاتحة الكتاب هی السبع المثانی والقرآن العظيم الذی اوتيته" سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے پہلے جزء "سبعا من المثانی" سے سورہ فاتحہ مراد ہے اور یہی حضرت عمر، علی، ابن مسعود ابو ہریرہؓ حسن اور سعید بن جبیر کا قول ہے، اور سورۂ فاتحہ کو "مثانی" کہنے کی کئی وجہیں ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کی سات آیات ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے۔ (تفسیر خازن: ۴/۳۷، تفسیر مظہری سورۂ حجر: ص: ۳۱۳)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنْ كَلَامِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۴۴، جلالین شریف: ج ۲، سورہ حجر)

وهذا قول عمر وعلى وابن مسعود وابى هريره والحسن وسعيد بن جبير رضي الله عنهم وغيرهم. (تفسير خازن: ۴/۳۷، تفسير مظهری، سورۂ حجر: ص: ۳۱۲)

قرآن عظیم سے مراد:

مذکورہ آیت کے دوسرے جزء "الْقُرْآنَ الْعَظِيمَ" سے سورۂ فاتحہ کی فضیلت اور اس کے ثواب کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس کا ثواب پورا قرآن پڑھنے کے برابر ہے، جیسا کہ سورۂ اخلاص کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "يعدل ثلث القرآن" یعنی کہ اس کا ثواب تہائی قرآن پڑھنے کے برابر ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَاذا جاز ان يكونَ ذلك فی -- أَنَّهَا الْقُرْآنُ كُلُّهُ، أَيْ: فِي الثَّوَابِ بِهَا أَنَّهُ كَالثَّوَابِ بِالْقُرْآنِ كُلِّهِ، كَمَا قَدْ رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي: ﴿قُلْ هُوَ

اللهُ أَحَدٌ﴾ أَنَّ الثَّوَابَ بِهَا كَالثَّوَابِ بِثُلُثِ الْقُرْآنِ. وَأُطْلِقَ فِي بَعْضِ الْآثَارِ أَنَّهَا ثُلُثُ الْقُرْآنِ.
(شرح مشکل الآثار:۲۵۵/۳)

اس کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ سے کئی اقوال ہیں:

چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "سبعا من المثانی" سے سبع طوال (سورۂ بقرہ، سورۂ ال عمران، سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ انعام، سورۂ اعراف اور ساتویں سورۃ میں اختلاف ہے: (۱) سورۂ انفال مع البراءۃ (۲) سورۂ یونس یا سورۂ فاتحہ) مراد ہیں، اور سبع طوال سورتوں کو ''مثانی'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں فرائض، حدود اور اخبار وقصص کو بیان کیا گیا ہے، صاحب خازن فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت کے دوسرے جزء "والقرآن العظیم" سے مراد سات سورتوں کے علاوہ قرآن کا باقی ماندہ حصہ ہے، اور اس طرح بعض حصہ پر پورے قرآن کا لفظ استعمال کرنا قرآن سے ثابت ہے مثلاً قرآن نے کہا:

انا اوحینا الیك هذا القرآن ای سورۃ یوسف.

لیکن مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر غیر احسن ہے، اس لئے کہ سات سورتوں میں سے اکثر مدنی ہیں اور سورۂ فاتحہ کا نزول تو مکہ میں ہو چکا تھا تو "القرآن العظیم" سے فاتحہ کو مراد لینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

القول الثانی فی تفسیر قوله سبعا من المثانی انها السبع الطوال وهذا قول ابن عباس وغیرهم فی روایة .... قلت اذا عنی بالسبع المثانی فاتحة الکتاب او السبع الطوال فما وراءهن، ینطلق علیه القرآن. (تفسیر مظہری: سورۃ حجر: ص:۳۱۳، تفسیر خازن: ج:۴/ ص:۷۴)

امام طحاوی کی عبارت:

وَكَانَ الْأَوْلَى بِمَا رُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي ذَلِكَ لِمَا اخْتُلِفَ فِيهِ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ

عَنْهُ مَا رَوَاهُ مُجَاهِدٌ عَنْهُ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّهَا فَاتِحَةُ الْكِتَابِ. (شرح مشکل الآثار: ۳/ ۲۴۷)

واورد علی هذا القول ان هذه السور الطوال غالبها مدنیات فکیف یمکن تفسیر هذه الآیة بها وهی مکیة۔۔الخ۔۔(تفسیر خازن: ج:۴، ص:۷۳)

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ "سبعا من المثانی" سے پورا قرآن مراد ہے، اس کی دلیل ﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ ہے، اس قول کے مطابق پورے قرآن کریم کو ''سبع'' اس لئے کہا کہ اس میں سات منزلیں ہیں اور ''مثانی'' اس لئے کہا کہ اس میں اخبار، قصص اور امثال کو بیان کیا گیا ہے، اسی مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحب خازنؒ نے لکھا ہے کہ ''والقرآن العظیم'' سے قبل ''ھی'' محذوف ہے اور آیت مذکورہ اس طرح ہوگی "ولقد آتیناك سبعاً من المثانی وھی القرآن العظیم، المراد بالسبع سبعة اسباع القرآن".

القول الثالث ان السبع المثانی ھی القرآن کله وھذا قول طاوس...... کان المعنی ولقد أتیناك سبعاً من المثانی وھی القرآن العظیم، المراد بالسبع سبعة اسباع القرآن. (تفسیر خازن: ج ۴/ص:۷۴، تفسیر مظھری، سورہ حجر: ص:۳۱۴)

راجح قول:- صاحب صفوۃ التفاسیر علامہ محمد الصابونیؒ نے فرمایا کہ پہلا قول راجح ہے، جس کو امام طبریؒ نے اختیار کیا اور جس کی تخریج امام بخاریؒ نے کی ہے۔

الاول ارجح، اخرجه البخاری وھذا القول ھو اختیار الطبری. (صفوۃ التفاسیر: ج:۲، سورۃ حجر: ص:۱۱۵، بیروت دار القرآن الکریم)

اخیر میں امام طحاویؒ نے ''السَّبْعُ الْمَثَانِي اور الْقُرْآنَ الْعَظِيمَ'' سے مراد کو بطور تمثیل کے عیاں کیا ہے کہ جس طرح سورۂ اخلاص ثلث قرآن کے مساوی ہے ثواب میں، اسی طرح سورۂ

فاتحہ پورے قرآن کریم کے برابر ہے۔

لہذا سوررہ فاتحہ کی تلاوت کا ثواب پورے قرآن کی تلاوت کے مساوی ملے گا۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ مَعْنَى مَا فِي هَذِهِ الْأَحَادِيثِ مِنْ أَنَّ قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنَ هُوَ مَعْنَى الْأَحَادِيثِ الَّتِي رَوَيْنَاهَا قَبْلَهَا فِي قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ أَنَّهَا ثُلُثُ الْقُرْآنِ وَإِذَا جَازَ أَنْ يَكُونَ ذَلِكَ فِي قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ بِمَعْنَى أَنَّهَا فِي الثَّوَابِ كَثُلُثِ الْقُرْآنِ جَازَ فِي فَاتِحَةِ الْكِتَابِ أَيْضًا فِي الْآثَارِ الَّتِي رُوِيَتْ فِيهَا الَّتِي تَقَدَّمَ ذِكْرُنَا لَهَا فِي هَذَا الْبَابِ أَنَّهَا الْقُرْآنُ أَنْ يَكُونَ مَعْنَى ذَلِكَ أَنَّهَا فِي الثَّوَابِ بِهَا كَالثَّوَابِ بِالْقُرْآنِ كُلِّهِ. وَاللهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۵۵)

اقوال المحدثین:

(۱) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے سورۂ فاتحہ تلاوت کی، پھر یہ آیت پڑھی ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي﴾ [الحجر:۸۷] کہنے لگے یہ فاتحۃ الکتاب ہے، اور ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' ساتویں آیت ہے ،تابعین کی ایک جماعت سے بھی یہی منقول ہے، ابوجعفر رازی عن ربیع بن انس عن ابی العالیہ سے منقول ہے کہ سبع مثانی فاتحۃ الکتاب ہے؛ میں نے ربیع سے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد سبع طوال ہیں، تو انہوں نے کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت سبع طوال کی کوئی سورت نازل نہیں ہوئی تھی۔

علامہ طبریؒ نے خصیف عن زیاد بن ابی مریم سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے ''وانه، وبشر، وانذر، واضرب الامثال، واعدد النعم والأنباء'' ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ علامہ طبریؒ نے قول اول (اس سے مراد سورۃ الفاتحۃ ہے) کو ترجیح دی ہے، کیوں کہ یہ صحت کے

ساتھ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔

وباسناد حسن عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انہ قرأ الفاتحة ثم قال: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي﴾ [الحجر:۸۷] قال ھی فاتحة الکتاب .... وروی الطبری ایضا من طریق خضیف عن زیاد بن ابی مریم قال فی قولہ: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي﴾ [الحجر:۸۷] قال مر، وانہ، وبشر، وأنذر، واضرب الامثال، واعدد النعم والانباء، ورجح الطبری القول الاول لصحة الخبر فیہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. (فتح الباری: کتاب التفسیر، باب: وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي والقرآن العظیم، ۸/۴۴۴، رقم الحدیث: ۴۷۰۳، ۴۷۰۴)

(۲) صاحب مرقاۃ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ابن عمرؓ سے حسن سند کے ساتھ منقول ہے کہ "السبع المثانی" سے فاتحۃ الکتاب مراد ہے، جو نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہے۔

کما جاء عن ابن عمر رضی اللہ عنہ بسند حسن قال: "السبع المثانی" فاتحة الکتاب، تثنی فی کل رکعة. (مرقاۃ المفاتیح: کتاب فضائل القرآن، الفصل الاول: ۵/۱۶، رقم: ۲۱۱۸)

باب: ۱۸۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَمْرِهِ لِلنَّاسِ بِالِاقْتِدَاءِ بِأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَالِاهْتِدَاءِ بِهَدْيِ عَمَّارٍ وَالتَّمَسُّكِ بِعَهْدِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

﴿حضرت ابوبکر وعمر اور دیگر صحابہ کرامؓ کی اتباع کی ترغیب﴾

۱۲۲۴ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ مَرْوَانَ الرَّقِّيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا الْفِرْيَابِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ مولیٰ لربْعِيِّ بْنِ حِرَاشٍ، عَنْ رِبْعِيِّ بْنِ حِرَاشٍ قَالَ: حَدَّثَنِي مَنْ لَا أَتَّهِمُ يَعْنِي حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اقْتَدُوا بِاللَّذَيْنِ بَعْدِي أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَاهْتَدُوا بِهَدْيِ عَمَّارٍ وَتَمَسَّكُوا بِعَهْدِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ".

(سنن الترمذی(۸۳۵)رقم الحدیث:(۳۶۷۱)، شرح مشکل الآثار:۲۵۶/۳)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جس جماعت کو مقدس، محترم، ذی شان بنایا ہے، وہ ان عظیم ہستیوں کی جماعت ہے، جنہوں نے ایمان کی حالت میں امام الأنبیاء علیہ السلام کی زیارت کی اور ایمان پر ہی ان کا خاتمہ ہوا، اس جماعت کو حضرات صحابہ کرام کے مقدس لقب سے یاد کیا جاتا ہے، حضرات صحابہؓ کی افضلیت کی جانب قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں واضح اشارہ ملتا ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ [حجرات:۳]

نیز مسند احمد کی روایت ہے: اصحابی کالنجوم، بایھم اقتدیتھم اھتدیتھم (مسند احمد: ۲۴۱) چنانچہ صحابہ کی جماعت وہ پاکیزہ جماعت ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی بقاء کے لئے منتخب کیا تھا، اور ان حضرات نے بھی دین اسلام کی خاطر اپنی جان و مال سب کچھ قربان کر کے ایسی مثال قائم کی، جسے دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت مسلمہ کو ان حضرات کی اتباع کا حکم دیا ہے اور علماء اسلام نے ان کی راہ سے ہٹنے والوں کو گمراہ اور بددین قرار دیا ہے، جیسا کہ متعدد احادیث میں امت کو اتباع صحابہ کی تاکید کی گئی ہے، بالخصوص حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر وعمر اور دیگر صحابہ کرامؓ کی اتباع کا حکم دیا ہے، جس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

توضیح:

”اقْتَدُوا بِاللَّذَيْنِ بَعْدِي أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ“ اقتداء ابوبکر وعمر سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کی اتباع کی جائے، ہر چھوٹے بڑے کام کو ان کی مبارک زندگی سے

موازنہ کیا جائے، آیا انہوں نے ایسا کیا ہے یا نہیں، یا کہیں ان حضرات نے اس فعل کو ناپسند تو نہیں کیا، اگر اس طرح اپنے ہر عمل کو پرکھا جائے تو اقتداء کا حقیقی معنی بھی ادا ہو جائے گا، اور زندگی مکمل طور پر شریعت کے مطابق گزرے گی۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَتَأَمَّلْنَا هَذَا الْحَدِيثَ، فَكَانَ مَا فِيهِ مِمَّا أَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ بِالِاقْتِدَاءِ بِأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُما مَعْنَاهُ عِنْدَنَا, وَاللهُ أَعْلَمُ. (شرح مشكل الآثار: ۲۶۰/۳)

(۲) ''وَاهْتَدُوا بِهَدْيِ عَمَّارٍ'' اہتداء بہدی عمار سے مراد یہ ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ کے لئے جس راستہ کو اختیار کیا ہم بھی اسی راہ پر گامزن ہو کر اپنے رب سے تعلق مضبوط کریں، اور ان کی اقتداء کر کے اپنی دنیا و آخرت کو آراستہ کریں۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ ذَلِكَ الْهَدْيُ الْمَذْكُورُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنَ الْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ بِالْمَكَانِ الَّذِي هُوَ بِهِ مِنْ أَجْزَاءِ النُّبُوَّةِ. (شرح مشكل الآثار: ۲۶۲/۳)

(۳) ''وَتَمَسَّكُوا بِعَهْدِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ'' کا معنی یہ ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے دین اسلام قبول کر کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حق وصداقت کی راہ پر چلنے اور اس پر ہونے والے حملوں کا دفاع کرنے کا معاہدہ کیا اور آخری سانس تک اپنے معاہدہ پر قائم رہے، لہذا اس وقت کے مسلمانوں پر بھی ضروری ہے کہ ان کی اتباع کرتے رہیں اور اپنے رسول کے کئے ہوئے معاہدہ کو پورا کریں، واللہ الموفق۔

ثُمَّ تَأَمَّلْنَا قَوْلَهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "وَتَمَسَّكُوا بِعَهْدِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ" مَا الَّذِي أَرَادَهُ بِهِ، فَوَجَدْنَا اللهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ قَالَ فِي كِتَابِهِ: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾ [الأحزاب: ۲۳]، وَكَانَ ابْنُ أُمِّ

عَبْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْهُمْ، وَكَانَ مَعَ ذَلِكَ مِنَ الْهُدَى. (شرح مشکل الآثار: ۲۶۳/۳)

باب: ۱۹۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "لِكُلِّ عَمَلٍ شِرَّةٌ"

﴿تعلیمات اسلام اور راہ اعتدال﴾

۱۲۳۶ - حَدَّثَنَا أَبُو أُمَيَّةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُرَيْجُ بْنُ النُّعْمَانِ الْجَوْهَرِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا حُصَيْنٌ، عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِنَّ لِكُلِّ عَمَلٍ شِرَّةً، وَلِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةٌ فَإِمَّا إِلَى سُنَّةٍ وَإِمَّا إِلَى بِدْعَةٍ، فَمَنْ كَانَتْ فَتْرَتُهُ إِلَى سُنَّتِي فَقَدِ اهْتَدَى، وَمَنْ كَانَتْ فَتْرَتُهُ إِلَى غَيْرِ ذَلِكَ فَقَدْ هَلَكَ". (شرح مشکل الآثار: ۲۶۶/۳، ومسند احمد جدید: ج:۶، ص:۲۰۰)

خلاصۃ الحدیث:

دین اسلام ایک ایسا پاکیزہ اور کامل ومکمل مذہب ہے جو زندگی کے تمام گوشوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، اور دینی ودنیوی تمام معاملات میں اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیتا ہے، اسی طرح انسانی صفات میں بھی اعتدال پسندیدہ ہے، اور افراط وتفریط نقصان دہ ہے، مثلاً غضب انسان کی فطری صفت ہے، اگر اس میں افراط ہو تو انسان بے رحم اور منتقم مزاج بن جاتا ہے اور اگر تفریط ہو تو انسان بزدل بن جاتا ہے؛ لیکن اگر اس میں توازن ہو تو شجاعت جیسی قابل تعریف صفت سے متصف ہو جاتا ہے، اسی طرح اللہ نے جو دنیا کا نظام بنایا ہے اور جن بے شمار نعمتوں سے بنی آدم کو نوازا ہے ان میں بھی اعتدال ہے، مثلاً ہوا، اگر اس کی کثرت ہو جائے تو طوفان اور

آندھیوں کی صورت میں کتنے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اگر ہوا بالکل نہ ہو تو بھی دم گھٹنے سے موت واقع ہوجانے کا اندیشہ رہتا ہے وغیرہ؛ چنانچہ مذکورہ حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبادات میں اعتدال کا لحاظ رکھنے کی طرف اشارہ فرمایا کہ عبادات میں اللہ کو وہ طریقہ محبوب ہے جو میرا ہے (اعتدال والا طریقہ) اور کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے علاوہ دوسروں کے طریقے (افراط وتفریط والا طریقہ) کو اپنائیگا وہ کامیاب لوگوں میں نہیں ہوگا۔

توضیح: (۱)

امام طحاویؒ مذکورہ باب کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں کہ بندہ یہ خیال کرتا ہے کہ اعمال میں حد درجہ زیادتی سختی اور غلو سے ہی اللہ کا تقرب نصیب ہوگا یہ خیال صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو تو وہ عمل پسند ہے جس میں اعتدال کے ساتھ استقامت بھی ہو، چاہے عمل تھوڑا ہو، الغرض ذخیرۂ احادیث میں کئی ایسی مثالیں ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے افراط وتفریط کو ناپسند فرمایا ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَوَقَفْنَا بِذَلِكَ عَلَى أَنَّهَا هِيَ الْحِدَّةُ فِي الْأُمُورِ الَّتِي يُرِيدُهَا الْمُسْلِمُونَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ فِي أَعْمَالِهِمُ الَّتِي يَتَقَرَّبُونَ بِهَا إِلَى رَبِّهِمْ عَزَّ وَجَلَّ ، وَأَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبَّ مِنْهُمْ فِيهَا مَا دُونَ الْحِدَّةِ الَّتِي لَا بُدَّ لَهُمْ مِنَ التَّقْصِيرِ عَنْهَا وَالْخُرُوجِ مِنْهَا إِلَى غَيْرِهَا ، وَأَمَرَهُمْ بِالتَّمَسُّكِ مِنَ الْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ بِمَا قَدْ يَجُوزُ دَوَامُهُمْ عَلَيْهِ ، وَلُزُومُهُمْ إِيَّاهُ حَتَّى يَلْقَوْا رَبَّهُمْ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ ، وَرُوِيَ عَنْهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي كَشْفِ ذَلِكَ الْمَعْنَى أَنَّهُ : "أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ" وَقَدْ ذَكَرْنَا ذَلِكَ ، وَمَا قَدْ رُوِيَ فِي غَيْرِ هَذَا الْمَوْضِعِ مِمَّا قَدْ تَقَدَّمَ مِنَّا فِي كِتَابِنَا هَذَا فَغَنِينَا بِذَلِكَ عَنْ إِعَادَتِهِ ، وَاللَّهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۷۱/۳)

توضیح:(۲)

شیخ شعیب ارناؤوط مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بندہ جب کسی عمل کا افتتاح کرتا ہے تو شروع میں شوق ورغبت کی وجہ سے اس عمل میں اتنا مشغول ہوجاتا ہے کہ حقوق العباد کو بھول جاتا ہے، لیکن کچھ دنوں کے بعد اس عمل میں فتور آجاتا ہے، چنانچہ حدیث میں فرمایا ہے کہ اس فتور کے وقت اس عمل کو بالکل ترک کردینا پسندیدہ نہیں، ورنہ وہ بندہ ناکام ہوجاتا ہے، ہاں! اگر فتور کے زمانہ میں کوئی شخص درمیانی راہ اپنالے (نہ عبادت میں اتنا مشغول ہو کہ دنیوی تقاضوں کو ضائع کردے اور نہ اتنی سستی کرے کہ فرائض کو بھی ترک کردے، بلکہ عبادت کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی ادا کرتا رہے) تو ایسا شخص کامیاب ہے۔

العابد يبالغ في عبادته أول الأمر۔۔۔وكل مبالغ فلا بد أن تنكسر همته فمنهم من رجع حين الفتور إلى الا عتدال ويترك الإفراط فهذا مهتد، ومنهم من يرجع من الفتور الى ترك العبادة بالكلية فهذا هالك. (الموسوعة الحديثية لمسند أحمد بن حنبل علیہ الرحمہ :ج۱۱،ص:۱۱)

باب: ۱۹۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ:

"الْمُسْلِمُونَ تَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ وَيَسْعَى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ وَهُمْ يَدٌ عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ، لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَلَا ذُو عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ"

﴿ذمی کے لیے کسی بھی مسلمان کا امان دینا تمام مسلمانوں پر واجب التسلیم ہے﴾

۱۲۴۳ - حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ هِشَامُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ قُرَّةَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ حُمَيْدِ بْنِ أَبِي

خَلِيفَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو جَعْفَرٍ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ سَلَامَةَ الْأَزْدِيِّ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ أَبِي دَاوُدَ، قَالَ: ثَنَا مُسَدَّدُ بْنُ مُسَرْهَدٍ، قَالَ: ثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي عَرُوبَةَ، قَالَ: ثَنَا قَتَادَةُ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ قَيْسِ بْنِ عَبَّادٍ، قَالَ: انْطَلَقْتُ أَنَا وَالْأَشْتَرُ، إِلَى عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقُلْنَا: هَلْ عَهِدَ إِلَيْكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهْدًا لَمْ يَعْهَدْهُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً؟ قَالَ: لَا إِلَّا مَا كَانَ فِي كِتَابِي هَذَا، فَأَخْرَجَ كِتَابًا مِنْ قِرَابِ سَيْفِهِ فَإِذَا فِيهِ: " الْمُؤْمِنُونَ تَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ وَيَسْعَى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ، وَهُمْ يَدٌ عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ، لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَلَا ذُو عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ، وَمَنْ أَحْدَثَ حَدَثًا فَعَلَى نَفْسِهِ، وَمَنْ أَحْدَثَ حَدَثًا أَوْ آوَى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ". (شرح مشکل الآثار: ۲۷۲/۳، ح: ۱۲۴۳، رواه النسائی: ۲۴/۸) رواه أحمد: (۱۲۲/۱)

خلاصۃ الحدیث:

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسلام امن عالم کا داعی ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنے ماننے والوں کو قدم قدم پر تحمل و برداشت، اور اعتدال وتوازن کی تلقین کرتا ہے، اسلام میں ایک مسلمان کے جسم وجان اور عزت وآبرو کی قدر و قیمت اور حرمت وتقدس کس قدر ہے؟ یہ جاننے کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان پر غور کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طواف کی حالت میں کعبۃ اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، اے کعبہ! تو کتنا عمدہ ہے؟ اور تیری خوشبو کتنی پیاری ہے، تو کتنا عظیم المرتبت ہے، اور تیری حرمت کتنی زیادہ ہے؟ تیری ان تمام عظمتوں کے باوجود قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان ہے: مومن کی جان ومال کی حرمت اللہ کے نزدیک تیری حرمت سے بھی زیادہ ہے، اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان شخص کے قتل کے مقابلہ میں پوری دنیا کا ناپید ہوجانا کم نقصان دہ ہے۔

چنانچہ حدیث الباب میں اس بات (مسلمان کے خون کی قدر و قیمت) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا خون دیت اور قصاص کے معاملہ میں بھی برابر ہے، کوئی کسی سے افضل نہیں، نہ نسب کی بنیاد پر، نہ رنگ ونسل کی بنیاد پر، اور نہ ہی مسلک کی بنیاد پر، سارے لوگ اس حق اور واجب کے سامنے برابر ہیں، اس حدیث میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ کسی ایک مسلمان نے کسی کافر کو امان دے دی تو اس کا دیا ہوا امان سارے مسلمانوں کے لئے واجب التسلیم ہوگا، اس لئے اس کا احترام ضروری ہے، اور اس کے عہد کی خلاف ورزی جائز نہیں۔

ساتھ ہی اس بات کا بھی ذکر ہے کہ کسی سریّہ کو لشکر کی قوت کی بناء پر جو مال غنیمت حاصل ہو وہ اس سریّہ میں شامل لوگوں کو بھی ملے گا، اور فوج کے ان لوگوں کو بھی جو وہاں سے دور موجود ہوں، کیوں کہ یہ مال غنیمت فوج کی طاقت کی بناء پر حاصل ہوا ہے اور بیت المال میں جو مال آئے وہ یکساں طور پر قریب کے فوجیوں کے لئے بھی ہے اور دور کے فوجیوں کے لئے بھی، اگرچہ اسے حاصل کرنے میں قریب کے فوجیوں کی ہی تگ و دو شامل ہو۔

توضیح:

امام ابوجعفر طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اہل علم حضرات کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تمام مسلمان قصاص و دیات میں برابر سرابر ہیں، اور اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ اس مسئلہ میں شریف و کم درجہ شخص دونوں برابر ہیں، کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے، اس میں درحقیقت زمانۂ جاہلیت والوں پر رد ہے کہ وہ لوگ کم درجہ شخص کے بدلہ میں شریف آدمی کو قتل (قصاصاً) نہیں کرتے تھے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَتَأَمَّلْنَا قَوْلَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الْمُؤْمِنُونَ تَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ فَوَجَدْنَا أَهْلَ الْعِلْمِ جَمِيعًا لَا يَخْتَلِفُونَ فِي تَأْوِيلِ ذٰلِكَ أَنَّهُ عَلَى التَّسَاوِي فِي

الْقِصَاصِ وَالدِّيَاتِ, وَأَنَّ ذَلِكَ يَنْفِي أَنْ يَكُونَ لِشَرِيفٍ عَلَى وَضِيعٍ فَضْلٌ فِي ذَلِكَ, وَأَنَّ ذَلِكَ كَانَ رَدًّا عَلَى أَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ فِي تَرْكِهِمْ قَتْلَ الشَّرِيفِ بِقَتْلِهِ الْوَضِيعَ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۷۳)

مرد کو عورت کے بدلہ (قصاصاً) قتل کیا جائے گا؟

امام ابوجعفر طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ہمیں یہ بات سمجھ میں آئی کہ عورتیں حدود و قصاص کے جاری ہونے میں مرد کے برابر ہیں، یعنی مرد کو عورت کے بدلہ قتل کیا جائے گا جیسا کہ عورت کو مرد کے بدلہ قتل کیا جاتا ہے۔

وَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ عَقَلْنَا بِهِ أَنَّ النِّسَاءَ فِي جَرْيِ ذَلِكَ كَالرَّجُلِ, وَأَنَّ الرَّجُلَ يُقْتَلُ بِالْمَرْأَةِ كَمَا تُقْتَلُ الْمَرْأَةُ بِالرَّجُلِ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۷۴)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد ''یسعی بذمتھم ادناھم'' میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں میں سے کوئی شخص کسی دشمن کو امان دے دے، تو اس کا دیا ہوا امان سارے مسلمانوں پر واجب التسلیم ہے، ان کے لئے اس عہد (امان) کو توڑنا جائز نہیں۔

جیسا کہ حدیث ام سلمہؓ اس پر دال ہے کہ جب مسلمانوں نے حضرت ابوالعاصؓ زوج زینب کو قیدی بنایا تو حضرت زینبؓ نے کہا، میں نے ابوالعاص کو امان دی ہے، یہ سن کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے بھی اسے امان دے دی اور فرمایا مسلمانوں میں سے ادنی شخص بھی کسی کو امان دے سکتا ہے۔

امام ابوجعفر طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ دلیل ہے اس بات پر کہ مسلمانوں میں سے کسی

ایک کا امان دینا تمام مسلمانوں کے امان دینے کے مترادف ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ''وانه يجير على المسلمين ادناهم'' میں دونوں باتوں کا احتمال ہے ''ادناھم'' سے عورت بھی مراد ہوسکتی ہے اور غلام بھی، اور جب غلام کا امان دینا جائز ہے تو ایک آزاد مسلمان عورت کا امان دینا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسلمانوں کو خطاب کرنا "فقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: قد اجرنا، وقال: يجير على المساعين ادناهم" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب مسلمان غلام کی طرف سے یہ درست ہے تو ایک مسلمان آزاد عورت کی طرف سے بدرجہ اولیٰ لائق ہے کہ اس کا امان بھی جائز وقبول ہو۔

ثُمَّ تَأَمَّلْنَا قَوْلَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " يَسْعَى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ " فَوَجَدْنَا الذِّمَّةَ الْمُرَادَةَ فِي هَذَا الْمَوْضِعِ نَفْيَ الْأَمَانِ، وَأَنَّهُ إِذَا أَعْطَى الرَّجُلُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ الْعَدُوَّ أَمَانًا جَازَ ذَلِكَ عَلَى جَمِيعِ الْمُسْلِمِينَ لَيْسَ لَهُمْ أَنْ يَخْفِرُوهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲۷۴/۳)

مسلم کو ذمی کے بدلہ قصاصاً قتل کیا جائے گا یا نہیں اس میں مذاہب ائمہ:

اس سلسلہ میں علماء کی دو جماعتیں ہوگئی ہیں:

(۱)　علماء کی ایک جماعت جن میں امام ابوحنیفہؒ، ابویوسفؒ اور محمد بن الحسنؒ شامل ہیں، ان کا قول یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی کافر ذمی کو عمداً قتل کردے تو اس کے بدلہ میں اسے قتل کیا جائے گا، اور مذکورہ عبارت یعنی ''لا يقتل مومن بكافر ولا ذو عهد فى عهده'' میں تقدیم وتاخیر ہے، اصل عبارت اس طرح ہے ''لا يقتل مومن ولا ذو عهد فى عهده بكافر''؛ لہذا یہاں کافر سے مراد کافر حربی ہے یعنی جس سے کوئی عہد وپیمان نہ ہوا ہو۔

(۲)　علماء کی دوسری جماعت جن میں ''امام شافعیؒ، وامام مالکؒ شامل ہیں، ان کا قول یہ ہے کہ جو مسلمان جان بوجھ کر کسی ذمی کو قتل کردے اس کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے

گا، بلکہ اس پر دیت مغلظہ ہوگی، ان کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں مذکور کافر سے مراد معاہد ہے یعنی "لا یقتل فی عھدہ" پر مستقل کلام (جملہ مستانفہ) ہے، "لا یقتل مومن بکافر" کے بعد، ما قبل سے اس کا تعلق نہیں، لہذا مومن کو کافر معاہد کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ جب ہم نے غور کیا تو یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد "ولا ذو عھد فی عھدہ" دو باتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہ ہوگا، یا تو یہ معطوف ہوگا ما قبل والے جملہ پر جیسا کہ یہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے یا تو مستقل کلام ہوگا جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جس ارشاد میں مومن کے فعل کی نفی کی گئی ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے "لا یقتل مومن بکافر ولا ذو عھد فی عھدہ" اب ان الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے اس روایت کا وہ معنی مراد لینا محال و ناممکن ہے۔

کیونکہ اگر وہ معنی مراد ہے جو فریق ثانی نے ذکر کیا ہے تو یہ بات غلط ثابت ہوگی، حالانکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ وعدہ کا پاس رکھنے والے تھے، پھر عبارت کچھ اس طرح ہوتی "لا یقتل مومن بکافر ولا ذی عھد فی عھدہ" کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلہ اور نہ ہی معاہدے والے کافر کے بدلہ دوران عہد قتل کیا جائے، جب کہ الفاظ اس طرح نہیں ہیں، البتہ الفاظ "ولا ذو عھد فی عھدہ" ہیں، تو اس سے ثابت ہو گیا کہ قصاص میں ذو العھد سے مراد ذمی ہے، اب مفہوم اس طرح ہوگا: "لا یقتل مومن ولا ذو عھد فی عھدہ بکافر" کہ کوئی مومن اور ذمی عہد کے دوران کافر حربی کے بدلے قتل نہ کیا جائے، اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ معاہدہ والا ذمی بھی کافر ہے تو اس سے یہ دلیل مل گئی کہ جس کافر کے بدلہ میں مومن کے قتل سے منع کیا گیا ہے اس سے حربی و غیر ذمی کافر مراد ہے، اور اس پر تمام امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ کافر حربی کے قتل کے بدلہ مومن کو قصاص میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔

نظیر:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ عبارت میں اس قسم کی تقدیم وتاخیر قرآن کریم میں بکثرت موجود ہے، ملاحظہ فرمائیے: ارشاد باری ہے:﴿وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ﴾ [الطلاق: ۴] اس آیت کا معنی یہ ہے: (وَاللَّائِي لَم يَحِضن إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ) کہ وہ عورتیں جو آئسہ ہیں اور وہ عورتیں جن کو حیض نہیں آیا اگر ان کی عدت میں تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔

یہاں مقدم ومؤخر کیا ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد "لا يقتل مومن بكافر ولا ذو عهد في عهده" میں تقدیم وتاخیر ہے، لہذا عبارت میں کافر سے کافر حربی مراد ہے جس سے کوئی عہد و پیمان نہ ہوا ہو۔

نظر طحاوی:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حربی کافر کا خون حلال ہے اور اس کا مال بھی حلال ہے، لیکن جب وہ ذمی بن جاتا ہے، تو اس کا مال اور جان دونوں حرام ہو جاتے ہیں اور ان کی حرمت مسلمان کے مال وجان کی طرح ہوتی ہے، پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو آدمی ذمی کا اتنا مال چوری کرے جس پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے تو اس چور کا ہاتھ اسی طرح کاٹا جائے گا جس طرح کسی مسلمان کا مال چوری کرنے سے کاٹا جاتا ہے، لہذا جب ذمی کے مال کی حرمت توڑنے میں وہی سزا ہے، جو مسلمان کے مال کی حرمت توڑنے میں لازم آتی ہے تو قیاس اس بات کو چاہتا ہے کہ ذمی کے خون کی حرمت توڑنے والے کو بھی وہی سزا ملے جو مسلمان کا خون بہانے والے کو ملتی ہے۔

اعتراض:

معترض نے یہ اعتراض کیا ہے کہ کیا آپ حضرت عمرؓ سے یہ روایت بیان نہیں کرتے

ہیں؟ کہ ایک مسلمان نے عباد قبائل کے ایک آدمی کو قتل کر دیا، اس کا بھائی حضرت عمرؓ کی خدمت میں آیا تو آپ نے اس کے قتل کا فرمان لکھا، راوی کہتے ہیں کہ پھر حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اس کی دیت دی جائے اور اس کو قتل نہ کیا جائے، دیکھئے یہاں حضرت عمرؓ نے قتل کا فرمان جاری کیا اور بعد میں دوسرا حکم جاری کیا کہ اس سے صرف دیت لی جائے اور قتل نہ کیا جائے۔

جواب:

امام طحاویؒ جواب دیتے ہیں! جی ہاں ہم اس روایت کو بیان کرتے ہیں اور حضرت عمرؓ نے اولاً یہی فرمان جاری کیا کہ اس مسلمان کو کافر (ذمی) کے بدلہ میں قتل کیا جائے، البتہ بعد والا خط جس میں ''لا یقتل'' لکھا تھا تو اس میں یہ احتمال ہے کہ مقتول کے قتل کی کیفیت کی اطلاع پانے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل کو درست نہ سمجھا، اور اس قتل کو قتل شبہ عمد قرار دیا، جس کی بنا پر آپ قتل سے رک گئے اور اس کے لئے وہی مقرر فرمایا جو قتل عمد میں شبہ آجانے سے لازم ہوتا ہے یعنی دیت۔

اقوال المحدثین:

(۱) مولانا محمد عاقل صاحب فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہو گیا ہے کہ کافر ذمی کے بدلہ میں مسلم کو بھی قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ عند الجمہور قتل نہیں کیا جائے گا، اور حنفیہ کے نزدیک ذمی کے بدلہ میں مسلم کو قتل کیا جائے گا، حنفیہ کے نزدیک قصاص کے مسئلہ میں ذمی اور مسلم دونوں برابر ہیں۔ (الدر المنضود: ۴/ ۴۶۲)

(۲) اسی طرح صاحب تحفۃ الاحوذی ''مولانا محمد عبد الرحمن مبارکپوریؒ'' قاضی عیاضؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں: ''وان لا یقتل مومن بکافر'' یہ دلیل عام ہے اس بات پر کہ

مومن کو کافر کے بدلہ قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا خواہ وہ حربی ہو یا ذمی۔

اور یہی حضرت عمر، عثمان، علی، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا قول ہے، نیز حضرت عطاء، عکرمہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ کا قول ہے، اور امام نووی، ابن شبرمہ، اوزاعی، مالک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

اور دوسرا قول یہ کہ مسلمان کو کافر ذمی کے بدلہ قتل کیا جائے گا اور حدیث اس کے علاوہ (کافر حربی) کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہ حضرت نخعی اور شعبی کا قول ہے اور امام ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب ابوحنیفہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

(وأن لا يقتل مؤمن بكافر) قال القاضى هذا علم يدل على أن المؤمن لا يقتل بكافر قصاصا سواء الحربى والذمى وهو قول عمر وعثمان وعلى وزيد بن ثابت وبه قال عطاء وعكرمة والحسن عمر بن عبدالعزيز واليه ذهب الثورى وابن شبرمة والأوزاعى ومالك والشافعى وأحمد وإسحاق وقيل يقتل بالذمى والحديث مخصوص بغيره وهو قول النخعى والشعبى وإليه ذهب أصحاب أبى حنيفة .(تحفة الاحوذی: ۵۵۷/۴، رقم الحدیث: ۱۴۱۲، دار الکتاب العلمیہ، بیروت، لبنان)

(۳) علامہ محمد قطب الدین خاں دہلوی فرماتے ہیں: کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے، بہت سے صحابہ وتابعین، تبع تابعین اور تینوں اماموں کا مسلک یہی ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو قتل کردے تو مقتول کافر کے بدلہ میں قاتل مسلمان کو قتل نہ کیا جائے، خواہ وہ مقتول کافر ذمی ہو یا حربی ہو، لیکن حضرت امام ابوحنیفہ اور اکثر علماء کا مسلک یہ ہے کہ اگر وہ مقتول کافر ذمی ہو تو اس کے بدلہ میں قاتل مسلمان کو قتل کیا جائے گا۔ (مظاہر حق جدید: ۲۷۶/۴، ادارۃ الاسلام، دیوبند)

باب: ۱۹۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ جَوَابًا لِابْنِ عُمَرَ لَمَّا سَأَلَهُ عَنْ أَخْذِهِ الدَّنَانِيرَ بِالدَّرَاهِمِ، وَالدَّرَاهِمَ بِالدَّنَانِيرِ فِي الْبَيْعِ: "إِذَا كَانَ ذَلِكَ مِنْ صَرْفِ يَوْمِكُمَا وَافْتَرَقْتُمَا، وَلَيْسَ بَيْنَكُمَا شَيْءٌ فَلَا بَأْسَ"

﴿مبیع کے ثمن کا حصول مال متقوم سے درست ہے﴾

۱۲۴۶ - حَدَّثَنَا أَبُو أُمَيَّةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوسَى الْعَبْسِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْرَائِيلُ بْنُ يُونُسَ، يَعْنِي عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: أَتَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي حُجْرَةِ حَفْصَةَ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ رُوَيْدَكَ أَسْأَلُكَ إِنِّي أَبِيعُ الْإِبِلَ بِالنَّقِيعِ فَأَبِيعُ بِالدَّنَانِيرِ، وَآخُذُ الدَّرَاهِمَ وَأَبِيعُ بِالدَّرَاهِمِ وَآخُذُ الدَّنَانِيرَ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا كَانَ ذَلِكَ مِنْ صَرْفِ يَوْمِكُمَا وَافْتَرَقْتُمَا، وَلَيْسَ بَيْنَكُمَا شَيْءٌ فَلَا بَأْسَ". (شرح مشکل الآثار: ۲۸۲/۳، سنن الترمذی: ح:۱۲۴۲، سنن ابی داود: ج/۳، ص:۲۲۴، ح: ۳۳۵۴، سنن ابن ماجه: :۲۲۶۲، سنن النسائی: ح: ۴۵۸۹، مسند احمد: ۵/ ۱۱۱، ح:۵۵۵۵)

خلاصۃ الحدیث:

انسان کو زندگی میں مختلف چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر انسان کے پاس اس کی تمام ضروریات مہیا ہوں، یا وہ ان اشیاء کو خود تیار کرلے، اس لئے اشیاء ضرورت کے تبادلہ کا نظام قائم ہوا، انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں اشیاء کے تبادلہ کی بہت سی صورتیں رائج رہیں، پھر نقل وحمل کی دشواریوں کو دیکھتے ہوئے، یہ نظام قائم ہوا کہ کسی ہلکی مگر قیمتی چیز کو پیمانہ

بنالیا جائے، اور اس کو ذریعۂ تبادلہ کے طور پر استعمال کیا جائے، اس سلسلہ میں مختلف چیزوں کو پیمانہ بنانے کی کوشش کی گئی، اور اس کو ثمن کا درجہ دیا گیا، لیکن بالآخر بات سونے اور چاندی پر آکر ٹھہری، اسلام نے کرنسی کے اس نظام کو باقی رکھا، پھر جب سونے چاندی کے سکے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس کی رسیدیں جاری ہوئیں، اور وہی کاغذی نوٹ کی طرح استعمال ہونے لگیں۔

چنانچہ موجودہ دور میں خرید وفروخت کے لئے جو کرنسی رائج ہے اس کو ڈالر، ریال اور نوٹ وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور ہر ملک کی کرنسی مالیاتی اعتبار سے بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے، جس کا مارکیٹ پر بڑا اثر پڑتا ہے، یہ دراصل سونا اور چاندی کے عوض میں زرمبادلہ ہیں، لیکن اس وقت فقہاء نے ان چیزوں کو زرمبادلہ (کرنسی) کا درجہ دے دیا ہے۔

ایسی صورت میں اگر دو شخص باہم بیع وشراء کریں، مثلاً زید ایک ہزار روپے میں گھڑی بیچ رہا ہے، اور حامد ڈالر دینا چاہتا ہے تو کتنا ڈالر اداء کرے؟ ایک ہزار روپے کے بدلہ ایک ہزار ڈالر یا کمی بیشی کے ساتھ۔

جب حدیث الباب کی مذکورہ روایت میں دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابن عمرؓ کو فرمایا کہ تم دینار کے بدلہ درہم لو، لیکن اس دن درہم ودینار کی جو قیمت ہو اس کے مطابق لو، مطلب یہ ہوا کہ اگر پاؤنڈ کی قیمت دس دینار ہے اور مشتری دینار کے بدلہ درہم دینا چاہتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ اس روز دینار کی دراہم کے اعتبار سے کیا قیمت ہے؟ اگر اس روز دس دینار کی قیمت سو (۱۰۰) درہم ہے تو مشتری دس دینار کے بجائے سو درہم ادا کرے تو جائز ہوگا، اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیث الباب میں مذکور ہے۔

سوال:

اس باب میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت دو طرق سے آئی ہے، ایک میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اذا کان ذلک من صرف یومکما، وافترقتما، ولیس بینکما شیئ، فلا باس. اور دوسرے طریق میں فرمایا: ”لا باس اذا اخذت بسعر يومك. تو یہاں ’’بسعر يومك‘‘ سے کیا مراد ہے؟

فَقَالَ قَائِلٌ: مَا مَعْنَى سِعْرِ الْيَوْمِ الَّذِي يَتَصَارَفَانِ فِيهِ وَقَدْ رَأَيْنَا الْبِيَاعَاتِ تَجُوزُ بَيْنَ النَّاسِ فِي مِثْلِ هَذَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا وَبِأَكْثَرَ مِنْ سِعْرِ يَوْمِهَا، وَبِأَقَلَّ مِنْ سِعْرِ يَوْمِهَا لَا اخْتِلَافَ بَيْنَ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي ذَلِكَ وَفِي جَوَازِهِ وَفِي اسْتِقَامَتِهِ، فَمَا بَالُ سِعْرِ يَوْمِهَا الْتُمِسَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ؟
(شرح مشکل الآثار:۳/۲۸۳)

جواب:

(اذا کان بسعر یومك) یعنی یوم الاداء کی قیمت معتبر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بیع کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ جس کرنسی میں بیع ہوئی ہے اگر مشتری نے اس وقت اداء نہیں کی تو وہ کرنسی اس کے ذمہ دین ہوگی، مثلا دینار پر بیع ہوئی، اور بیع کے وقت دس دینار اداء نہیں کئے تو یہ دس دینار مشتری پر واجب ہوگئے، اور جب تک اداء نہیں کرے گا اس وقت تک دینار ہی واجب رہیں گے، اب اگر وہ مشتری جمعرات کو اداء کر رہا ہے تو اتنے ہی دینار (دس دینار) اداء کرے گا، جو اس کے ذمہ واجب ہیں، لیکن اگر وہ جمعرات کو دس دینار کے بجائے دراہم دینا چاہتا ہے اور اس روز دس دینار کی قیمت ایک سو دس (۱۱۰) درہم ہے تو وہ ایک سو دس درہم اداء کرے گا۔

اس لئے کہ اس روز دس دینار کی قیمت ایک سو دس (۱۱۰) درہم ہے، لہذا یہی حکم قرض کے لین دین میں ہوگا، مثلاً کسی شخص نے دس دینار قرض لئے، اب وہ قرض کی ادائیگی درہم کی شکل میں کرنا چاہتا ہے تو وقت ادائیگی درہم و دینار کی جو قیمت ہوگی اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث الباب میں حضرت ابن عمرؓ کی جو رہنمائی فرمائی

ہے، یہ اعلیٰ درجہ کا فتویٰ ہے، اور مخلوق سے محبت کی دلیل ہے، کیوں کہ اس کے برخلاف بھی بیع وشراء درست ہوجاتی ہے، لیکن حدیث میں بیان کردہ طریقہ میں بائع ومشتری اور دائن ومدیون کے لئے سہولت ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ جَلَّ وَعَزَّ وَعَوْنِهِ: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَلَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ فِي سُؤَالِهِ إِيَّاهُ عَمَّا سَأَلَهُ عَنْهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ عَلَى الْوَرَعِ الَّذِي يَجِبُ عَلَى النَّاسِ اسْتِعْمَالُهُ فِيمَا سَأَلَهُ عَنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۸۴)

اقوال المحدثین:

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ خرید وفروخت کے معاملہ میں اگر دینار سے معاملہ ہوا ہے، لیکن اس کے بجائے دراہم لیتا ہے یا اگر معاملہ دراہم کے ساتھ ہوا تھا اور پھر بعد میں بجائے درہم کے اسی قیمت کے بقدر دنانیر لیتا ہے، تو ایسا کرنا بحساب قیمت متساویاً تو بالاتفاق جائز ہے، اور اگر بالفرض متفاضلا ہو تب بھی تراضیٔ طرفین کے ساتھ جائز ہے، اس لئے کہ اختلافِ جنس کی صورت میں کمی زیادتی جائز ہے، لیکن یہ جواز تفاضل صرف حنفیہ کا مسلک ہے دوسرے ائمہ کے نزدیک جائز نہیں۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ ''اقتضاء الذهب من الورق'' (دراہم کے بجائے دنانیر لینا اور اس کے برعکس) کو اکثر حضرات نے جائز قرار دیا ہے، جہاں تک ''سعر اليوم'' کا تصدق ہے تو ابن ابی لیلیٰؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کا تبادلہ اس صورت میں جائز ہے کہ جس روز معاملہ ہوا تھا اس روز دراہم ودنانیر کی بازار میں جو قیمت تھی، اسی قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے ہو، ورنہ مکروہ ہے، ''سعر اليوم'' جس کو ''خطاب'' فرما رہے ہیں کہ وہ حدیث میں مصرح ہے، لیکن یہ قید بعض طرق میں ہے، بعض میں نہیں، غالبًا اس لئے جمہور نے ''سعر اليوم'' کے اعتبار کو ضروری قرار نہیں دیا، البتہ امام احمد کے نزدیک ''سعر اليوم'' کی قید ضروری ہے۔

ابوداود کے حاشیہ ’’فتح الودود‘‘ میں ذکر کیا گیا ہے کہ ’’سعر الیوم‘‘ کی قید علی طریق الاستحباب ہے۔

قال الموفق: یجوز هذا فی قول اکثر اهل العلم۔۔۔ولنا حدیث الباب، لا باس ان تاخذها بسعر یومها.

قال الخطابی : واشترط ان لا یتفرقا وبینهما شیئ ؛ لان اقتضاء الدراهم من الدنانیر صرف، وعقد الصرف لا یصح الا بالتقابض، وقد اختلف الناس۔۔۔فذهب اکثر اهل العلم الی جوازه۔۔۔وکان ابن ابی لیلی یکره ذلك الا بسعر یومه، ولا یعتبر غیره السعر۔۔۔

وفی هامش ابی داود عن ’’فتح الودود‘‘ ای بشرط التقابض فی المجلس والتقیید بسعر الیوم علی طریق الاستحباب.

قلت حکی الشوکانی: تقییده عن احمد، والیه یشیر کلام الترمذی اذ ذکر فیمن قال بالحدیث: احمد لا الشافعی، وبه جزم الموفق.(بذل المجهود، کتاب البیوع، باب فی اقتضاء الذهب من الورق: ۱۱/۴۶، ۴۷، رقم الحدیث: ۳۳۴۵، ط: دار البشائر الاسلامیة)

باب: ۱۹۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ دُعَائِهِ لِأَهْلِ مَدِينَتِهِ أَنْ يُبَارَكَ لَهُمْ فِي صَاعِهِمْ وَمُدِّهِمْ

﴿مدینہ والوں کے ظروف کی فضیلت اور برکت کی دعا﴾

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ’’اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِي

مِكْيَالِهِمْ وَبَارِكْ لَهُمْ فِي صَاعِهِمْ وَفِي مُدِّهِمْ " يَعْنِي: أَهْلَ الْمَدِينَةِ. (شرح مشكل الآثار: ۲۸۵/۳، المؤطا: ۸۸۴/۳-۸۸۵، رواه ابو حماد (۳۷۴۵)

خلاصۃ الحدیث:

عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں معاملات اور آپس میں لین دین کے لئے جو ظروف (پیمانہ) رائج تھے، ان میں سرفہرست صاع اور مُد کا ذکر آتا ہے، مدینہ منورہ میں ''مد'' کی مقدار دو رطل اور ''صاع'' کا وزن پانچ رطل اور نصف تھا، گرچہ جزیرۃ العرب میں رائج مد کی مقدار مدینہ منورہ کے مد کے برابر تھی، مگر ''صاع'' کا وزن آٹھ رطل تھا، ان پیمانوں کے وزن میں معمولی تفاوت کی وجہ سے مدینہ کے تاجروں کو پریشانی ہوتی تھی، وجہ یہ تھی کہ اہل مدینہ چھوٹے پیمانے سے لیتے تھے اور بڑے پیمانے سے دیتے تھے، اس لئے اہل مدینہ کو لین دین میں بڑا نقصان ہوتا تھا، کہ مال نفع میں کم آتا اور خرچ زیادہ ہوجاتا، چنانچہ صحابہ کرام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ''صاع'' بڑا کرنے کی درخوست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑا کرنے کے بجائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح برکت کی دعا کی کہ اے اللہ! اہل مدینہ کے مکیال صاع اور مد میں برکت عطا فرما، الغرض حدیث الباب میں اسی مضمون سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

سوال:

حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ والوں کے لئے دومرتبہ برکت کی دعا کیوں دی؟

جواب:

اس کا جواب امام طحاویؒ نے اس طرح دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دومرتبہ ''اللهم بارك

لھم'' کہنے کا مقصد دو چیزوں کے حق میں دعا علاحدہ علاحدہ دینا تھا، ایک مرتبہ اس صاع، مد اور مکیال کے حق میں جن کے ذریعہ اہل مدینہ پھلوں کا لین دین کرتے، اور دوسری مرتبہ دعا سے اہل مدینہ کو مراد لیا جو ان ظروف کے ذریعہ لین دین کرتے تھے، جس طرح قرآن کریم میں ﴿وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا﴾ [یوسف:۸۲] سے اللہ تعالیٰ نے اہل قریہ مراد لیا ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَتَأَمَّلْنَا هَذِهِ الْآثَارَ وَمَا فِيهَا مِنْ قَصْدِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِدُعَائِهِ بِالْبَرَكَةِ إِلَى الصَّاعِ وَالْمُدِّ وَالْمِكْيَالِ، فَكَانَ ذَلِكَ عِنْدَنَا مِنْهُ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ إِرَادَةً مِنْهُ بِهِ الْبَرَكَةَ فِيمَا يُكَالُ بِالصَّاعِ وَالْمُدِّ وَالْمِكْيَالِ مِنَ الثِّمَارِ الَّتِي هِيَ أَمْوَالُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ، وَمِنْهَا عَيْشُ سَاكِنِيهَا، وَكَانَ قَصْدُهُ بِذَلِكَ إِلَى الصَّاعِ وَالْمُدِّ وَالْمِكْيَالِ قَصْدًا مِنْهُ إِلَى الْمَكِيلِ بِهَذِهِ الْأَشْيَاءِ، وَمِثْلُ هَذَا مِنْ كَلَامِ الْعَرَبِ قَوْلُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا﴾ [یوسف:۸۲] وَكَانَتِ الْمَدِينَةُ دَارَ الثِّمَارِ لَا مَا سِوَاهَا، فَقَصَدَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالدُّعَاءِ لِأَهْلِ تِلْكَ الثِّمَارِ بِالْبَرَكَةِ فِيمَا يَعْتَبِرُونَ ثِمَارَهُمْ، وَفِيمَا يَبِيعُونَهَا بِهِ، وَفِيمَا يَقْضُونَ دَيْنَهُمْ مِنْهَا بِهِ، وَفِيمَا يَعُولُونَ بِهِ مَنْ يَعُولُونَهُ, وَلَمْ تَكُنْ دَارَ مَا يُسْتَعْمَلُ فِيهِ سِوَى الْمَكَايِيلِ مِنَ الْمَوَازِينِ، فَيَحْتَاجُوا إِلَى الدُّعَاءِ لَهُمْ بِالْبَرَكَةِ فِي مَوَازِينِهِمْ كَمَا احْتَاجَ إِلَى الدُّعَاءِ لَهُمْ بِالْبَرَكَةِ فِي مَكَايِيلِهِمْ, وَاللّٰهِ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۸۷/۳)

باب: ۱۹۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "الْوَزْنُ وَزْنُ أَهْلِ مَكَّةَ وَالْمِكْيَالُ مِكْيَالُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ"

﴿وزن اور کیل کی خصوصیت﴾

۱۲۵۲ - حَدَّثَنَا أَبُو بِشْرٍ عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ مَرْوَانَ الرَّقِّيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا الْفِرْيَابِيُّ، قَالَ: حَدَّثنَا سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ، عَنْ حَنْظَلَةَ، عَنْ طَاوُسٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الْوَزْنُ وَزْنُ أَهْلِ مَكَّةَ وَالْمِكْيَالُ مِكْيَالُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ". (شرح مشكل الآثار: ۲۸۸/۳، ورواه أبوداود: ۳۳۴۰، والنسائي: ۲۵۲۰)

خلاصۃ الحدیث:

چونکہ مکہ معظّمہ کی زمین بنجر تھی، زراعت کے قابل نہیں تھی، اس لئے یہاں کہ اکثر لوگوں کا پیشہ تجارت تھا، یہی تجارت ان کی معیشت کا ذریعہ تھی، اور معاملات، لین دین دراہم ودنانیر سے کرتے تھے، اور دراہم ودنانیر کے وزن میں مختلف شہروں کے اعتبار سے بڑا فرق تھا، اس لئے مذکورہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ احکام شرعیہ (زکوۃ، صدقۃ الفطر اور کفارات) میں اہل مکہ کا وزن معتبر ہوگا، اور اہل مکہ کا درہم وزنِ سبعہ ہوتا تھا، یعنی ہر دس درہم سات مثقال کے برابر ہوتے تھے، لہذا جس شخص کی ملکیت میں دوسو درہم وزنِ سبعہ کے اعتبار سے موجود ہوں تو وہ صاحب نصاب ہوگا، اور اس پر زکوۃ واجب ہوگی، جب کہ اہل مدینہ اصحاب زراعت تھے، جن کے معاملات زیادہ تر مد اور صاع وغیرہ مکاییل سے ہوتے تھے، اور مد وصاع کی مقدار بھی مختلف شہروں کے اعتبار سے متفاوت تھی، اس لئے مذکورہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیلی چیزوں میں اہل مدینہ کا کیل معتبر ہوگا، الغرض وزن میں اہل مکہ کا وزن اور کیلی چیزوں میں اہل مدینہ کے کیل کا۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَتَأَمَّلْنَا هَذَا الْحَدِيثَ فَوَجَدْنَا مَكَّةَ لَمْ يَكُنْ بِهَا ثَمَرَةٌ وَلَا زَرْعٌ حِينَئِذٍ، وَكَذَلِكَ كَانَتْ قَبْلَ ذَلِكَ الزَّمَانِ، أَلَا تَرَى إِلَى قَوْلِ إِبْرَاهِيمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ﴾[إبراهيم: ۳۷] . وَإِنَّمَا كَانَتْ بَلَدَ مَتْجَرٍ يُوَافِي الْحَاجُّ إِلَيْهِ بِالتِّجَارَاتِ فَيَبِيعُونَهَا هُنَاكَ بِالْأَثْمَانِ الَّتِي تُبَاعُ بِهَا التِّجَارَاتُ ، وَكَانَتِ الْمَدِينَةُ بِخِلَافِ ذَلِكَ ، لِأَنَّهَا دَارُ النَّخْلِ وَمِنْ ثِمَارِهَا حَيَاتُهُمْ ، وَكَانَتِ الصَّدَقَاتُ تَدْخُلُهَا فَيَكُونُ الْوَاجِبُ فِيهَا مِنَ الصَّدَقَةِ يُؤْخَذُ كَيْلًا ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأَمْصَارَ كُلَّهَا لِهَذَيْنِ الْمِصْرَيْنِ أَتْبَاعًا. (شرح مشکل الآثار: ۲۸۹/۳، ۲۸۸)

اقوال المحدثین:

(۱) ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: "وَالْمِكْيَالُ مِكْيَالُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ" اس کا مطلب یہ ہے کہ پیمانہ میں اہل مدینہ کے پیمانہ کا اعتبار ہے، کیوں کہ وہ صاحب زراعت تھے، اور وہاں غلہ کا لین دین پیمانہ ہی کے ذریعہ ہوا کرتا تھا، اس لئے انہیں یہ پیمانوں کے بارے میں زیادہ واقفیت رہا کرتی تھی، "الْوَزْنُ وَزْنُ أَهْلِ مَكَّةَ" اس کا مطلب یہ ہے کہ وزن میں اہل مکہ کا وزن معتبر ہے، کیوں کہ اہل مکہ تجارت پیشہ تھے، اس لئے وہ اوزان کی واقفیت زیادہ رکھتے تھے۔

المكيال أي المعتبر مكيال أهل المدينه؛ لأنهم أصحاب زراعات فهم أعلم بأحوال المكايل ، والميزان أي المعتبر ميزان أهل مكة ؛ لأنهم أهل تجارات معهدهم بالموازين وعملهم بالأوزان اكثر. (مرقاة المفاتيح: كتاب البيوع، باب السلم والرهن: ۱۰۸/۶، رقم الحديث: ۲۸۸۹)

(۲) حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ علامہ خطابیؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ دراہم دراصل مختلف الأوزان ہوتے ہیں، مختلف شہروں کے اعتبار سے، اور اہل مدینہ کا تعامل جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے دراہم سے تھا باعتبار عدد کے، اور چونکہ دراہم مختلف الأوزان ہوتے ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں اہل مدینہ کو

توجہ دلائی اس بات کی طرف کہ وہ دراہم اور دنانیر میں اہل مکہ کے وزن کا اعتبار رکھیں، اور اہل مکہ کا درہم وزنِ سبعہ ہوتا ہے، یعنی ہر دس درہم سات مثقال کے برابر ہوتے تھے، لہذا جس شخص کی ملک میں دوسو درہم وزنِ سبعہ کے اعتبار سے موجود ہوں وہ صاحبِ نصاب ہوگا، اور اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

قال الخطابی (قوله) (الوزن وزن أهل مكة) يريد وزن الذهب والفضة دون سائر الأوزان، ومعناه ان الوزن الذی یتعلق به حق الزکوة فی النقود وزن أهل مكة، وهی دراهم الإسلام المعادلة، منها: العشرة بسبعة مثاقيل، فاذا ملك رجل منها مأتی درهم وجبت الزكوة، وذلک لأن الدراهم مختلفة الأوزان فی بعض البلدان والأماكن. (بذل المجهود، کتاب البیوع: باب فی قول النبی ﷺ: المکیال مکیال المدینة: ۱۱/۲۵، رقم الحدیث: ۳۳۴۰)

باب: ۱۹۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَحَبِّ الصِّيَامِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ

﴿صوم داؤد کی اہمیت وفضیلت﴾

۱۲۵۳ - حَدَّثَنَا يُونُسُ بْنُ عَبْدِ الْأَعْلَى، وَعِيسَى بْنُ إِبْرَاهِيمَ الْغَافِقِيُّ جَمِيعًا قَالَا: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ، عَنْ عَمْرٍو، وَهُوَ ابْنُ دِينَارٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ أَوْسٍ، سَمِعَ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرٍو، يَقُولُ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَحَبُّ الصِّيَامِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ صِيَامُ دَاوُدَ، كَانَ يُفْطِرُ يَوْمًا وَيَصُومُ يَوْمًا، وَأَحَبُّ الصَّلَاةِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ صَلَاةُ دَاوُدَ كَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُومُ ثُلُثَهُ وَيَنَامُ سُدُسَهُ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۹۱، ورواه البخاری: ۳۴۳۰،

ومسلم: ۱۱۵۹، وابن ماجه: ۱۷۱۲)

خلاصۃ الحدیث:

شریعت مطہرہ میں جس طرح کچھ عبادتیں فرض ہیں، جن کی ادائیگی ہر مسلمان مردوعورت پرواجب ہے، اسی طرح کچھ نفلی عبادات بھی ہیں، جن کے ذریعہ مسلمان کواللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اور دوسرے بندوں کی بنسبت زیادہ محبوب ہوتا ہے، چنانچہ قرآن وحدیث میں بہت سی نفلی عبادات کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رات کونفلی نمازیں پڑھنا، اسی طرح رمضان المبارک کے علاوہ دنوں میں روزے رکھنا، نیز صدقہ وغیرہ کرنا، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی انبیاء کرام علیہم السلام نفلی عبادات میں مشغول رہتے تھے، جن کا تذکرہ احادیث میں بکثرت آیا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت داوٗدؑ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے مقبول روزہ حضرت داوٗدؑ کا روزہ ہے، وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے، اور رات کے آدھے حصہ میں سوئے اور ایک تہائی حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔

الغرض امام طحاویؒ اس باب کے تحت ان نفلی روزوں کو بیان کررہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں۔

تعارض:

حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے مقبول اور افضل روزہ حضرت داوٗدؑ کا روزہ ہے، جب کہ دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ محرم الحرام کا روزہ زیادہ افضل ہے، جیسا کہ حدیث ابو ہریرہ میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: أَتَى رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: أَيُّ الصَّلَاةِ

بَعْدَ الْمَكْتُوبَةِ أَفْضَلُ؟فقَالَ: "صَلاةٌ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ" قَالَ: فَأَيُّ الصِّيَامِ أَفْضَلُ؟قَالَ: "شَهْرُ اللّٰهِ الَّذِي تَدْعُونَهُ الْمُحَرَّمَ" قَالَ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ أَفْضَلَ الصِّيَامِ شَهْرُ اللّٰهِ الَّذِي يُدْعَى الْمُحَرَّم. (شرح مشکل الآثار:۲۹۲/۳)

اس اعتبار سے دونوں احادیث میں تعارض واقع ہوا ہے۔

فَقَالَ قَائِلٌ: كَيْفَ تَقْبَلُونَ هَذَا عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنْتُمْ تَرْوُونَ عَنْهُ؟فَذَكَرَ. (شرح مشکل الآثار:۲۹۲/۳)

جمع وتطبیق:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ درحقیقت یہاں کوئی تعارض نہیں ہے، کیوں کہ محرم الحرام کے روزے کے بارے میں جو حدیث مذکور ہے وہ ایک وقت اور ایک زمانہ کے ساتھ خاص ہے، اور ترجمۃ الباب میں جو حدیث ہے وہ تمام دنوں کے روزہ کے بارے میں ہے، اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ أَنَّ صَوْمَ الْمُحَرَّمِ أَفْضَلُ الْأَوْقَاتِ الَّتِي يُصَامُ فِيهَا التَّطَوُّعُ. (شرح مشکل الآثار:۲۹۳/۳)

اقوال المحدثین:

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

مطلق نفل عبادتوں کی تحدید بیان کرنا مناسب نہیں ہے، ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں اگر یہ کہا جائے کہ نفل کی معنوی کیفیت اور حالت اشخاص، اوقات اور احوال کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انواعِ عبادت میں طریقِ انبیاء کی پیروی مستحسن ہے۔

وأن النفل المطلق لاينبغي تحديده، بل يختلف الحال بإختلاف الأشخاص

والأوقات والأحوال۔۔۔۔۔وفیه اشارة الی الإقتداء بالأنبیاء علیهم الصلاة والسلام فی أنواع العبادات. (فتح الباری، کتاب الصوم: باب صوم داؤد، رقم: ۴، ۱۹۸۰/۲۶۵)

باب: ۱۹۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "إِنَّكُمْ سَتَفْتَحُونَ أَرْضًا يُذْكَرُ فِيهَا الْقِيرَاطُ" مَا مُرَادُهُ بِذٰلِكَ الْقِيرَاطِ؟

﴿قیراط کا معنی اور مراد﴾

۱۲۵۶ - حَدَّثَنَا يُونُسُ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ، قَالَ: حَدَّثَنِي حَرْمَلَةُ بْنُ عِمْرَانَ التُّجِيبِيُّ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ شِمَاسَةَ الْمَهْرِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " إِنَّكُمْ سَتَفْتَحُونَ أَرْضًا يُذْكَرُ فِيهَا الْقِيرَاطُ، فَاسْتَوْصُوا بِأَهْلِهَا خَيْرًا فَإِنَّ لَهُمْ ذِمَّةً وَرَحِمًا , فَإِذَا رَأَيْتُمْ رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ فِي مَوْضِعِ لَبِنَةٍ ; فَاخْرُجْ مِنْهَا" قَالَ: فَمَرَّ بِرَبِيعَةَ وَعَبْدِ الرَّحْمَنِ ابْنَيْ شُرَحْبِيلَ ابْنِ حَسَنَةَ يَتَنَازَعَانِ فِي مَوْضِعِ لَبِنَةٍ فَخَرَجَ مِنْهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲۹۴/۳، م- ح: ۲۵۴۲، ابن حبان: ۶۶۷۶، والبیهقی فی السنن: ۹/ ۲۰۶، وفی الدلائل: ۳۲۱/۶)

خلاصۃ الحدیث:

سرزمین مصر ایک تاریخی ملک ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں مصر کو فتح کیا تھا، نیز حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہؓ مصر کی تھیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے، اس لئے رشتہ داری اور صلحاً فتح کرنے کی وجہ سے ان کے حق کی بناء پر مذکورہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مصر کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا حکم دیا، علاوہ ازیں مذکورہ حدیث ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک پیشگوئی کی طرف

اشارہ فرمایا کہ جب دو اشخاص میں ایک اینٹ کے برابر معمولی جگہ کے لئے جھگڑا ہو تو یہ حُبِ دنیا، دنیا طلبی اور آخرت سے بیزاری کی علامت ہے، اس لئے اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشینگوئی کے مطابق لوگوں میں معمولی جگہ کے لئے جھگڑا ہوا جیسا کہ حدیث الباب میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمن اور ربیعہ کو ایک جگہ کے لئے جھگڑتے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہنمائی اور حکم کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ وہاں سے نکل گئے، معلوم ہوا کہ یہ مذکورہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی بیّن دلیل ہے۔

سوال:

لفظ قیراط سے عام معنی مراد ہے (ایک پیمانہ ہے جس کا وزن مختلف علاقوں میں الگ الگ ہوا کرتا تھا)، یا اس سے کوئی خاص معنی؟

فَقَالَ قَائِلٌ: كَيْفَ تَقْبَلُونَ هَذَا ، وَأَنْتُمْ تَجِدُونَ ذِكْرَ الْقِيرَاطِ جَارِيًا عَلَى أَلْسُنِ النَّاسِ جَمِيعًا وَمَذْكُورًا فِي سَائِرِ الْبُلْدَانِ سِوَى الْبَلَدِ الَّذِي أُضِيفَ ذَلِكَ الْقِيرَاطُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ إِلَى أَهْلِهِ ، وَتَجِدُونَ ذِكْرَهُ أَيْضًا فِي كَلَامِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. وَذَكَرَ

(شرح مشکل الآثار:۲۹۴/۳)

جواب:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ قیراط سے خاص معنی مراد ہے، یعنی ناگواری کی بات، عام معنی (پیمانہ) مراد نہیں ہے، اس لئے کہ مذکورہ حدیث میں جس شہر کے فتح ہونے کی خوشخبری دی گئی ہے وہ مصر ہے، اور مصر والے اس لفظ کو ناگواری کے وقت استعمال کرتے ہیں۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ: أَنَّ النَّاسَ جَمِيعًا فِي سَائِرِ الْبُلْدَانِ فِي ذِكْرِ الْقِيرَاطِ كَمَا وَصَفَ ، وَالْقِيرَاطُ الْمُرَادُ فِي حَدِيثِ أَبِي ذَرٍّ الَّذِي رَوَيْنَا لَيْسَ

مِنْ هَذِهِ الْقَرَارِيطِ الْمَذْكُورَاتِ فِي هَذِهِ الْآثَارِ فِي شَيْءٍ وَإِنَّمَا هُوَ شَيْءٌ مَوْجُودٌ فِي كَلَامِ أَهْلِ تِلْكَ الْمَدِينَةِ الَّتِي وَعَدَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِافْتِتَاحِهَا، وَذَكَرَ لَهُمْ أَهْلَهَا وَرَحِمَهُمْ بِهِ وَأَوْصَاهُمْ بِهِمْ خَيْرًا وَهِيَ مِصْرُ، وَمَوْجُودٌ فِي كَلَامِ أَهْلِهَا أَعْطَيْتُ فُلَانًا قَرَارِيطَهُ إِذَا سَمَّعَهُ مَا يَكْرَهُهُ وَإِذَا خَاطَبَهُ بِمَا لَا يُحِبُّ مُخَاطَبَتَهُ بِهِ، وَيُحَذِّرُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَيَقُولُ: اذْهَبْ عَنِّي لَا أُعْطِيكَ قَرَارِيطَكَ، يَعْنِي: سِبَابَكَ وَإِسْمَاعَكَ الْمَكْرُوهَ الَّذِي لَا تُحِبُّ أَنْ تَسْمَعَهُ، وَلَيْسَ هَذَا بِمَوْجُودٍ فِي كَلَامِ أَهْلِ مَدِينَةٍ سِوَى أَهْلِ مِصْرَ. (شرح مشکل الآثار:۲۹۶/۳)

اقوال المحدثین:

ابن اثیرؒ نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے کہ لفظ قیراط سے مذکورہ حدیث میں ایک خاص معنی (نا گواری کے وقت کہنا) مراد لیا ہے۔

واراد بالارض المستفتحة مصر وخصها بالذكر وإن كان القيراط مذكورا فى غيرها لانه كان يغلب على أهلها أن يقولوا: أعطيت فلانا قراريط، إذا أسمعه ما يكرهه واذهب لا أعطيك قراريطك يعنى سبّك وإسماعك المكروه ولا يوجد ذلک فی کلام غيرهم. (النہایہ: ۷۳۱)

علامہ ابن حبان بستی فرماتے ہیں کہ قیراط کا مطلب یہ ہے کہ مصر کے قبطی لوگ اپنے عہدوں کے نام لفظ قیراط سے رکھتے تھے، نیز اپنے ہر اجتماع گاہ کا نام قیراط رکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم عید گاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔

قال حرملة: يعنى بالقيراط ان قبط مصر يسمون أعيادهم، وكل مجمع لهم: القيراط، يقولون نشهد القيراط. (صحیح ابن حبان: ذکر الاخبار عن فسخ جل وعلا علی المسلمین ارض بربر: ۶۹/۱۵، ط: موسسة الرسالة: بیروت)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ علماء نے کہا کہ قیراط دینار و درہم وغیرہ کا ایک جزء ہے اور اہل مصر اسے زیادہ تر عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔

قال العلماء: القیراط جزء من اجزاء الدینار والدرہم وغیرھما، وکان اھل مصر یکثرون من استعمالہ والتکلم بہ. (صحیح مسلم بشرح الامام محی الدین النووی، فضائل الصحابة باب وصیة النبی ﷺ باھل مصر: ۳۱۳/۱۰، ط: دار المعرفة)

باب: ۱۹۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْقِيرَاطِ الْمُسْتَحَقِّ بِالصَّلَاةِ عَلَى الْجِنَازَةِ، هَلْ هُوَ بِالصَّلَاةِ عَلَيْهَا خَاصَّةً، أَوْ بِمَا سِوَاهُ مَعَهُ مِنْ تَشْيِيعِهَا مِنْ مَنْزِلِهَا؟

﴿نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کا ثواب﴾

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْ أَتَى الْجِنَازَةَ عِنْدَ أَهْلِهَا فَمَشَى معها حَتَّى يُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتَّى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيرَاطَانِ مِثْلُ أُحُدٍ". (شرح مشکل الآثار: ۲۹۷/۳، ح: ۱۳۲۲، مسلم: ح: ۲۱۸۶)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام نے مسلمانوں کے درمیان باہمی الفت و محبت اور تعلق و ہمدردی کو بڑھانے اور اتحاد و اتفاق کو فروغ دینے کے لئے جن باتوں کی خاص طور پر تعلیم دی ہے، ان میں سے ایک جنازہ کے ساتھ جانا بھی ہے، جس میں جنازہ کی نماز پڑھنا، اس کو اٹھانا، کندھا دینا، قبرستان تک پہنچانا اور اس کی تدفین میں شرکت وغیرہ شامل ہے، الغرض حقوق اللہ کی طرح حقوق العباد کے ادا کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، اور ان حقوق العباد میں سے ایک

حق جنازہ کے ساتھ جانا بھی ہے، یعنی ایک مومن بندہ کا دوسرے مومن بندوں پر حق ہے کہ صلاۃ جنازہ میں شرکت کرے، اور اس حق کو ادا کرنے پر ایک قیراط کے برابر ثواب ملتا ہے جبکہ صرف نماز جنازہ میں شریک ہو تدفین میں شریک نہ ہو اور دو قیراط کے برابر جب تدفین تک جنازہ میں شریک رہا ہو جیسا کہ حدیث الباب میں ذکر ہے۔

تعارض:

باب کی پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیراط کا ثواب اس وقت حاصل ہوگا جب کہ میت کے گھر والوں کے ساتھ چل کر نماز جنازہ ادا کرے، جب کہ باب کی دوسری حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ سے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیراط کا ثواب محض نماز ادا کرنے سے حاصل ہو جائے گا، میت کے ساتھ چلنا وغیرہ شرط نہیں۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْ صَلَّى عَلَى جِنَازَةٍ فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ تَبِعَهَا حَتَّى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيرَاطَانِ، وَالْقِيرَاطَانِ مِثْلُ أُحُدٍ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۰۳)

اس اعتبار سے دونوں حدیث میں تعارض واقع ہے۔

دفع تعارض:

فی نفسہ ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیوں کہ تمام روایات میں جنازہ میں شرکت کے ساتھ جنازہ کے ساتھ چلنے کی بھی شرط ہے؛ لیکن اس کو بعض رواۃ نے نقل کیا ہے، اور بعض نے نہیں کیا، جیسا کہ اس عبارت سے بات واضح ہوتی ہے۔

لَيْسَ هٰذَا عِنْدَنَا بِتَضَادٍّ وَلٰكِنَّهُ عِنْدَنَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ عَلَى حِفْظِ بَعْضِ رُوَاتِهَا لِمَا أَغْفَلَهُ

بَقِيَّتُهُمْ، فَيَكُونُ الصَّحِيحُ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يَسْتَحِقُّ بِهِ ذَلِكَ الْقِيرَاطَ هُوَ بِالْمَشْيِ مَعَ الْجِنَازَةِ مِنْ أَهْلِهَا وَالصَّلَاةِ عَلَيْهَا ، وَيَكُونُ مَا سِوَى ذَلِكَ مِمَّا لَيْسَ فِيهِ ذِكْرُ الْمَشْيِ مَعَهَا إِغْفَالًا مِنْ رُوَاتِهَا ، وَمَنْ حَفِظَ شَيْئًا كَانَ حُجَّةً عَلَى مَنْ لَمْ يَحْفَظْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۰۵/۳)

سوال:

حدیث پاک میں مذکور قیراط سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بارے میں کوئی بات ذکر کی ہے؟ یعنی اس باب کی حدیث میں قیراط سے وہی مقدار مراد ہے جو عام احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مراد ہے؟

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: وَهَلْ جُزْءُ الْقِيرَاطِ مِنَ الشَّيْءِ الَّذِي هُوَ مِنْهُ جُزْءٌ مَعْلُومٌ مَوْجُودٌ فِي شَيْءٍ مِنَ الْآثَارِ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ (شرح مشکل الآثار: ۳۰۵/۳)

جواب:

اس سلسلہ میں امام طحاویؒ نے اولاً حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث پیش کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ دینار کنز ہے، درہم بھی، اور قیراط کنز ہے، صحابہ کرام نے استفسار کیا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! دینار و درہم کو ہم لوگ جانتے ہیں، یہاں ہمیں قیراط کی مقدار جاننا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نصف درہم، نصف درہم یعنی قیراط کی مقدار نصف درہم ہے۔ اس حدیث کو پیش کرنے کے بعد قیراط کے مفہوم کو دیت کے مسئلہ سے امام طحاویؒ نے مزید عیاں کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دیت کے لئے بنیادی معیار اونٹ کو بنایا گیا تھا، اور اونٹ کی قیمت میں اونچ نیچ ہوتی تھی، اس لئے دیت کی مقدار میں تفاوت ہوتا تھا، اسی طرح بعض علاقہ

میں ایک دینار بارہ (۱۲) دراہم کے برابر تھا، لیکن دوسرے علاقہ میں وہ دس (۱۰) دراہم کے برابر، اسی بناء پر دیت کی مقدار میں فقہاء کے مابین اختلاف ہوا؛ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اور امام شافعیؒ کے قول جدید کے مطابق دیت کی مقدار ایک ہزار (۱۰۰۰) درہم ہے، جب کہ دوسرے ائمہ کے یہاں بارہ سو (۱۲۰۰) درہم ہیں، گویا کہ ایک دینار بیس قیراط کے برابر تھا اور ایک قیراط نصف درہم کے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الدِّينَارُ كَنْزٌ، وَالدِّرْهَمُ كَنْزٌ، وَالْقِيرَاطُ كَنْزٌ" قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ: أَمَّا الدِّينَارُ وَالدِّرْهَمُ فَقَدْ عَرَفْنَاهُمَا فَمَا الْقِيرَاطُ؟ قَالَ: "نِصْفُ دِرْهَمٍ، نِصْفُ دِرْهَمٍ".

وَأَمَّا مَنْ يَجْعَلُ الدِّيَةَ مِنَ الْوَرِقِ عَشَرَةَ آلَافِ دِرْهَمٍ فَذَلِكَ عَلَى أَنَّ عَدْلَ الدِّينَارِ مِنَ الدَّرَاهِمِ كَانَ عِنْدَهُمْ عَشَرَةَ دَرَاهِمَ، وَعَلَى أَنَّ الْقَرَارِيطَ جُمْلَتُهَا الدِّينَارُ كَانَ عِنْدَهُمْ عِشْرِينَ قِيرَاطًا، وَكَانَ الْقِيرَاطُ مِنْهَا نِصْفَ دِرْهَمٍ، وَاللهُ أَعْلَمُ بِحَقِيقَةِ الْأَمْرِ كَانَ فِي ذَلِكَ.
(شرح مشکل الآثار: ۳/۳۰۶)

اسی طرح اس مسئلہ کی وضاحت ابوداود شریف کی درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: كانت قيمة الدية على عهد رسول الله صلى الله عليه و سلم ثمان مائة دينار أو ثمانية آلاف درهم ودية أهل الكتاب يومئذ النصف من دية المسلمين قال فكان ذلك كذلك حتى استخلف عمر رضي الله عنه فقام خطيبا فقال ألا إن الإبل قد غلت قال ففرضها عمر على أهل الذهب ألف دينار وعلى أهل الورق اثني عشر ألفا وعلى أهل البقر مائتي بقرة وعلى أهل الشاء ألفي شاة وعلى أهل الحلل مائتي حلة قال وترك دية أهل الذمة لم يرفعها فيما رفع من الدية الصلاة. (رواه ابوداود: رقم: ۴۵۴۲)

یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ دیت کی بنیاد اونٹ پر ہے، چنانچہ دیت میں سونا اور

چاندی کی جو مقدار بیان کی گئی ہے وہ اس زمانہ میں سو(۱۰۰) اونٹ کی قیمت کا حساب لگا کر بیان کی گئی تھی، اس لئے قولِ جدید کے مطابق امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اختلافِ قیمت کے اعتبار سے ان دونوں کی مقدار میں فرق ہوسکتا ہے۔

علامہ شمنی فرماتے ہیں کہ اس بارے میں جو فقہی مسئلہ ہے اور جس پر عمل ہے وہ یہ ہے کہ سونے کی دیت ایک ہزار دینار، چاندی کی دیت دس ہزار درہم، اور اونٹ کی دیت سو اونٹ ہیں؛ لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک چاندی کی دیت بارہ ہزار درہم ہے۔

قال الشمني: الدية من الذهب الف دينار ومن الفضة عشرة آلاف درهم ومن الابل مئة وقال الشافعي من الورق اثنا عشر ألفا... (مرقاة المفاتيح:۶۳/۷، الرقم:۳۴۹۸)

ومن الورق عشرة آلاف درهم حدثنا بذلك أبو حنيفة عن الهيثم عن الشعبي عن عمر قال: فقال: أهل المدينة: فرض عمر على أهل الورق اثنى عشر ألف درهم قال محمد بن الحسن صدقوا، ولكنه فرضها اثنى عشر ألفا وزن ستة، وذلک عشرة آلاف. (مرقاة المفاتيح:۵۷/۷، رقم الحديث:۳۴۹۸)

باب: ۱۹۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي كَسْرِ عَظْمِ الْمَيِّتِ

﴿اعضاء میت کا تقدس واحترام﴾

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كَسْرُ عِظَامِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِ عِظَامِ الْحَيِّ". (شرح مشكل الآثار: ۳۰۸/۳، ورواه أحمد: ۲۶۴/۶، ورواه عبدالرزاق (۶۲۵۶) وابوداود(۳۲۰۷) وابن ماجه: (۱۶۱۶)، ومالک فی الموطأ: ۱۵۱/۳، حديث:(۴۰) من كتاب الجنائز)

خلاصۃ الحدیث:

خالق کائنات نے انسان کو تمام مخلوق سے افضل اور بہتر بنایا ہے، اور اس کو وہ مقام عطا کیا ہے جو کسی اور کو نہیں ملا، اور نہ ہی قیامت تک ملے گا، چنانچہ باری تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾[بنی اسرائیل: ۷۰] بے شک ہم نے اولاد آدم کو فضیلت دی اور ان کو خشکی اور سمندر کی سواریاں دی۔

اس کے علاوہ دوسری جگہ پر انسان کی تخلیق کو اس طرح بیان کیا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾[تین: ۴] (ہم نے انسان کو بہترین سانچہ میں ڈھالا ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے نہ صرف انسان کی تعظیم وتکریم صرف ضروری قرار دی ہے، بلکہ اگر کوئی شخص بلاوجہ کسی شخص کی جان یا اس کے کسی عضو کو تلف کرتا ہے تو اس پر اس کا قصاص اور دیت کو لازم کیا ہے، یہاں تک کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی اس کی شرافت وعظمت کی پاسداری کرتے ہوئے زندہ انسان کے اعضاء کا مقام عطا کیا ہے، جیسا کہ حدیث الباب میں مذکور ہے کہ میت کی ہڈی توڑنے کا گناہ زندہ آدمی کی ہڈی توڑنے کے برابر ہے۔

اشکال:

یہاں بعض لوگوں نے یہ اشکال کیا ہے کہ زندہ انسان کی ہڈی کے مساوی مردہ انسان کی ہڈی کیسے ہوسکتی ہے؟ جب کہ دونوں میں بڑا فرق ہے، ہاں! جس کے پاس تاویل وتوجیہ حدیث کا فن اور علم نہیں ہے وہ دونوں کو یکساں قرار دیتے ہیں۔

فَقَالَ قَائِلٌ مِمَّنْ لَا عِلْمَ عِنْدَهُ بِتَأْوِيلِ أَحَادِيثِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

يَلْزَمُكُمْ بِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْ تَجْعَلُوا فِي كَسْرِ عِظَامِ الْمَوْتَى مِثْلَ الَّذِي تَجْعَلُونَهُ فِي كَسْرِ الْأَحْيَاءِ. (شرح مشکل الآثار: ۳۰۹/۳)

جواب:

امام طحاویؒ اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ یہاں حدیث الباب سے مقصود قصاص اور دیت کے وجوب کے سبب کو بیان کرنا نہیں ؛ بلکہ فی نفسہ انسان کی عظمت وتقدس کو نمایاں کرنا ہے، جس طرح انسان کا جسم اور تمام اعضاء حالت حیات میں محترم ہیں، ان کی پامالی درست نہیں، اسی طرح انسان کے تمام اعضاء مرنے کے بعد بھی محترم اور قابل تعظیم ہیں (اسی وجہ سے فی نفسہ اسلام میں پوسٹ مارٹم کی گنجائش نہیں ہے) اس لئے حدیث الباب میں میت کے اعضاء اور ہڈی کو زندہ انسان کی ہڈی کے مساوی قرار دیا گیا ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ: أَنَّ الَّذِي أَلْزَمَنَاهُ لَا يَلْزَمُنَا ؛ لِأَنَّا وَجَدْنَا عَظْمَ الْحَيِّ لَهُ حُرْمَةٌ ، وَفِيهِ حَيَاةٌ يَجِبُ عَلَى مَنْ كَانَ سَبَبًا لِإِخْرَاجِهَا مِنْهُ وَإِعَادَتِهِ مِنَ الْحَيَاةِ إِلَى الْمَوَاتِ مَا يَجِبُ عَلَيْهِ فِي ذَلِكَ مِنَ الْقِصَاصِ ، وَمِنْ أَرْشٍ وَكَانَ عَظْمُ الْمَيِّتِ لَا حَيَاةَ فِيهِ وَلَهُ حُرْمَةٌ ، فَكَانَ كَاسِرُهُ فِي انْتِهَاكِ حُرْمَتِهِ كَكَاسِرِ عَظْمِ الْحَيِّ فِي انْتِهَاكِ حُرْمَتِهِ . (شرح مشکل الآثار: ۳۱۰/۳)

اقوال المحدثین:

(۱) ملا علی قاریؒ، علامہ طیبیؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میت کی بے عزتی (توہین وتحقیر) کرنا ممنوع ہے، جس طرح زندہ شخص کی بے عزتی کرنا منع ہے، نیز ابن ملک کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ جس چیز سے زندہ شخص کو تکلیف ہوتی ہے، اس چیز سے میت کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔

قال الطیبی: إشارة الی أنه لا یهان میتا، کما لا یهان حیا، قال ابن الملك: والی ان المیت یتألم. (مرقاۃ المفاتیح: کتاب الجنائز، باب دفن المیت: ۱۷۰/۴، رقم: ۱۷۱۴)

(۲) مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ حافظ ابن حجرؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں: جس چیز سے زندہ لذت پاتا ہے اس چیز سے میت کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے۔

قال ابن حجر: من لوازمه أنه یستلذ بما یستلذ به الحيّ. (بذل المجهود: کتاب الجنائز، باب فی الحفار یجد العظم هل یتنکب ذلك المکان: ۱۰/ ۴۹۷، رقم: ۳۲۰۷)

باب: ۱۹۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَجْلِسِهِ ثُمَّ رَجَعَ إِلَيْهِ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ"

﴿مجلس کے آداب وحقوق﴾

۱۲۷۷ - حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ أَبِي دَاوُدَ، قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ سُلَيْمَانَ الْوَاسِطِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ، وَحَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ مَرْزُوقٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَفَّانُ بْنُ مُسْلِمٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ الْوَاسِطِيُّ، عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حَبَّانَ، عَنْ عَمِّهِ وَاسِعِ بْنِ حِبَّانَ، عَنْ وَهْبِ بْنِ حُذَيْفَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "الرَّجُلُ أَحَقُّ بِمَجْلِسِهِ، وَإِنْ بَدَتْ لَهُ حَاجَةٌ فَقَامَ إِلَيْهَا، ثُمَّ رَجَعَ فَهُوَ أَحَقُّ بِمَجْلِسِهِ". (شرح مشکل الآثار: ۳/ ۳۱۱، م-ح-۲۱۷۹-کتاب السلام، ت، ح-۲۷۵۱، ک-الادب، مسند أحمد: ج:۷، ح-۷۵۵۸، د-ح-۴۸۵۳،)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام دین فطرت ہے، اس کی تمام تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، اسلام

کو دیگر مذاہب پر اس لحاظ سے امتیازی مقام حاصل ہے کہ دوسرے مذاہب ایسے ضابطۂ حیات پیش کرنے سے قاصر ہیں، لیکن اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، مثلاً انسان فطری طور پر سماج میں رہنا، مل جل کر بیٹھنا اور اجتماعی معاملات میں مشورہ کرنا، پسند کرتا ہے، اور اس کے لئے مجالس کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے شریعت نے اور مذہب اسلام نے مجلس کے لئے چند آداب مقرر کیے ہیں، جن سے اہل ایمان کی محفلوں میں متانت وسنجیدگی قائم رہتی ہے، چنانچہ حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجلس ومحفل کا ایک ادب بیان کیا ہے کہ جب کوئی شخص مجلس سے اپنی جگہ چھوڑ کر دوبارہ واپس ہونے کے ارادہ کے ساتھ کھڑا ہو تو جب وہ اپنا کام مکمل کر کے آئے گا تو اس جگہ کا مستحق وہی شخص ہوگا۔

اشکال:

سائل نے یہ سوال کیا ہے کہ مذکورہ حدیث کے مطلق ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ بھی مستنبط ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی ضرورت سے اپنی جگہ چھوڑ کر دور دراز چلا جائے، اور طویل مدت تک واپس آنے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے باوجود واپس آنے کے بعد اسی شخص کو اپنی اس جگہ کا استحقاق ہونا چاہئے، تو سوال یہ ہے کہ کیا حدیث کا معنی اپنے اطلاق کی وجہ سے عام ہے یا نہیں؟

فَقَالَ قَائِلٌ: أَفَيَكُونُ هَذَا دَلِيلًا عَلَى أَنَّ مَنْ قَامَ مِنْ مَجْلِسِهِ، ثُمَّ عَادَ إِلَيْهِ بَعْدَ يَوْمٍ أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ أَنَّهُ أَحَقُّ بِهِ مِمَّنْ سِوَاهُ مِنَ النَّاسِ...... (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۱۳)

جواب:

امام طحاویؒ شیخ خلیل احمد سہارنپوریؒ اور دیگر محدثینؒ فرماتے ہیں کہ مجلس سے اٹھنے والے کا استحقاق اپنی سابقہ جگہ پر اس وقت رہتا ہے جب کہ دوبارہ لوٹنے کا ارادہ ہو یا مختصر کام کی غرض سے اٹھا ہو، مثلاً وضو یا کسی عارضی امر وغیرہ، ان دو شرطوں کے پائے جانے کے بعد وہ شخص اپنی

سابقہ جگہ کا مستحق ہوگا، حتی کہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص آکر اس جگہ پر بیٹھ گیا ہو تو اس کو اس جگہ سے ہٹانا درست ہوگا، یہ سابقہ جگہ پر استحقاق کے باقی رہنے کا حکم اس صورت میں ہے جبکہ وہ جگہ مجالس عامہ میں سے ہو، مثلاً مساجد، صحراء وغیرہ ہو، (جہاں سے وہ شخص اٹھ کر گیا ہے) لیکن اگر کسی کی خاص ملکیت ہو تو مالک ہی اس جگہ کا حقدار اور مستحق ہوگا۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ: أَنَّ ذَلِكَ مِمَّا نُحِيطُ عِلْمًا أَنَّهُ لَمْ يُرِدْ بِهِ الْعَوْدَ الَّذِي بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِيَامِ عَنْ ذَلِكَ الْمَوْضِعِ الَّذِي أُرِيدَ الْعَوْدُ إِلَيْهِ الْمُدَّةُ الَّتِي ذَكَرَ، وَلَكِنَّهُ عَلَى الْعَوْدِ إِلَى الْمَجْلِسِ الَّذِي قَامَ عَنْهُ صَاحِبُهُ الْقِيَامَ الَّذِي لَمْ يُرِدْ بِهِ تَرْكَهُ، إِنَّمَا قَامَ لِأَمْرٍ عَرَضَ لَهُ عَلَى أَنْ يَعُودَ إِلَيْهِ فَيَرْجِعَ إِلَى الْجُلُوسِ فِيهِ كَمَا كَانَ قَبْلَ قِيَامِهِ عَنْهُ، فَإِذَا كَانَ كَذَلِكَ كَانَ أَحَقَّ بِمَجْلِسِهِ ذَلِكَ، وَإِذَا كَانَ بِخِلَافِهِ لَمْ يَكُنْ كَذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۳، تحفۃ الاحوذی: ج:۸، ص:۲۲، فتح الملھم: ج۱۰، ص:۲۴۵، بذل المجھود: ج۱۳، ص:۲۷۱)

باب: ۲۰۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "لَا صَرُورَةَ فِي الْإِسْلَامِ"

﴿اسلام میں صرورت کا تصور﴾

۱۲۸۲ - حَدَّثَنَا صَالِحُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْحَارِثِ الْأَنْصَارِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ الْأَزْرَقُ قَالَ: حَدَّثَنَا عِيسَى بْنُ يُونُسَ، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ عمرو بْنِ عَطَاءٍ -قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَهُوَ ابْنُ أَبِي الْخُوَارِ- عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا صَرُورَةَ فِي الْإِسْلَامِ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۱۴، أبوداود: ج:۲، ص: ۲۴۰، ح:۱۷۱۹، مسند أحمد: ج:۱، ص:۳۱۲، قدیم، مشکوۃ المصابیح: ح-۲۵۲۲)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں جو پہلا گھر بنایا وہ کعبۃ اللہ ہے، کعبہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتا ہے، انسان یہاں پہنچ کر ایک قلبی سکون اور روحانی مسرت محسوس کرتا ہے، اسی لئے اسلام میں دو عبادتیں ایسی ہیں جن کا کعبۃ اللہ سے خاص تعلق ہے، ایک حج ہے جو سوائے مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات کے علاوہ کہیں اور ادا نہیں کیا جا سکتا:
دوسری عبادت عمرہ ہے جس میں انسان کو زیارتِ حرم شریف کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

الغرض حج وعمرہ یہ دو عبادتیں ایسی ہیں جو سبھی کو اجتماعیت واتحاد کا درس دیتی ہیں، رنگ ونسل کا کوئی امتیاز نہیں، اسی طرح قرآن وحدیث میں حج وعمرہ کی بڑی فضیلت اور حکمتیں بیان کی گئی ہیں، بہر حال حج اسلام کا بنیادی رکن ہے، جو صاحب استطاعت پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث الباب میں فرمایا کہ ہر صاحب استطاعت کو حج کرنا چاہیئے، تا کہ اسلام میں کوئی شخص حج کے بغیر باقی نہ رہے حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا کہ جو شخص حج کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور حج نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں۔

سوال:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام میں جس ''صرورة'' سے منع فرمایا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ بالفاظ دیگر حدیث کا کیا مفہوم ہے؟

فَتَأَمَّلْنَا هَذَا الْحَدِيثَ لِنَقِفَ عَلَى الصَّرُورَةِ الَّتِي نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ تَكُونَ فِي الْإِسْلَامِ مَاهِيَ؟. (شرح مشکل الآثار: ۳/۶ ۳۱)

جواب:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث میں زمانۂ جاہلیت

کے ایک عمل کی تردید ہے، اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہ عمل رائج تھا کہ اگر کوئی شخص کسی پر جنایت کرتا مثلاً ناحق کسی کو قتل کر دیتا تو وہ جانی حرم میں جا کر پناہ لیتا اور اگر ولیٔ دم اس جانی سے تعرض کرتا اور انتقام کا ارادہ کرتا تو لوگ یوں کہہ دیتے کہ ارے بھائی! یہ شخص تو صرورۃ ہے، یعنی اس نے ابھی تک ایک بھی حج نہیں کیا، لہذا اس کو ابھی چھوڑ دو، حج کرنے دو اس کے بعد قصاص لے لینا، خلاصہ یہ ہے کہ حج نہ کرنا کوئی عذرِ معتبر نہیں جو مانع ہو حدود و قصاص سے، اس لئے اس عمل کی تردید فرمائی۔

فَوَجَدْنَا فِي حَدِيثِ فَهْدٍ عَنْ أَبِي نُعَيْمٍ الَّذِي قَدْ رَوَيْنَاهُ فِي هَذَا الْبَابِ مِنْ كَلَامِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ الرَّجُلَ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ يَلْطِمُ وَجْهَ الرَّجُلِ، وَيَقُولُ: إِنَّهُ صَرُورَةٌ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۱۶)

قیل: اراد من قتل فی الحرم قتل، ولا یقبل قوله: انی صرورة، ما حججت، (ولا عرفتُ) حرمة الحرم، کان الرجل فی الجاهلية إذا أحدث حدیثا فلجأ الی الکعبة لم یُهَجْ فکان اذا لقیه ولی الدم فی الحرم قیل له: هو صرورة فلا تهجه. (بذل المجهود: ح:۱۷۲۹)

اقوال المحدثین:

علماء نے ایک اور تشریح کی ہے کہ ''صرورۃ'' یعنی ''الذی لم یتزوج'' (وہ شخص جس نے بغیر عذر کے قصداً نکاح نہ کیا ہو)، حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام میں کوئی شخص ایسا نہ ہونا چاہئے کہ جو قصداً بغیر عذر کے تارکِ نکاح ہو، کیوں کہ نکاح طریق سنت ہے اور ترکِ نکاح رہبانیت ہے، اس لئے ہمیں سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے نا کہ رہبانیت کا، ہاں! اگر کوئی مانع یا عذر ہو تو وہ امر آخر ہے۔

وقیل: المراد بالصرورة التبتل وترك النكاح ای لیس فی الإسلام بل هو فی

الرهبانية. (مرقاۃ المفاتیح: ج:۵،ص:۳۹۷،ح:۲۵۲۲)

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حج پر استطاعت کے باوجود کوئی حج نہ کرے تو وہ کامل مسلمان نہیں، فدل ظاهره على ان من يستطيع الحج ولم يحج ليس بمسلم كامل. (مرقاۃ المفاتیح: ۳۹۷/۵)

سوال:

کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محض لفظِ ''صرورة'' استعمال کرنے سے منع کیا ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اسلام میں غیر حاجی باقی نہ رہے؟

فَكَانَ فِي ذَلِكَ تَحْقِيقُ مَا ذَكَرْنَا. ثُمَّ احْتَجْنَا أَنْ نَقِفَ عَلَى إِبَاحَةِ هَذَا الِاسْمِ وَاسْتِعْمَالِهِ فِي مَنْ لَمْ يَحُجَّ أَوْ فِي كَرَاهَتِهِ، وَالنَّهْيِ عَنِ اسْتِعْمَالِهِ فَوَجَدْنَا فِي حَدِيثِ صَالِحِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الَّذِي قَدْ رَوَيْنَاهُ فِي هَذَا الْبَابِ قَوْلَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا صَرُورَةَ فِي الْإِسْلَامِ" فَاحْتُمِلَ أَنْ يَكُونَ ذَلِكَ يُرَادُ بِهِ النَّهْيُ عَنْ هَذَا الْقَوْلِ فِي الْإِسْلَامِ، وَاحْتُمِلَ أَنْ يَكُونَ يُرَادُ بِهِ: أَنْ لَا يَبْقَى فِي الْإِسْلَامِ أَحَدٌ حَتَّى يَحُجَّ. (شرح مشکل الآثار: ۳۱۷/۳)

جواب:

امام طحاویؒ نے فرمایا کہ "لَا صَرُورَةَ فِي الْإِسْلَامِ" سے مراد اسلام میں لفظ ''صرورة'' کہنا مکروہ ہے، اس لئے کہ حدیث پاک میں ہے قال عبدالله: لا يقولن احدكم: انی صرورة، فان المسلم ليس بصرورة. تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں ''صرورہ'' ہوں اس لئے کہ مسلمان ''صرورہ'' نہیں ہوتا۔ (رواہ الطبرانی: ح:۸۹۳۰)

دوسری دلیل یہ ہے کہ کلامِ عرب میں ''صرورة'' کسی کام کے کرنے نہ کرنے پر اصرار

کرنے کو کہتے تھے، اب اگر کوئی اپنے کسی عارضی عذر کی وجہ سے (جس کی وجہ سے حج کی فرضیت ساقط ہوجائے) حج کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کو صرورہ نہیں کہیں گے، اس لئے کہ وہ حج نہ کرنے پر اصرار کرنے والا نہیں ہے؛ بلکہ عذر کی وجہ سے شریعت کی طرف سے وہ فریضہ ساقط ہوگیا ہے، الغرض اگر حج نہ کرنے والے کو صرورہ کہا جانا درست ہوتا تو (اس معذور) حج نہ کرنے والے کو بھی صرورہ کہتے؛ حالانکہ اس کو کوئی صرورہ نہیں کہتا، اس لئے کہ وہ مصر علی الشی نہیں ہے، بہرحال مذکورہ دو دلیل سے معلوم ہوا کہ لفظ صرورہ کہنا مکروہ ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ مراد نہیں ہے کہ اسلام میں کوئی بھی شخص غیر حاجی باقی نہیں رہے گا، بلکہ چند معذور اشخاص ایسے ہونگے جو حج کی ادائیگی پر قادر نہیں ہونگے وہ غیر حاجی ہوں گے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَهَذَا أَوْلَى عِنْدَنَا ؛ لِأَنَّ الصَّرُورَةَ فِي كَلَامِ الْعَرَبِ هُوَ الصَّرُّ عَلَى الشَّيْءِ، وَمِنْهُ قَوْلُ اللهِ جَلَّ وَعَزَّ: ﴿وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [آل عمران: ۱۳۵] فَمَنْ كَانَ تَخَلُّفُهُ عَنِ الْحَجِّ لَيْسَ لِإِصْرَارِهِ عَلَى أَنْ لَا يَحُجَّ ، وَإِنَّمَا هُوَ لِعَجْزٍ أَوْ لِمَا أَشْبَهَهُ مِمَّا يَسْقُطُ بِهِ فَرْضُ الْحَجِّ عَنْهُ ، فَلَيْسَ صَاحِبُهُ بِمُصِرٍّ الْإِصْرَارَ الْمَذْمُومَ ، وَإِذَا لَمْ يَكُنْ مُصِرًّا لَمْ يَكُنْ صَرُورَةً. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۱۹)

باب: ۲۰۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمُرَادِ بِقَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ [النساء: ۱۱]

﴿مورث کی جائداد میں بیٹیوں کا حق﴾

۱۲۵۸ - حَدَّثَنَا يُونُسُ بْنُ عَبْدِ الْأَعْلَى، قَالَ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ سَعِيدِ بْنِ شَدَّادٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَقِيلٍ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ:

جَاءَتِ امْرَأَةُ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ بِابْنَتَيْهَا مِنْ سَعْدٍ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، هَاتَانِ ابْنَتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ قُتِلَ أَبُوهُمَا مَعَكَ يَوْمَ أُحُدٍ شَهِيدًا ، وَإِنَّ عَمَّهُمَا أَخَذَ مَالَهُمَا فَاسْتَفَاءَهُ فَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالًا ، وَلَا يُنْكَحَانِ إِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ ، فَقَالَ: "سَيَقْضِي اللهُ فِي ذَلِكَ" فَأَنْزَلَ اللهُ آيَةَ الْمِيرَاثِ، فَبَعَثَ إِلَى عَمِّهِمَا فَقَالَ: "أَعْطِ ابْنَتَيْ سَعْدٍ الثُّلُثَيْنِ وَأَعْطِ أُمَّهُمَا الثُّمُنَ وَلَكَ مَا بَقِيَ". (شرح مشکل الآثار: ج:۳،ب: ۲۰۱، ص: ۳۲۰، ح: ۱۲۸۵ ،سنن الترمذی: ۲۰۹۱ ،سنن ابن ماجه: ۲۷۲۰، سنن أبی داود: ۲۸۹۱)

خلاصۃ الحدیث:

عورت کو جو عزت ، رتبہ اور مقام اسلام میں حاصل ہے ،وہ کسی اور مذہب میں نہیں جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ ایک عرصہ دراز سے عورت مظلوم چلی آرہی تھی ، ہر قوم ، ہر خطہ میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں عورتوں پر ظلم کے پہاڑ نہ توڑے گئے ہوں ، اہل عرب تو نفس عورت کے وجود کو ہی موجب عار سمجھتے ، اور لڑکیوں کو زندہ درگور کردیتے ، الغرض ان تمام مظالم میں سے ایک ظلم یہ بھی تھا کہ عورت کو ترکہ سے محروم کردیا جاتا تھا ، لیکن اسلام نے عورت کو عزت بخشی اور اس کے تمام حقوق کی ادائیگی کو لازم کیا ، حتی کہ ترکہ میں سے بھی اس کا حصہ متعین کیا ، جیسا کہ ابتداء اسلام کا ایک واقعہ ہے جس کو حدیث الباب کے تحت صاحب کتاب نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ جنگ احد میں شہید ہوگئے ، تو ان کے ترکہ پر ان کے بھائیوں نے زمانۂ جاہلیت کے مطابق قبضہ کرلیا ، تب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی اس مقدمہ کو لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ سعد تو جنگ میں شہید ہوگئے اور ان کے ترکہ پر ان کے بھائی نے قبضہ کرلیا ہے؛ جبکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دو بیٹیاں ہیں جن کا نکاح بغیر مال و دولت کے ممکن نہیں ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس بارے میں اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ، چنانچہ میراث کی آیت نازل ہوئی ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ [النساء: ۱۱] (اور اگر لڑکیاں دو سے زائد ہوں تو ان لڑکیوں کو

دو تہائی ملے گا اس مال کا جو مورث چھوڑ کر مرا ہے)، صاحب کتاب نے اس آیت کے تحت یہاں اس باب کو قائم کر کے اس میں ہونے والے اختلاف کو واضح کیا ہے، نیز میراث کے ایک اہم مسئلہ کو بھی۔

اشکال:

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو سے زائد لڑکیوں کا حکم بیان فرمایا ہے، مگر مطلق دو لڑکیوں کے سلسلہ میں صراحۃً کوئی حکم نہیں فرمایا، اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ دو بیٹیوں پر بھی نصف کا حکم لگاتے ہیں، لیکن اس کے بعد جمہور ائمہ نے دو اور دو سے زائد کے لئے ثلثان کا حکم لگایا ہے جو بظاہر آیت کے خلاف معلوم ہو رہا ہے تو اس کی کیا توجیہ ہوگی؟

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَتَأَمَّلْنَا قَوْلَهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ [النساء: ۱۱] فَكَانَ ظَاهِرُهُ عَلَى أَنَّ الثُّلُثَيْنِ فِي هَذِهِ الْآيَةِ إِنَّمَا جُعِلَ لِمَنْ فَوْقَ الِاثْنَتَيْنِ مِنَ الْبَنَاتِ لَا الِاثْنَتَيْنِ مِنْهُنَّ، ....وَهَذَا قَوْلٌ لَمْ نَجِدْهُ عِنْدَ أَحَدٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِوَى عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ. (شرح مشکل الآثار: ج:۳/۳۲۲-۳۲۱)

جواب:

جمہور ائمہ کا نظریہ یہ ہے کہ دو اور دو سے زیادہ بیٹیاں ثلثان کی مستحق ہوں گی، اس لئے کہ ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ ''نساء'' اثنین کے معنی میں ہے، لفظ (فوق) صلہ ہے، جیسا کہ سورہ انفال میں ہے ﴿فاضربوا فوق الاعناق﴾ 'اضربوا الاعناق' کے معنی میں ہے، اس لئے کہ گردن سے اوپر سر کا حصہ شمار ہوتا ہے، لہذا ''فوق الاعناق سے مکمل گردن مراد ہوگی، اسی طرح (فوق اثنتین) سے ''اثنتین'' اور اس کے مافوق تمام مراد ہوں گی، اسی بنا پر ''اثنتین'' اور ''فوق اثنتین'' دونوں ثلثان کی مستحق ہوں گی۔

وَوَجَدْنَا قَوْلَ فُقَهَاءِ الْأَمْصَارِ مِنْ بَعْدِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ إِلَى يَوْمِنَا هَذَا عَلَى خِلَافِ مَا رُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيهِ... (شرح مشکل الآثار: ج:۳/۳۲۲)

دوسری دلیل:

اسی طرح سورۂ نساء کی اخیری چند آیات پر غور کرنے سے جمہور کا نقطۂ نظر مزید واضح ہوجاتا ہے۔

﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ [النساء:۱۷۶] (شرح مشکل الآثار: ج:۳/۳۲۲) (لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے، اگر کوئی شخص مرجاوے جس کی اولاد نہ ہو، اور اس کی ایک عینی بہن ہو تو اس کو تمام ترکہ کا نصف ملے گا، اگر بہنیں دو ہوں تو ان کو کل ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔)

مذکورہ آیت میں تنہا ایک بہن کو بیٹی کی طرح نصف ملا ہے اور دو بہنوں کے لئے صراحۃً ثلثان بیان کیا گیا، اب غور کریں کہ جب دو بہنوں کے لئے ثلثان ہے، تو بیٹی کا رشتہ بہن کے رشتہ سے زیادہ قوی ہوتا ہے، اس لئے دو بہنوں کے مقابلہ میں دو بیٹیاں ثلثان کی زیادہ مستحق ہوں گی، واللہ اعلم۔۔

وَوَجَدْنَا مَا قَدْ دَلَّ عَلَى مَا قَالُوا مِنْ تَوْرِيثِهِمُ الْبِنْتَيْنِ الثُّلُثَيْنِ مَا فِي آخِرِ السُّورَةِ الْمَذْكُورَةِ فِيهَا هَذِهِ الْآيَةُ ، وَهِيَ سُورَةُ النِّسَاءِ وَهِيَ قَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ [النساء:۱۷۶]
(شرح مشکل الآثار: ج:۳/۳۲۲)

اقوال المفسرین:

(۱) امام رازیؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعدؓ کی دونوں بیٹیوں کو ثلثان عطاء کیا تھا، لہذا اس روایت سے اثنتین کے لئے ثلثان ثابت ہو گیا۔

والرابع: أنا ذكرنا في سبب نزول هذه الآية أنه عليه الصلاة والسلام اعطى بنتى سعد بن الربيع الثلثين وذلك يدل على ماقلنا. (تفسیر رازی: ج۹، ص:۲۱۳)

(۲) صاحب معارف القرآن فرماتے ہیں کہ جاننا چاہئے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ بیان فرمایا ہے، لیکن دولڑکیوں کا حصہ صراحۃً بیان نہیں فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت "للذكر مثل حظ الأنثيين" سے معلوم ہو چکا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے، یعنی دو تہائی ہے تو لامحالہ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ دولڑکیوں کا حصہ دو تہائی ہے۔ (معارف القرآن: ج:۲، ص:۱۵۲)

باب: ۲۰۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "مَنْ أَشَارَ بِحَدِيدَةٍ إِلَى أَحَدٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يُرِيدُ بِهَا قَتْلَهُ فَقَدْ وَجَبَ دَمُهُ"

﴿بے قصور شخص کو اسلحہ سے اشارہ کرنے پر سزا کا بیان﴾

۱۲۸۷ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِسْحَاقَ الْكُوفِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ أَبِي مَرْيَمَ، قَالَ: حَدَّثَنِي سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ، قَالَ: حَدَّثَنِي عَلْقَمَةُ، - يَعْنِي: ابْنَ أُمِّ عَلْقَمَةَ عَنْ أُمِّهِ - عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "مَنْ أَشَارَ بِحَدِيدَةٍ إِلَى أَحَدٍ مِنَ

الْمُسْلِمِينَ يُرِيدُ قَتْلَهُ فَقَدْ وَجَبَ دَمُهُ ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۲۳،مسند احمد: ج:۱۸،ص: ۱۸۱،ح۲:۱۱۶۱۲)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام تکریم انسانیت کا دین ہے، یہ اپنے ماننے والوں کو نہ صرف امن وامان صبر وتحمل اور بقاء باہمی کی تعلیم دیتا ہے، بلکہ ایک دوسرے کے عقائد ونظریات کا احترام بھی سکھاتا ہے، اور بلاتفریق رنگ ونسل تمام انسانوں کے قتل کی سختی سے ممانعت کرتا ہے، اسلام میں کسی انسانی جان کی قدر وقیمت اور حرمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بغیر کسی وجہ کے ایک فرد کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾ [مائدہ: ۳۲] اسی بنا پر فولادی اور آتشی اسلحہ سے لوگوں کو قتل کرنا بہت بڑا جرم قرار دیا ہے، یہاں تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مسلمان بھائی کی طرف اسلحہ سے اشارہ کرنے سے بھی منع فرمایا ہے، صاحب کتاب نے جہاں اس باب کو قائم کر کے اسی مسئلہ کو واضح کیا ہے، وہیں حدیث الباب پر ہونے والے اشکال کا جواب بھی دیا ہے۔

سوال:

حدیث الباب میں " مَنْ أَشَارَ بِحَدِيدَةٍ إِلَى أَحَدٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يُرِيدُ قَتْلَهُ فَقَدْ وَجَبَ دَمُهُ " ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی طرف قتل کے ارادہ سے ہتھیار سے اشارہ کرے تو مشارٌ الیہ کے لئے اس کا خون بہانا دفعاً جائز ہے،سوال یہ ہے کہ یہاں وجوب دم سے کیا مراد ہے؟

فَتَأَمَّلْنَا قَوْلَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَدِيثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا

”مَنْ أَشَارَ بِحَدِيدَةٍ إِلَى أَحَدٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يُرِيدُ بِهَا قَتْلَهُ فَقَدْ وَجَبَ دَمُهُ“ مَا ذَلِكَ الْوُجُوبُ؟
(شرح مشکل الآثار:۳/۳۲۵)

جواب:

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ قرض کی مدت مکمل ہونے کے بعد قرض خواہ کہتا ہے: وجب دَيني علی فلان (فلاں شخص پر میرا قرض واجب ہوگیا) دراصل لغت عرب میں ”وجب دینی حلّ دینی“ کے معنی میں ہے، اسی طرح حدیث الباب میں فقد وجب دم (اس کا دم واجب ہوگیا) فقد حل له دمه (اس شخص کے لئے اس کو قتل کرنا حلال ہوگیا) کے معنی میں ہے جیسا کہ امام طحاویؒ نے اس کی صراحت کی ہے:

فَرَأَيْنَا الرَّجُلَ يَقُولُ: قَدْ وَجَبَ دَيْنِي عَلَى فُلَانٍ، يَعْنِي: دَيْنَهُ الَّذِي كَانَ آجِلًا فَحَلَّ لَهُ عَلَيْهِ، بِمَعْنَى قَوْلِهِ: قَدْ حَلَّ دَيْنِي عَلَى فُلَانٍ، فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ قَوْلَهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ ”فَقَدْ وَجَبَ دَمُهُ“ أَيْ: فَقَدْ حَلَّ دَمُهُ....... (شرح مشکل الآثار:۳/۳۲۵)

اشکال:

مذکورہ سوال کے جواب پر اشکال ہوتا ہے کہ اگر ”وجب دمه“ ”حل دمه“ کے معنی میں ہے تو حدیث میں ”حل دمه“ کیوں نہیں فرمایا؟

فَقَالَ قَائِلٌ: فَلِمَ لَمْ يَقُلْ: فَقَدْ حَلَّ لَهُ دَمُهُ؟...... (شرح مشکل الآثار:۳/۳۲۵)

جواب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی بھی قول مصلحت سے خالی نہیں، بل کہ اس میں امت کا بڑا فائدہ مضمر ہوتا ہے، اس لئے (فقد وجب دمه) فرما کر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حکم کو عام کردیا

ہے، کیوں کہ بسا اوقات جس شخص کی طرف اسلحہ سے اشارہ کیا جاتا ہے وہ اپنا دفاع نہیں کر پاتا کمزوری یا کسی اور وجہ سے، ایسے موقع پر وہاں موجود تمام لوگوں پر ضروری ہوجاتا ہے کہ مظلوم کی مدد کریں اور اگر ظالم کو انجام تک پہنچانے کی ضرورت ہو تو دریغ نہ کریں۔ واللہ المؤفق۔۔

قِيلَ لَهُ:؛ لِأَنَّ قَتْلَهُ قَدْ حَلَّ لِلَّذِي أُشِيرَ إِلَيْهِ بِالْحَدِيدَةِ وَلِمَنْ سِوَاهُ مِنَ النَّاسِ مِمَّا يُحَاوِلُ دَفْعَهُ عَنْهُ وَيَمْنَعُ وُقُوعَ سِلَاحِهِ بِهِ , أَلَا تَرَى أَنَّ الَّذِي أُشِيرَ إِلَيْهِ بِالْحَدِيدَةِ لَوْ ...... (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۲۵)

(حدیث الباب سے مستخرج مسائل اور فقہاء کا اختلاف)

احناف کا نظریہ:

اگر کوئی شخص کسی کی طرف قتل کے ارادہ سے اسلحہ سے اشارہ کرے، مبادا مشارٌ الیہ کے کسی عضو کو تلف کردے تو ایسی صورت میں مشارٌ الیہ کے لئے اس سے انتقام لینا جائز ہوگا جیسا کہ حدیث الباب میں ہے (اگر کوئی شخص کسی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرے تو اس کا خون حلال ہوجائے گا) حدیث الباب میں جب مطلقاً اشارہ کرنے سے منع کیا گیا ہے تو نقصان پہنچانے کے بعد بدرجہ اولی اس (اشارہ کرنے والے سے) بدلہ لینا جائز ہوگا؛ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت سے یہ مسئلہ مزید واضح ہوجاتا ہے جس کو امام طحاویؒ نے نقل کیا ہے:

كَمَا حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَبَّاسِ بْنِ الرَّبِيعِ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَعْبَدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا يَعْقُوبُ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ فِي رَجُلٍ شَهَرَ السِّلَاحَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ قَالَ: " حَقٌّ عَلَى الْمُسْلِمِينَ أَنْ يَقْتُلُوهُ ، وَلَا شَيْءَ عَلَيْهِمْ ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۲۶)

اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرے، تو مسلمانوں پر ضروری ہے

کہ اس کو قتل کر دیں اور اس کے عوض ان پر قصاص بھی واجب نہیں ہوگا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی مجنون کسی کی طرف اسلحہ سے اشارہ کرے اور مشار الیہ اس مجنون کو قتل کر دے، تو اس شخص پر مجنون کی دیت واجب ہوگی، اس لئے کہ اگر مجنون شخص کسی کو قتل کرتا ہے تو اس پر قصاص واجب نہیں ہوتا، اور نہ ہی بدلہ کے طور پر اس کو قتل کرنا درست ہوتا ہے، تو محض اشارہ کرنے سے بدرجہ اولیٰ اس کو قتل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

وَذَهَبُوا إِلَى أَنَّ الْمَجْنُونَ الَّذِي ذَكَرْنَا لَوْ تَمَّ مَا أَشَارَ بِهِ فِي الَّذِي أَشَارَ بِهِ إِلَيْهِ لَمْ يَحِلَّ لَهُ بِهِ دَمُهُ، فَلَمَّا كَانَ دَمُهُ لَا يَحِلُّ لَهُ بِإِمْضَائِهِ مَا أَشَارَ بِهِ إِلَيْهِ فِيهِ كَانَ بِإِشَارَتِهِ إِلَيْهِ أَحْرَى أَنْ لَا يَحِلَّ لَهُ بِذَلِكَ دَمُهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۲۶)

حضرت فضل بن موسیٰ کا نظریہ:

اسی طرح حضرت فضل بن موسیٰ کا نظریہ یہ ہے کہ: اگر کوی شخص کسی کی طرف تلوار سے اشارہ کرے اور اس کے کسی عضو کو کاٹ کر تلوار نیام میں رکھ لے، اور مشار الیہ کسی طرح اس کو قتل کر دے تو مشار الیہ پر کچھ واجب نہ ہوگا، اور اشارہ کرنے والے کا خون رائیگا ہوگا، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث میں ذکر ہے: "من شهر سيفه ثم وضعه فدمه هدر" جو شخص کسی کی طرف تلوار سے اشارہ کرے پھر اس کو نیام میں رکھ لے تو اس کا خون رائیگا ہوگا۔

البتہ امام ابوحنیفہ کا نظریہ اس کے برعکس ہے، ان کا نظریہ یہ ے کہ اگر کوئی شخص کسی کی طرف تلوار سے اشارہ کرے، اور مشار الیہ کے کسی عضو کو کاٹ کر تلوار نیام میں رکھ لے، اب اگر مشار الیہ کسی طرح اس شخص کو قتل کر دے تو اس کا قتل کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ اس پر دیت واجب ہوگی۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

امام ابوحنیفہؒ کے مذکورہ نقطۂ نظر پر اعتراض ہوتا ہے کہ آپ کا نظریہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہے؟ چنانچہ امام طحاویؒ مذکورہ اشکال کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ احناف کا مذہب مذکورہ حدیث کے خلاف نہیں، اس لئے کہ اشارہ کرنے والے نے کسی عضو کو کاٹ کر تلوار کو نیام میں رکھ لیا، لہٰذا اب قتل کا ارادہ ثابت نہیں ہوا، ایسی صورت میں مشار الیہ کے لئے اس کو قتل کرنا درست نہیں؛ ہاں اگر وہ قتل کر دیتا ہے تو اس پر بھی قصاص واجب ہوگا۔

وَلَيْسَ هَذَا عِنْدَنَا مِنْ مَذْهَبِهِ هَذَا وَاللهُ أَعْلَمُ خِلَافًا لِهَذَا الْحَدِيثِ، وَلَكِنَّهُ عَلَى أَنَّ الشَّاهِرَ عَلَيْهِ السَّيْفَ لَمَّا قَطَعَ يَدَهُ كَفَّ عَنْ إِشْهَارِهِ إِيَّاهُ عَلَيْهِ، فَحَرُمَ بِذَلِكَ قَتْلُهُ عَلَى الَّذِي شَهَرَ عَلَيْهِ، فَأَمَّا إِذَا كَانَ بَعْدَ قَطْعِهِ يَدَهُ عَلَى مَا كَانَ عَلَيْهِ مِمَّا شَهَرَ بِهِ سَيْفَهُ عَلَيْهِ فَهُوَ بِذَلِكَ فِي حُكْمِهِ قَبْلَ قَطْعِهِ يَدَهُ وَفِي أَسْوَأِ حَالٍ مِنْهُ وَمَعْقُولٌ فِيهِ أَنَّ حِلَّ دَمِهِ لَهُ حِينَئِذٍ فَوْقَ حِلِّ دَمِهِ لَهُ قَبْلَ قَطْعِ يَدِهِ وَاللهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ.. (شرح مشکل الآثار:۳/۳۲۷)

باب: ۲۰۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الَّذِي عَضَّ ذِرَاعَ رَجُلٍ فَانْتَزَعَهَا فَسَقَطَتْ ثَنِيَّتَا الْعَاضِّ

﴿جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت میں دفاعی اعمال پر دیت نہیں﴾

۱۲۹۱ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مَعْبَدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ بْنُ عَطَاءٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا سَعِيدٌ وَهُوَ ابْنُ أَبِي عَرُوبَةَ عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ زُرَارَةَ بْنِ أَوْفَى، عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ رَجُلًا عَضَّ آخَرَ عَلَى ذِرَاعِهِ فَجَذَبَهَا، فَانْتَزَعَتْ ثَنِيَّتَاهُ، فَرُفِعَ ذَلِكَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ:

" أَرَدْتَ أَنْ تَأْكُلَ أَوْ تَقْضَمَ- شَكَّ سَعِيدٌ- لَحْمَ أَخِيكَ كَمَا يَأْكُلُ أَوْ يَقْضَمُ الْفَحْلُ " فَأَبْطَلَهَا.(شرح مشکل الآثار: ۳۲۸/۳، بخاری: ح:۲۸۹۲،ومسلم : ح:۱۶۷۳ نحوه،ابن ماجه: ح: ۲۶۵۷)

خلاصۃ الحدیث:

ایمان ''امن'' سے اور اسلام ''سلم'' سے مشتق ہے، اس لئے دونوں امن وسلامتی کا سرچشمہ ہیں، اور انسانوں کے مابین محبت کو فروغ دینے والا مذہب اسلام ہے، اور جس ظلم وتشدد سے انسانی فطرت مسخ ہوجاتی ہے اور معاشرہ تباہ ہوجاتا ہے اور دنیا ویران ہوجاتی ہے اسلام اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کرتا، چنانچہ متعدد احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امتِ مسلمہ کو ظلم وجبر سے بچنے، پُرامن زندگی گزارنے، روئے زمین پر خوشگوار ماحول بنانے اور عام انسانوں کے ساتھ فراخدلی سے پیش آنے کی پُرزور تلقین فرمائی ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده" (رواه الترمذی: ح:۲۶۲۷) صاحب ایمان کی یہ علامت قرار دی کہ اس کی ذات سے کسی انسان کو بلاوجہ تکلیف نہ پہنچے، لیکن اگر بلاوجہ تکلیف پہنچائی جائے اور ظلم عام ہوجائے تو اسلام نے اس کو ختم کرنے کے لے قصاص اور دیت کو بطور سزا نافذ کیا ہے، تاکہ اس کے ڈر سے ظلم رک جائے اور پُرامن ماحول قائم رہے، الغرض حدیث الباب میں ایک واقعہ کو بیان فرمایا ہے جو جنگ کے دوران پیش آیا تھا، وہ یہ کہ اس شخص نے لڑائی کے دوران مخاصِم کی اونگلی کو اپنے دانتوں سے دبالیا تو اس نے دفاع کرتے ہوئے زور سے اپنا ہاتھ کھینچا جس کی وجہ سے ''عاض'' (کاٹنے والے) کا دانت ٹوٹ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دانت کے ٹوٹنے پر کوئی قصاص واجب نہیں کیا، بلکہ فرمایا: کیا تو چاہتا تھا کہ وہ اپنی انگلی تیرے منھ میں رکھے، اور تو اُونٹ کی طرح چباتا رہے، فطری بات ہے کہ وہ درد کی وجہ سے اپنا دفاع ضرور کرے گا، اب اگر تیرا دانت ٹوٹ گیا تو اس میں

معضوض کی کیا غلطی ہے؟ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے، بہر حال اس طریقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظلم کو ختم کیا اور حکیمانہ انداز سے پر امن ماحول قائم کیا ہے۔

یہی واقعہ حضرت یعلیٰ بن امیہ کی حدیث میں بھی نقل کیا گیا ہے اور اس سے مسئلہ کی تائید ہوتی ہے کہ مذکورہ صورت میں کوئی دیت صاحب دانت کے لئے نہیں ہو گی۔

عَنْ صفوان بنِ عبداللّٰہ بن صفوان عَنْ عَمَّيْهِ سَلَمَةَ بْنِ أُمَيَّةَ، وَيَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ قَالَا: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ وَمَعَنَا صَاحِبٌ لَنَا، فَقَاتَلَ رَجُلًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ، فَعَضَّ الرَّجُلُ ذِرَاعَهُ فَجَذَبَهَا مِنْ فِيهِ فَنَزَعَ ثَنِيَّتَهُ ,فَأَتَى الرَّجُلُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْتَمِسُ الْعَقْلَ، فَقَالَ: "يَنْطَلِقُ أَحَدُكُمْ إِلَى أَخِيهِ فَيَعَضُّهُ عَضِيضَ الْفَحْلِ ثُمَّ يَأْتِي يَطْلُبُ الْعَقْلَ لَا عَقْلَ لَهَا " فَأَبْطَلَهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (شرح مشکل الآثار:۳/۳۳۱)

اقوال الفقہاء:

علامہ شامیؒ رقمطراز ہیں کہ اگر کوئی انسان اپنی جان و مال کے دفاع میں حملہ آور شخص یا چوری کرنے والے کو قتل کر دے (یا زخمی وغیرہ کر دے) تو قتل کرنے والے پر کوئی گناہ یا اس پر کوئی مالی معاوضہ لازم نہ ہو گا۔

ومن دخل علیہ غیرہ لیلا فاخرج السرقۃ من بیتہ فاتبعہ رب البیت فقتلہ فلا شیء علیہ لقولہ علیہ والسلام 'قاتل دون مالك". (شامی: کتاب الجنایات: فصل فیما یوجب القود ومالا یوجب، ج:٦، ص:۵۴٦، ایچ، ایم، سعید، ابوداود: حدیث نمبر: ۴۷۷۱، ۴۷۷۲)

باب: ۲۰۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْأَشْيَاءِ الْمَوْزُونَاتِ أَنَّهَا كَالْأَشْيَاءِ الْمَكِيلَاتِ فِي دُخُولِ الرِّبَا فِيهَا كَدُخُولِهِ فِي الْأَشْيَاءِ الْمَكِيلَاتِ

﴿موزونی چیزوں کا کمی بیشی اور ادھار کی شکل میں معاملہ کرنے کا حکم﴾

۱۲۹۶ - حَدَّثَنَا يُونُسُ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ أَنَّ مَالِكًا أَخْبَرَهُ عَنْ عَبْدِ الْمَجِيدِ بْنِ سُهَيْلِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلَى خَيْبَرَ فَجَاءَ بِتَمْرٍ جَنِيبٍ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هَكَذَا؟" فَقَالَ: لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هَذَا بِالصَّاعَيْنِ، وَالصَّاعَيْنِ بِالثَّلَاثَةِ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "فَلَا تَفْعَلْ، بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ، ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيبًا" وَقَالَ فِي الْمِيزَانِ مِثْلَ ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۳۴، ومؤطا للإمام مالك: ۲/۲۲۳، وابن حبان: ۵۰۲۱، وشرح السنه: ۸/۷۱)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے، اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اور قرآن مجید کی کئی آیات اس کی حرمت پر دال ہیں، اس سلسلہ میں مزید وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث الباب اور حضرت عبادہ بن الصامت کی حدیث میں کی ہے۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا

بِیَدٍ. (صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الصرف وبیع الذھب بالورق نقدا، رقم الحدیث:۱۵۸۷)

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں چھ چیزوں کی نشاندہی کی ہے کہ سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور اور نمک میں سے ایک چیز کا اپنے ہم جنس کے عوض تبادلہ کوئی کرے گا، مثلاً سونے کا تبادلہ سونے سے کیا تو دو چیزوں کا لحاظ ضروری ہوگا، ایک تو دونوں کا برابر ہونا، دوسرا دونوں طرف سے نقد معاملہ ہونا، ورنہ اس کے خلاف معاملہ کرنا ربا کا موجب ہوگا، یعنی ادھار اور کمی بیشی کے ساتھ معاملہ ناجائز اور حرام ہوگا۔

گرچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں صرف چھ چیزوں کی نشان دہی کی ہے (جن میں باہم تبادلہ کے وقت برابری اور نقد معاملہ ضروری قرار دیا ہے) مگر فقہاء نے ان چیزوں کو علامتی تعبیر قرار دیا ہے اور اس سے ایک علت اخذ کی ہے، جہاں وہ علت پائی جائے گی، وہاں سود کا حکم عائد ہوگا، چاہے وہ ان چیزوں میں سے ہو یا ان چیزوں میں سے نہ ہو، مثلاً احناف نے اس حدیث سے دو علتیں نکالی ہیں، ایک جنس، دوسری قدر، یعنی دونوں طرف کی چیزوں کی جنس ایک ہو اور قدری بھی ہوں تو تبادلہ میں برابری اور نقد کا لحاظ ضروری ہوگا، یہی حکم اس صورت میں بھی ہے، جب کہ دونوں کیلی ہوں اور دونوں کی جنس بھی ایک ہوں، اسی طرح امام شافعیؒ کے یہاں حرمت کی علت طعام یا ثمنیت کا پایا جانا اور امام مالکؒ کے یہاں اقتیاۃ، ادّخار، مع الثمنیۃ ہے۔

چنانچہ حدیث الباب میں اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی وضاحت کے لئے امام طحاویؒ نے پانچ احادیث پیش کی ہیں۔

ربا کے مسئلہ میں اہل مدینہ کا مسلک:

امام طحاویؒ اور دیگر فقہاء احناف کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں حدیث الباب کی روشنی میں یہی ہے کہ دو چیزوں میں تبادلہ کے وقت برابری اور نقد معاملہ کا لحاظ اس وقت ضروری ہے، جب کہ دونوں کی جنس ایک ہو، چاہے وہ قدری ہوں یا کیلی، چاہے وہ ماکولات ومشروبات میں سے

ہوں یا ماکولات ومشروبات میں سے نہ ہوں، مگر اہل مدینہ نے اس حکم کو صرف ماکولات ومشروبات کے ساتھ خاص کیا ہے، جیسا کہ امام طحاویؒ نے اس عبارت سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بِخِلَافِ مَا قَالَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ فِيهِ وَحَمْلِهِمْ ذَلِكَ عَلَى الْأَشْيَاءِ الْمَكِيلَاتِ مِمَّا يُؤْكَلُ وَمِمَّا يُشْرَبُ خَاصَّةً دُونَ مَا لَا يُؤْكَلُ وَمَا لَا يُشْرَبُ، فَقَالَ قَائِلٌ مِمَّنْ ذَهَبَ إِلَى مَا يَقُولُهُ أَهْلُ الْمَدِينَةِ فِي ذَلِكَ: إِنَّ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ قَدْ ذَهَبَ فِي هَذَا الْمَعْنَى إِلَى مَا ذَهَبْنَا إِلَيْهِ فِيهِ، وَإِلَى خِلَافِ مَا ذَهَبَ الْآخَرُونَ إِلَيْهِ فِيهِ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۳۷-۳۳۸)

اہل مدینہ کی دلیل:

اس سلسلہ میں اہل مدینہ نے حضرت سعید بن المسیبؒ کی حدیث سے استدال کیا ہے۔

عَنْ أَبِي الزِّنَادِ أَنَّهُ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ يَقُولُ: "لَا رِبَا إِلَّا فِي ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ أَوْ فِيمَا يُكَالُ أَوْ يُوزَنُ مِمَّا يُؤْكَلُ أَوْ يُشْرَبُ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۳۸)

حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ ربا کا حکم صرف سونے چاندی یا کھانے پینے کی چیزوں میں ہوگا، چاہے وہ کیلی ہوں یا وزنی، اس حدیث کے تحت علامہ سلیمان بن خلف الباجیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی مقتضی ہے کہ اہل مدینہ کے یہاں مطعوم میں علت ربا یہ ہے کہ مطعوم مکیلی، یا موزونی ہو۔ (المنتقی شرح الموطا: ۴/ ۲۶۴، ط: مطابعۃ السعادہ)

سوال:

سوال یہ ہوتا ہے کہ ربا کے مسئلہ میں اہل مدینہ کا جو مسلک ہے (ماکولات ومشروبات میں ہی ربا کا تحقق ہوگا) اس کی تائید سعید بن مسیب کی حدیث سے ہوتی ہے، جو ماقبل میں گزر چکی، انہوں نے بھی حدیث میں ''یوکل ویشرب'' کی قید لگائی ہے، لیکن حضرت سعید بن المسیب

کے قول کی مخالفت حضرعمار بن یاسرؓ کے قول سے ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

فَقَالَ قَائِلٌ مِمَّنْ ذَهَبَ إِلَى مَا يَقُولُهُ أَهْلُ الْمَدِينَةِ فِي ذَلِكَ: إِنَّ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ قَدْ ذَهَبَ فِي هَذَا الْمَعْنَى إِلَى مَا ذَهَبْنَا إِلَيْهِ فِيهِ, وَإِلَى خِلَافِ مَا ذَهَبَ الْآخَرُونَ إِلَيْهِ فِيهِ وَذَكَرَ مَا قَدْ حَدَّثَنَا يُونُسُ، قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ أَنَّ مَالِكًا أَخْبَرَهُ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ أَنَّهُ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ يَقُولُ: "لَا رِبَا إِلَّا فِي ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ أَوْ فِيمَا يُكَالُ أَوْ يُوزَنُ مِمَّا يُؤْكَلُ أَوْ يُشْرَبُ" وَقَالَ: فَإِلَى قَوْلِ مَنْ خَالَفْتُمْ قَوْلَ سَعِيدٍ هَذَا. (شرح مشکل الآثار: ۳۳۸/۳، ۳۳۷)

جواب:

امام طحاوی اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس مسئلہ میں سعید بن المسیبؒ کی حدیث کے مقابلہ میں حضرت عمار بن یاسرؓ کی حدیث زیادہ قوی ہے، اوراس میں ''یوکل ویشرب'' کی قید نہیں ہے، چنانچہ حضرت عمار بن یاسرؓ کا قول ملاحظہ فرمائیں۔

: قَالَ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: "الْعَبْدُ خَيْرٌ مِنَ الْعَبْدَيْنِ, وَالْأَمَةُ خَيْرٌ مِنَ الْأَمَتَيْنِ, وَالْبَعِيرُ خَيْرٌ مِنَ الْبَعِيرَيْنِ, وَالثَّوْرُ خَيْرٌ مِنَ الثَّوْرَيْنِ, فَمَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ فَلَا بَأْس، إِنَّمَا الرِّبَا فِي النَّسَاءِ لَا مَا كِيلَ أَوْ وُزِنَ". (شرح مشکل الآثار: ۳۳۸/۳)

دلیل عقلی:

اسی طرح امام طحاویؒ دلیل عقلی سے بھی جواب دیتے ہیں کہ جیسے سونا چاندی میں تفاضل کی بناء پر ربا کا تحقق ہوتا ہے جب کہ ان کو کھایا یا پیا نہیں جاتا، اسی طرح دوسری چیزوں میں بھی ربا کا تحقق ہوگا، چاہے اس کا تعلق ماکولات ومشروبات سے ہو یا نہ ہو، معلوم ہوا کہ اصل علت قدر مع الجنس ہے، جہاں یہ علت پائی جائے گی ربا کا تحقق ہوگا۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَلَمَّا كَانَ أَوْكَدَ الْأَشْيَاءِ فِي دُخُولِ الرِّبَا عَلَيْهَا الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ، وَلَيْسَا بِمَأْكُولَيْنِ وَلَا مَشْرُوبَيْنِ، عَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ الْعِلَّةَ الَّتِي لَهَا دُخُولُ الرِّبَا إِلَى الْوَزْنِ فِيمَا يُوزَنُ، وَالْكَيْلُ فِيمَا يُكَالُ مَأْكُولًا كَانَ ذَلِكَ أَوْ مَشْرُوبًا أَوْ غَيْرَ مَأْكُولٍ أَوْ مَشْرُوبٍ, وَاللَّهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار:۳۳۹/۳)

باب: ۲۰۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "إِنَّ الرَّجُلَ لَيَكُونُ مِنْ أَهْلِ الصَّلَاةِ وَمِنْ أَهْلِ الزَّكَاةِ حَتَّى ذَكَرَ سِهَامَ الْخَيْرِ وَمَا يُجْزَى يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا بِقَدْرِ عَقْلِهِ"

﴿طاعت کا صلہ اور ثواب مکلفین کے اخلاص اور جزبہ احسان کے مطابق ہوگا﴾

۱۳۰۱ - حَدَّثَنَا أَبُو أُمَيَّةَ مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا مَنْصُورُ بْنُ سُقَيْرٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ أَعْيَنَ قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الرَّجُلَ لَيَكُونُ مِنْ أَهْلِ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، حَتَّى ذَكَرَ سِهَامَ الْخَيْرِ، وَمَا يُجْزَى يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا بِقَدْرِ عَقْلِهِ". (شرح مشکل الآثار: ۳۴۰/۳، وابن حبان فی المجروحین :۴۰/۳، والعقیلی فی الضعفاء : ۱۹۲/۴،والخطیب فی تاریخہ:۱۳/ ۷۹-۸۰،وابن ابی حاتم فی العلل: ۱۲۹/۲)

خلاصۃ الحدیث:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے،عبادت خالق ومخلوق کے رشتہ کو مضبوط کرتی ہے،عبادت قرب خداوندی کا ذریعہ ہے،عبادت سے دل کو سکون ملتا ہے؛ لیکن آج مسلمانوں کی اکثریت جہاں زندگی کے دیگر معاملات میں افراط وتفریط کا شکار ہے

وہیں عبادت کے سلسلہ میں بھی وہ اعتدال وتوازن سے دور ہے، عبادت کا اصل معنی خضوع کے آخری درجہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے اختیار کرنا ہے، اور اصطلاح شرع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق عبادت کے تمام ارکان کو خشوع وخضوع سے ادا کرنا ہے، لیکن فی زماننا اکثریت عبادت کی اس اصل حقیقت سے نا آشنا ہیں، اور عبادت کو محض بوجھ سمجھ کر ادا کر رہی ہے، علامہ اقبالؒ نے ایسی عبادت کی بہترین تصویر کشی کی ہے ؎

سجدہ عشق ہو تو عبادت میں مزہ آتا ہے = خالی سجدوں میں تو دنیا ہی بسا کرتی ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ بس فرض ادا کرنا ہے = ایسا لگتا ہے کوئی قرض لیا ہو رب سے

الغرض جہاں بندوں پر عبادت فرض ہے، وہیں اس کے درجات بھی متعین ہیں اور قیامت کے دن اسی کے مطابق اجر وثواب بھی ملے گا، چنانچہ جس نے عبادت کو کما حقہ ادا کیا ہوگا اس کو مکمل اجر ملے گا اور جس نے اس میں کوتاہی کی ہوگی اسے کم اجر ملے گا، جیسا کہ حدیث الباب میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

توضیح:

حدیث الباب میں عبادت اور اس پر ملنے والے اجر کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے، اب امام طحاویؒ حدیث الباب کی توضیح وتشریح کر رہے ہیں: (۱) اگر کوئی شخص نماز میں قرأت، رکوع، سجدہ، تشہد اور دیگر واجباتِ نماز کو کما حقہ خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرے تو اسے نماز کا مکمل ثواب ملے گا، برخلاف اس شخص کے جو نماز میں سستی بے توجہی کرے، تو اسے نماز کا مکمل ثواب حاصل نہیں ہوگا، بل کہ اس کا ثواب بھی اس کی ادائیگی پر موقوف ہوگا۔

فَتَأَمَّلْنَا هَذَا الْحَدِيثَ فَوَجَدْنَا مَنْ صَلَّى صَلَاةً مُقْبِلًا عَلَيْهَا حَتَّى وَفَّاهَا خُشُوعَهَا،

وَقِيَامَهَا، وَقِرَاءَتَهَا، وَرُكُوعَهَا، وَسُجُودَهَا وَسَائِرَ مَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَأْتِيَ بِهِ فِيهَا مِنْ فَرَائِضِهَا، وَمِنْ سُنَنِهَا. (شرح مشکل الآثار: ۳۴۱/۳)

(۲) اسی طرح زکوۃ کو اس کے اصل مستحق تک پہنچانے کے لئے اگر کوئی شخص لوگوں میں گھوم پھر کر اس کے حق دار تک زکوۃ پہنچا تا ہے تو ایسے شخص کو بڑھا کر اجر ملے گا، اس لئے کہ اکثر وبیشتر وہ فقیر جو مستحق زکوۃ نہیں ہوتے وہ زکوۃ کی رقم لے لیتے ہیں، اور اصل مستحق جو لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے عار اور شرم محسوس کرتے ہیں ان تک زکوۃ کا مال نہیں پہنچ پا تا، لہذا اب جو شخص اصل مستحق تک زکوۃ پہنچانے میں تگ ودو کرے وہ زیادہ ثواب کا مستحق ہوگا، قرآن کریم میں ایسے شخص کی تعریف کی گئی ہے: ﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ [بقرہ: ۲۶۵]

(اور ان لوگوں کے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کہ اپنے نفسوں کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان میں پختگی پیدا کریں مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ دوگنا چوگنا پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کو کافی ہے۔)

برخلاف اس شخص کے جو محض زکوۃ ادا کرتا ہے وہ ثواب کے اس درجہ کو نہیں پہنچتا۔

وَمِثْلُ ذَلِكَ الزَّكَاةُ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْمُسْتَحِقِّينَ لَهَا بِأَعْلَى مَرَاتِبِ أَهْلِهَا فِيهَا مِنَ الْفَقْرِ إِلَيْهَا --------- قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: يَعْنِي الَّتِي يَتَقَرَّبُونَ بِهَا إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، فَمَنْ كَانَ كَذَلِكَ فَلَيْسَ كَمَنْ يُعْطِيهَا مَنْ حَضَرَهُ بِغَيْرِ الْتِمَاسِ هَذَا الْمَعْنَى فِيهِ. (شرح مشکل الآثار: ۳۴۲/۳-۳۴۴)

(۳) اسی طرح روزہ کی حالت میں لغو کلام، گالی گلوچ، فسق و فجور کرنے والے کو اتنا ثواب نہیں ملتا، جتنا کہ اعمال صالحہ اور تلاوت قرآن کرنے والے اور تارک منکرات کو ملتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ الصِّيَامُ فِي تَرْكِ اللَّغْوِ فِيهِ وَالْإِقْبَالِ عَلَيْهِ وَتَرْكِ الرَّفَثِ وَالْجَهْلِ فِيهِ جَزَاءُ مَنْ أَتَى بِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۴۴)

(۴) نیز حج کا بھی یہی حکم ہے کہ لڑائی جھگڑا، فسق و فجور کو چھوڑ کر حج کے تمام ارکان سنت کے مطابق ادا کرنے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے اس کے برخلاف دوسرا شخص ثواب کے اس درجہ تک نہیں پہنچتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ الْحَجُّ مَنْ جَاءَ بِهِ بِلَا رَفَثٍ، وَلَا فُسُوقٍ، وَلَا جِدَالٍ فِيهِ، فَكَانَ جَزَاؤُهُ عَلَيْهِ خِلَافَ جَزَاءِ مَنْ جَاءَ بِهِ بِخِلَافِ ذٰلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۴۵)

(۵) اسی طرح دیگر تمام اعمال صالحہ کا یہی حکم ہے کہ اس کو خشوع و خضوع سے انجام دینے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے اور غفلت برتنے والے کو کم۔

وَكَذٰلِكَ سَائِرُ سِهَامِ الْإِسْلَامِ هِيَ عَلَى هٰذَا الْمَعْنَى فَكَانَ جَزَاءُ مَنْ عَقَلَهَا حَتَّى وَفَّاهَا مِنْ نَفْسِهِ خِلَافَ جَزَاءِ مَنْ جَهِلَهَا حَتَّى أَغْفَلَهَا وَلَمْ نَجِدْ فِي تَأْوِيلِ هٰذَا الْحَدِيثِ أَحْسَنَ مِمَّا ذَكَرْنَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهِ، وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۴۵)

باب: ۲۰۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "مَا أَذِنَ اللّٰهُ لِشَيْءٍ مَا أَذِنَ لِنَبِيٍّ يَتَغَنَّى بِالْقُرْآنِ"

﴿قرآن مجید خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرنا مستحسن ہے﴾

۱۳۰۲ - حَدَّثَنَا يُونُسُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ وَهْبٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي يُونُسُ بْنُ يَزِيدَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، أَنَّ أَبَا سَلَمَةَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَخْبَرَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "مَا يَأْذَنُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ لِشَيْءٍ مَا يَأْذَنُ لِنَبِيٍّ يَتَغَنَّى بِالْقُرْآنِ". (شرح مشکل الآثار: ۳۴۶/۳، خ، ح: ۵۰۲۴، م- ح: (۷۹۲)

خلاصۃ الحدیث:

قرآن مجید کلام الٰہی ہے، دین اسلام کی مقدس ومرکزی کتاب ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک آنے والے انس وجن کی رہنمائی کے لئے آخری نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اتنا جامع ومانع بنایا ہے کہ ایمانیات، عبادات، معاملات، سماجیات، معاشیات اور اقتصادیات کے تمام اصول قرآن مجید میں جمع فرمادیے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں بار بار قرآن میں تدبر وتفکر کرنے کا حکم دیا۔ ﴿أفلا يَتَدَبَّرُوْنَ القُرآن﴾ [محمد:۲۴].

الغرض جہاں ایک طرف شریعت مطہرہ کثرت سے تلاوت قرآن اور اس کے معانی ومطالب میں تدبر وتفکر کرنے کا حکم دیتی ہے، وہیں دوسری طرف اچھی آواز سے تلاوت کرنے کا بھی حکم دیتی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے، "لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ". (شرح مشکل الآثار: ۳۴۷/۳)، "زينوا القرآن بأصواتكم فإن الصوت الحسن يزيد القرآن حسنا".

(المستدرك على الصحيحين: ۲۱۲۵)

یعنی: قرآن کریم کو اپنی آوازوں سے مزین کرو، اس لئے کہ حسن صوت قرآن کریم

کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ حدیث میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کسی چیز کی طرف کان نہیں لگاتے، سوائے نبی کی قرآءت کے جو اچھی آواز سے تلاوت کلام کرے، خلاصہ یہ ہے کہ حسن صوت سے تلاوت کرنا نہ صرف مستحسن ہے؛ بلکہ شریعت کا حکم بھی ہے، اور اس سے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا رب اسی وقت ہم سے مخاطب ہے اور ابھی قرآن نازل ہو رہا ہے، اللہ سے دعا ہے کہ ہر ایک کو اس دولت سے مالا مال فرمائے (آمین) واللہ اعلم۔

فَتَأَمَّلْنَا مَعْنَى مَا أُرِيدَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ، فَوَجَدْنَا الْإِذْنَ فِي هَذَا هُوَ الِاسْتِمَاعُ. وَمِنْهُ قَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ﴾ [الانشقاق: ۲] أَيْ: تَسَمَّعَتْ مَا يَأْمُرُهَا رَبُّهَا عَزَّ وَجَلَّ بِهِ، وَلِمَا يُحِبُّهَا مِنْهُ، فَمِثْلُ ذَلِكَ قَوْلُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا يَأْذَنُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لِشَيْءٍ مَا يَأْذَنُ لِنَبِيٍّ يَتَغَنَّى بِالْقُرْآنِ" أَيْ: مَا يَسْتَمِعُ لِشَيْءٍ مَا يَسْتَمِعُ لِنَبِيٍّ يَتَغَنَّى بِالْقُرْآنِ مِنْ تَحْسِينِهِ بِهِ صَوْتَهُ، طَلَبًا لِرِقَّةِ قَلْبِهِ بِهِ لِمَا يَرْجُو فِي ذَلِكَ مِنْ ثَوَابِ رَبِّهِ عَزَّ وَجَلَّ إِيَّاهُ عَلَيْهِ، وَاللَّهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۴۶)

باب: ۲۰۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ"

﴿خوش الحانی کے ساتھ قرآن پاک تلاوت نہ کرنے پر وعید﴾

۱۳۰۳ - حَدَّثَنَا بَكَّارُ بْنُ قُتَيْبَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ أَبِي الْوَزِيرِ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ، عَنِ ابْنِ أَبِي مُلَيْكَةَ، عَنِ ابْنِ أَبِي نَهِيكٍ، عَنْ سَعْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ". (شرح مشکل

الآثار: ۳/۳۴۷، ورواه الحمیدی(۷۶)،وابن ابی شیبة:۲/۵۲۲، ۱۰/۴۶۴، واحمد :۱/۱۷۹، وأبوداود (۱۴۷۰)، والدارمی:۱/۳۴۹،والحاکم:۱/۵۶۹،والبیهقی:۱۰/۲۳۰)

خلاصۃ الحدیث:

قرآن پاک کو حسن صوت سے تلاوت کرنا نہ صرف جائز ہے؛ بلکہ یہ مستحسن عمل ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں حسن صوت کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کی ترغیب دی ہے:

”زینوا القرآن بأصواتکم فإن الصوت الحسن یزید القرآن حسنا“. (المستدرك علی الصحیحین:۲۱۲۵)

قرآن کریم کو اپنی آواز سے مزین کرو، اس لئے کہ حسن صوت قرآن کریم کے حسن میں اضافہ کرتا ہے،لیکن اگر کوئی مسلمان حسن صوت کے ساتھ قرآن کریم کے پڑھنے پر قادر ہے، اس کے باوجود اس کا اہتمام نہیں کرتا تو اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی وعید فرمائی ہے، جیسا کہ اس باب کی پہلی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ شخص ہمارے کامل طریقہ پر چلنے والا نہیں ہے جو قرآن کریم خوش گلوئی کے ساتھ نہ پڑھے، مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھنا چاہئے، بشرطیکہ اس میں اتنا غلو نہ کرے کہ معنی میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔

حدیث الباب کی توضیح:

امام طحاویؒ نے اس باب کی پہلی حدیث کا معنی اور مفہوم دو شکلوں میں بیان کیا ہے، ایک شکل یہ ہے کہ تحسین صوت اور خوش گلوئی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور آخرت میں

جو اجر اور صلہ کا وعدہ ہے، اس پر یقین رکھتے ہوئے قرآن مجید کی تلاوت کرے کہ قرآن کے علاوہ دنیا کی تمام چیزوں سے مستغنی ہوجائے، تاکہ تلاوت کی برکت اور اس کا اثر دنیا میں ظاہر ہو، نیز آخرت میں اس پر اجر وثواب ملنے کی امید ہو، یہی بعض لوگوں کا قول ہے، اس قول کا استخراج حضرت ابن ابی یزیدؒ کی حدیث سے کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

عَنِ ابْنِ أَبِي يَزِيدَ، ....وَإِنَّمَا هُوَ عُبَيْدُ اللّٰهِ، قَالَ: دَخَلْنَا عَلَى أَبِي لُبَابَةَ بْنِ عَبْدِ الْمُنْذِرِ فَدَخَلْنَا عَلَى رَجُلٍ رَثِّ الْبَيْتِ رَثِّ الْمَتَاعِ رَثِّ الْحَالِ فَسَأَلْنَا، فَقَالَ: مَنْ أَنْتُمْ؟ فَكُلُّنَا انْتَسَبَ لَهُ قَالَ: مَرْحَبًا وَأَهْلًا تُجَّارٌ كَسَبَةٌ، إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: ”لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ“ فَقُلْتُ لِابْنِ أَبِي مُلَيْكَةَ فَمَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ حَلْقٌ حَسَنٌ؟ قَالَ: يُحَسِّنُهُ مَا اسْتَطَاعَ. . (شرح مشکل الآثار:۳/۳۵۱، ح:۱۳۰)

دوسری شکل یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت حسن صوت کے ساتھ اس غرض اور مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کرے تاکہ قاری قرآن کا دل نرم اور رقیق ہوجائے، یہ رائے بھی بعض حضرات کی ہے۔

فَتَأَمَّلْنَا مَعْنَى هَذَا الْحَدِيثِ فَوَجَدْنَا النَّاسَ فِيهِ عَلَى قَوْلَيْنِ: فَقَوْمٌ مِنْهُمْ يَقُولُونَ أُرِيدَ بِهِ الِاسْتِغْنَاءُ بِالْقُرْآنِ عَنِ الْأَشْيَاءِ كُلِّهَا ؛ لِأَنَّهُ قَدْ يَكُونُ بِذَلِكَ الْجَزَاءُ الْجَزِيلُ فِي الْآخِرَةِ ، وَالْوُصُولُ بِهِ مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ إِلَى عَاجِلِ خَيْرِهِ فِي الدُّنْيَا ، وَقَوْمٌ يَقُولُونَ هُوَ عَلَى تَحْسِينِ الصَّوْتِ لِيَرِقَّ لَهُ قَلْبُ مَنْ يَقْرَؤُهُ فَالْتَمَسْنَا الْأَوْلَى مِنْ هَذَيْنِ الْقَوْلَيْنِ بِمَعْنَاهُ. (شرح مشکل الآثار:۳/۳۵۰)

باب: ۲۰۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِنْ قَوْلِهِ: "مَنِ انْتَهَبَ فَلَيْسَ مِنَّا"

﴿تقسیم سے پہلے مالِ غنیمت میں سے کچھ لینے پر وعید﴾

۱۳۱۱ - حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ مَرْزُوقٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا وَهْبُ بْنُ جَرِيرٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبِي، قَالَ: سَمِعْتُ يَعْلَى بْنَ حَكِيمٍ، يُحَدِّثُ عَنْ أَبِي لَبِيدٍ، قَالَ: شَهِدْتُ كَابُلَ مَعَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ فَأَصَابَ النَّاسُ غَنَمًا فَانْتَهَبُوهَا، فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ: مَنِ انْتَهَبَ مِنْ هَذَا الْغَنَمِ شَيْئًا فَلْيَرُدَّهُ؛ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "مَنِ انْتَهَبَ فَلَيْسَ مِنَّا". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۵۵، وابوداود: ۲۷۰۳، وابن ماجه: ۳۹۳۷، مختصراً، والترمذی: ۱۱۲۳ مختصراً)

خلاصۃ الحدیث:

مالِ غنیمت اس مال کو کہتے ہیں جو جنگ میں کفار پر غلبہ کے بعد حاصل ہوتا ہے، اس مال میں فوجیوں کا حصہ ہوتا ہے، خصوصاً جنگ میں شریک تمام لوگوں کا ہوتا ہے؛ لہذا حاکم یا فوجی کمانڈر کی اجازت کے بغیر تقسیم سے قبل اس میں سے کچھ لینا ظلم اور باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانا ہے، جو کسی بھی طرح جائز نہیں، حدیث الباب میں اس فعلِ مذموم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے فرمایا ہے، چنانچہ ثعلبہ بن حکم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ایسی ہانڈیوں کے پاس سے ہوا، جس میں بکریوں کا گوشت تیار ہو رہا تھا، جس کو صحابہ نے مال غنیمت کی تقسیم سے قبل ہی لے لیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ ساری ہانڈیوں کو اوندھا کردیا جائے؛ چنانچہ ساری ہانڈیوں کو الٹ دیا گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ لوٹ مار حلال نہیں ہے، نیز دوسری روایت میں اس فعلِ مذموم کی قباحت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوٹ

مار کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

سوال:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس لوٹ مار سے منع فرمایا ہے کیا وہ عام ہے؟ یا کوئی خاص صورت ہے؟ جس کا شمار ''نهبة'' میں نہ ہوتا ہو اور وہ جائز ہو؟

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَاحْتُمِلَ أَنْ يَكُونَ مَا فِي هَذِهِ الْآثَارِ عَلَى كُلِّ نُهْبَةٍ, وَاحْتُمِلَ أَنْ يَكُونَ عَلَى خَاصٍّ مِنْهَا. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۵۹)

جواب:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ ذخیرۂ احادیث میں ایسی احادیث مذکور ہیں کہ جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مالک کی اجازت کے بغیر ہدی کی قربانی میں سے ہر ایک کو گوشت لینے کی اجازت دی مثلاً عبداللہ بن قرط کی روایت میں ہے: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مَنْ شَاءَ اقْتَطَعَ" أي من شاء أخذ من اللحم. یعنی جو چاہے مذبوح (جانور) میں سے اٹھالے۔
(شرح مشکل الآثار: ۳/۳۵۹)

اسی طرح ناجیۃ کی روایۃ میں ہے: " قال: انْحَرْهُ ثُمَّ اغْمِسْ قِلَادَتَهُ فِي دَمِهِ, ثُمَّ اضْرِبْ بِهَا صَفِيحَتَهُ هَكَذَا قَالَ: وَإِنَّمَا هِيَ صَفْحَتُهُ ثُمَّ خَلِّ بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّاسِ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۶۰، ۳۶۱)

امام طحاویؒ ان دو روایتوں سے "نهبة" کی تخصیص ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر تخصیص رجال اور بغیر تعیین مقدار کے ہدی کی قربانی میں سے ہر ایک کو لینے کی اجازت دی ہے؛ لہذا احدیث الباب میں جس "نهبة" سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا تھا اس میں اس واقعہ کا شمار نہیں ہوگا، لہذا قربانی کے بعد مالک کی اجازت کے بغیر اس کا گوشت لینا

درست ہوگا، گرچہ اصل مالک کی طرف سے اجازت نہیں ہو؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اجازت ہے، ہاں! بظاہر "نہبة" کی صورت ضرور معلوم ہوتی ہے؛ لیکن "نہبة" کی حقیقی تعریف "أخذ المال قهراً وظلماً" اس واقعہ پر صادق نہیں آرہی ہے، اس لئے ہدی کی قربانی میں سے لینا جائز ہوگا۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ فِي هَذَيْنِ الْحَدِيثَيْنِ إِبَاحَةُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلنَّاسِ الَّذِينَ يَحِلُّ لَهُمْ ذَلِكَ الْهَدْيُ أَخْذَ مَا يَجُوزُ لَهُمْ أَخْذُهُ مِنْ ذَلِكَ الْهَدْيِ بِغَيْرِ قَصْدٍ مِنْهُ إِلَى نَاسٍ بِأَعْيَانِهِمْ, وَبِغَيْرِ قَصْدٍ مِنْهُ إِلَى مِقْدَارٍ مِنَ الْهَدْيِ لِمَنْ يَأْخُذُهُ مِنْهُمْ. فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ النُّهْبَةَ الَّتِي نَهَى عَنْهَا فِي الْآثَارِ الْأُوَلِ, وَنَفَى مَنْ فَعَلَهَا أَنْ يَكُونَ مِنْهُ هِيَ خِلَافُ هَذِهِ النُّهْبَةِ, وَأَنَّهَا نُهْبَةُ مَا لَمْ يُؤْذَنْ فِي نُهْبَتِهِ, وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِ رَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِي ذَلِكَ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۶۱)

باب: ۲۰۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَقِيَّةِ الْأَشْيَاءِ الَّتِي مَنْ كَانَتْ مِنْهُ أَنْ يَكُونَ مِنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

﴿ہتھیار کے ذریعہ تفریح ومذاق کی ممانعت اور قول رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (لیس منا) کی وضاحت﴾

۱۳۲۲ - عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۶۲، ح: ۱۳۲۲، صحیح البخاری: ۷۰۷۱، صحیح مسلم: ۱۶۳)

خلاصۃ الحدیث:

افرادِ انسانی کا اجتماعی ڈھانچہ معاشرہ کہلاتا ہے، اجتماعی زندگی کی درستگی واصلاح اور اس کے پرسکون وخوشگوار بنانے کے لئے کچھ کلیدی صفات کی ضرورت پڑتی ہے؛ بلکہ معاشرہ کے ہر فرد کا ان صفات سے متصف ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، کلیدی صفات کے دو پہلوں ہیں: مثبت اور منفی، مثبت صفات میں سے ہر فرد بشر کی تعظیم کرنا، بڑوں کا احترام کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، مظلوموں کی مدد کرنا ہے، اور معاشرے میں قتل وقتال اور فساد کی فضا قائم کرنا، کسی سے لڑائی کرنا، گالی دینا، اور کسی پر کسی ہتھیار سے اشارہ کرنا یہ سب منفی صفات میں سے ہیں۔

الغرض اگر معاشرے کا ہر فرد مذکورہ دونوں صفات سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے تو وہ معاشرے کا باعزت فرد بن جاتا ہے، اس کے مال اور عزت وآبرو پر کوئی دست درازی کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اور جب معاشرے کا کوئی فرد بےحیاء بداخلاق ہوجاتا ہے، تو وہ ذلت وپستی کی وادی میں گرجاتا ہے، اسی وجہ سے حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخلاق حسنہ سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاق رذیلہ سے نہ صرف دور رہنے کا حکم دیا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان پر (ہنسی ومذاق میں) ہتھیار یا کسی لوہے سے اشارہ کرتا ہے تو اس کا دین اور اسلام سے کوئی تعلق نہیں، اور ایسا شخص فرشتے کی نظر میں معلون ہوتا ہے۔

حدیث الباب کی مزید توجیہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

عن أبی هریره قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: لا یشیر أحدکم علی أخیه بالسلاح فإنه لا یدری لعل الشیطان ینزع فی یده فیقع فی حُفرة من النار. (بخاری شریف: ح: ۷۰۷۲، مسلم: ح: ۶۶۱۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص

اپنے بھائی (مسلمان) کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے، اس لئے کہ اس کو معلوم نہیں کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے ہتھیار کھینچ لے اور اس کی وجہ سے وہ (ہتھیار کا مالک) دوزخ کی آگ میں ڈال دیا جائے''۔

حدیث الباب میں ''لَیۡسَ مِنَّا'' کی توجیہ مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوریؒ نے دو شکل میں کی ہے:

(۱) ان اوصاف منفیہ کو حلال سمجھے بغیر بجالائے گا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء کرنے والا نہیں ہوگا۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس عمل کو حلال سمجھ کر انجام دے گا تو وہ مؤمن نہیں رہے گا، بل کہ کفر میں اس کا شمار ہوگا۔

المراد "لیس منا": لیس علی طریقتنا أو لیس متبعا لطریقتنا وهٰذا فی حق من لایستحل ذلك، واما من یستحله فانه یکفر باستحلال الحرام. (تحفة الاحوذی: ۵/۲۲، فتح الباری: ۱۳/۳۰، فتح الملهم: ۲/۹۸)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَتْ هَذِهِ الْأَشْيَاءُ الَّتِي نَفَى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ مِنْهُ أَوْ كَانَتْ فِيهِ عَنْهُ أَشْيَاءَ مَذْمُومَةً، فَكَانَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ قَدِ اخْتَارَ لَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأُمُورَ الْمَحْمُودَةَ، وَنَفَى عَنْهُ الْأُمُورَ الْمَذْمُومَةَ، فَكَانَ مَنْ عَمِلَ الْأُمُورَ الْمَحْمُودَةَ مِنْهُ، وَمَنْ عَمِلَ الْأُمُورَ الْمَذْمُومَةَ، لَيْسَ مِنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۷۹)

جس طرح اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو امور محمودہ سے متصف اور امور مذمومہ سے اجتناب کا حکم فرمایا ہے، نیز اس کے خلاف عمل کرنے والے اشخاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

طریقہ سے لاتعلقی کا اظہار فرمایا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے بارے میں قرآن پاک میں فرمایا:﴿فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [إبراهيم:٣٦]

(لہذا جو میری راہ پر چلے وہ تو میرا ہے اور جو میرا کہنا نہ مانے تو آپ بہت بخشنے والے، بڑے مہربان ہیں،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ میں بھی ارشاد فرمایا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي﴾ [البقرة:۲۴۹]

(اللہ ایک دریا کے ذریعہ تمہارا امتحان لینے والا ہے جو شخص اس دریا سے پانی پیئے گا وہ میرا آدمی نہیں ہوگا، اور جو نہیں چکھے گا وہ میرا آدمی ہوگا)۔

اخیر میں امام طحاویؒ نے خلاصۃً یہ بات ذکر کی ہے ہر عامل (مسلمان) کا عمل اگر اس کے نبی کی شریعت کے مطابق ہے (جس پر اس کے اتباع ہیں) تو وہ اسی میں سے ہے، لیکن اگر کسی کا عمل اس کے نبی کے خلاف ہے تو اس کا اپنے نبی سے کوئی تعلق نہیں۔

فَدَلَّ أَنَّ كُلَّ عَامِلٍ عَمَلًا عَلَى شَرِيعَةِ نَبِيِّهِ الَّذِي عَلَيْهِ أَتْبَاعُهُ فَإِنَّهُ مِنْهُ , وَأَنَّ كُلَّ عَامِلٍ عَمَلًا تَمْنَعُ مِنْهُ شَرِيعَةُ نَبِيِّهِ الَّذِي عَلَيْهِ أَتْبَاعُهُ لَيْسَ مِنْهُ ؛ لِخُرُوجِهِ عَنْ مَا دَعَاهُ إِلَيْهِ ، وَعَنْ مَا هُوَ عَلَيْهِ إِلَى ضِدِّ ذَلِكَ، وَاللَّهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار:۳/۳۷۹)

باب: ۲۱۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمُسْلِمِ عِنْدَ الِانْتِهَاءِ إِلَى الْقَوْمِ، وَعِنْدَ الْقِيَامِ عَنْهُمْ، وَهَلْ سَلَامُ مَنِ انْتَهَى إِلَيْهِمْ يَكُونُ وَهُوَ قَائِمٌ أَوْ يَكُونُ بَعْدَ أَنْ يَجْلِسَ؟

﴿ آداب سلام کا بیان ﴾

۱۳۵۰ - حَدَّثَنَا الرَّبِيعُ بْنُ سُلَيْمَانَ الْمُرَادِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَسَدُ بْنُ مُوسَى، قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ سَالِمٍ، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَجْلَانَ، أَنَّ سَعِيدَ بْنَ أَبِي سَعِيدٍ أَخْبَرَهُ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا انْتَهَى أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَجْلِسِ فَلْيُسَلِّمْ، فَإِنْ بَدَا لَهُ أَنْ يَجْلِسَ فَلْيَجْلِسْ، وَإِذَا قَامَ فَلْيُسَلِّمْ، فَإِنَّ الْأُولَى لَيْسَتْ بِأَحَقَّ مِنَ الْآخِرَةِ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۸۰، وسنن أبی داود: ۵/۱۴۹) رقم: ۵۲۰۸)

خلاصة الحديث:

دنیا کی تمام متمدن ومہذب قوموں میں ملاقات کے وقت پیار ومحبت، جزبہ اکرام وخیر اندیشی کا اظہار کرنے اور مخاطب کو مانوس ومسرور کرنے کے لئے کوئی خاص کلمہ کہنے کا رواج ہے، اس لئے اسلام میں آپس میں ملاقات کے وقت (السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته) کی تعلیم دی گئی ہے، اور ایک دوسرے کو سلام کرنے پر نیکی اور اجر کا وعدہ کیا گیا ہے، سلام اسلام کا شعار ہے، سلام اللہ سے قریب کرنے والا ہے، محبتوں کو پیدا کرنے والا، نفرتوں، کدورتوں اور عداوتوں کو مٹانے والا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باہم سلام کا رواج دینے اور عام کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے، کیوں کہ سلام جہاں ایک دوسرے سے ملاقات سے پہلے ایک

ادب ہے، وہیں دوسری طرف یہ کلمہ کہنے پر ثواب واجر کا وعدہ بھی ہے، اسی وجہ سے ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کے وقت گھر میں داخل ہونے سے پہلے اہل خانہ کو سلام کرنے، اور کسی مجلس میں شرکت کے وقت موجود لوگوں کو سلام کرنے کا حکم ہے، جیسا کہ حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام کی اہمیت وفضیلت کو واضح فرمایا ہے۔

تعارض:

حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجلس میں شرکت کے وقت بیٹھنے سے پہلے سلام کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

جب کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں بیٹھنے کے بعد سلام کرنا معلوم ہو رہا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا قَعَدَ أَحَدُكُمْ فَلْيُسَلِّمْ، وَإِذَا قَامَ فَلْيُسَلِّمْ، فَلَيْسَتِ الْأُولَى بِأَحَقَّ مِنَ الْآخِرَةِ". (شرح مشکل الآثار:۳۸۲/۳)

اس اعتبار سے دونوں حدیث میں تعارض واقع ہوا۔

وَفِيمَا رَوَيْنَا أَنَّ سَلَامَ الْجَائِي يَكُونُ عَلَى الْقَوْمِ عِنْدَ انْتِهَائِهِ إِلَيْهِمْ قَبْلَ جُلُوسِهِ مَعَهُمْ.

۱۳۵۵ - أَخْبَرَنَا أَحْمَدُ بْنُ شُعَيْبٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا الْجَارُودُ بْنُ مُعَاذٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا الْوَلِيدُ بْنُ مُسْلِمٍ، قَالَ: سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ عَجْلَانَ، يَقُولُ: حَدَّثَنِي سَعِيدٌ الْمَقْبُرِيُّ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا قَعَدَ أَحَدُكُمْ فَلْيُسَلِّمْ، وَإِذَا قَامَ فَلْيُسَلِّمْ، فَلَيْسَتِ الْأُولَى بِأَحَقَّ مِنَ الْآخِرَةِ" قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ سَلَامَهُ

عَلَيْهِمْ يَكُونُ بَعْدَ جُلُوسِهِ مَعَهُمْ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۸۲)

رفع تعارض:

امام طحاویؒ نے بڑے لطیف انداز میں اس تعارض کو رفع کیا ہے کہ دراصل مذکورہ دونوں حدیث میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ یہ تو عربی زبان کی وسعت ہے جس سے ہر کس و ناکس واقف نہیں ہو پاتا، اہل لسان اور ماہرین فن ہی اس نکتہ کو سمجھ پاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ﴾ [البقرة: ۲۳۱]

(جب تم اپنی عورتوں کو طلاق (رجعی) دیدی ہو پھر وہ اپنی عدت گزارنے کے قریب پہنچ جاوے تو یا تو تم ان کو قاعدہ کے مطابق (رجعت) کر کے نکاح میں رہنے دو یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دے دو۔)

اسی طرح ''إِذَا انْتَهَى أَحَدُكُمْ إِلَى الْقَوْمِ فَلْيُسَلِّمْ'' سے سلام کا حقیقی محل مراد ہے یعنی بیٹھنے سے پہلے جو وقت ہے وہی سلام کا محل ہے، اس لئے بیٹھنے سے قبل سلام کرنا چاہئے، اسی طرح دوسری روایت میں ''إِذَا قَعَدَ أَحَدُكُمْ فَلْيُسَلِّمْ'' سے قرب قعود مراد ہے۔ واللہ اعلم

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ وَعَوْنِهِ: أَنَّ ذَلِكَ لَيْسَ عَلَى الِاخْتِلَافِ وَلَكِنَّهُ عَلَى سَعَةِ اللُّغَةِ، وَأَخْلِقْ بِمَا ظَنَنْتَ أَنَّهُ اخْتِلَافٌ أَنْ يَكُونَ مِنْ قَوْلِ مَنْ بَعْدَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَيْسَ ذَلِكَ بِمُنْكَرٍ ; لِأَنَّهُمْ عَرَبٌ وَلُغَتُهُمْ يَتَّسِعُ لَهُمْ هَذَا فِيهَا، وَقَدْ جَاءَ كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ بِمِثْلِ هَذَا، قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ﴾ [البقرة: ۲۳۱] ....(شرح مشکل الآثار: ۳/۳۸۲-۳۸۳)

باب: ٢١١

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: "لَنْ يَجْزِيَ وَلَدٌ وَالِدًا إِلَّا أَنْ يَجِدَهُ مَمْلُوكًا فَيَشْتَرِيَهُ فَيُعْتِقَهُ"

﴿والدین کو آزاد کرانے کی فضیلت﴾

١٣٥٦ - حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ هِشَامُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ قُرَّةَ الرُّعَيْنِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو جَعْفَرٍ ....، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَنْ يَجْزِيَ وَلَدٌ وَالِدًا إِلَّا أَنْ يَجِدَهُ مَمْلُوكًا فَيَشْتَرِيَهُ فَيُعْتِقَهُ". (شرح مشکل الآثار: ٣/٣٨٤، ورواہ أحمد: ٢/٢٣٠، ومسلم: (١٥١٠) وأبوداود (٥١٣٧) والبیهقی: ١٠/٢٨٩)

خلاصۃ الحدیث:

والدین اولاد کے وجود ظاہری کے سبب ہی نہیں بل کہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے اونچا اور برتر مقام والدین کا ہے، والدین کا رشتہ اولاد سے ایسا ہے کہ وہ بنا کسی شرط کے اپنے لخت جگر اولاد کی پرورش و پرداخت کے لئے ہر طرح کی راحت و آرام کو قربان کردیتے ہیں، ان کی ہر ضرورت وخواہش کو اپنی خواہش پر مقدم کرتے ہیں، اوران کی خوشی کی خاطر اپنی زندگی تک بھول جاتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی خوب تاکید فرمائی ہے، اگر کوئی شخص پوری زندگی بھی اپنے والدین کے قدموں میں گرا رہے یا والدین کو سر پر اٹھائے پھرتا رہے پھر بھی ان کے احسانات کا بدلہ چکا نہیں سکتا۔

ہاں! البتہ ایک صورت ہے جس کو بجالانے سے انسان اپنے والدین کے احسان کا بدلہ کسی حد تک چکا سکتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی کے والدین غلام ہوں تو ان کو خرید کر

آزاد کردے، یہ عمل مکافات بن سکتا ہے، جیسا کہ حدیث الباب میں مذکور ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے والدین کا بدلہ نہیں چکا سکتا، ہاں! البتہ اگر ان کو مملوک پائے تو ان کو خرید کر آزاد کردے۔

سوال:

مذکورہ حدیث میں یہ بات ہے کہ اولاد اپنے والدین کو خرید کر مملوک بنائے اور آزاد کرے، جب کہ اس میں والدین کی توہین بھی ہے، اسی لئے مفتیان کرام میں سے کوئی بھی اس کے جواز کے قائل نہیں، اور نہ حدیث الباب میں صحت واستقامت کے اعتبار سے کوئی ضعف ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَقَالَ قَائِلٌ: فِي هَذَا الْحَدِيثِ مَا يُوجِبُ أَنْ يَكُونَ بَعْدَ شِرَائِهِ أَبَاهُ مَمْلُوكًا لَهُ حَتَّى يُعْتِقَهُ ,وَأَهْلُ الْعِلْمِ الَّذِينَ تَدُورُ عَلَيْهِمُ الْفُتْيَا فِي الْأَمْصَارِ لَا يَقُولُونَ هَذَا مَعَ اسْتِقَامَةِ هَذَا الْحَدِيثِ فِيهِمْ فَفِي ذَلِكَ دَلِيلٌ عَلَى تَوْهِينِهِمْ إِيَّاهُ وَرَغْبَتِهِمْ عَنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۸۴)

جواب:

امام طحاویؒ نے اس طرح جواب دیا ہے کہ اصل میں کوئی لڑکا والدین کو آزاد نہیں کراتا، البتہ اس کا عمل (یعنی والدین کو خریدنا) والدین کی آزادی کا سبب ہوتا ہے، اس لئے کہ اولاد کی طرف مجازاً آزادی کی نسبت کی گی ہے، اس کی نظیر اور دلیل یہ حدیث ہے:

"كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُشَرِّكَانِهِ" فَلَمْ يَكُنْ ذَلِكَ عَلَى مَعْنَى تَهْوِيدِهِمَا إِيَّاهُ، وَلَا تَنْصِيرِهِمَا إِيَّاهُ تَهْوِيدًا وَتَنْصِيرًا يَسْتَأْنِفَانِهِ فِيهِ ...(شرح

مشکل الآثار:۳/۳۸۵)

غور کیجئے جس طرح اس حدیث میں اولاد کونصرانی، یہودی اور مشرک بنانے کی نسبت والدین کی طرف کی گئی ہے، اسی طرح حدیث الباب میں خریدنے کی وجہ سے آزاد کرنے کی نسبت اولاد کی طرف کی گئی ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ أَنَّ الَّذِي تَوَهَّمَهُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ لَيْسَ كَمَا تَوَهَّمَهُ فِيهِ ....فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ: دَلِيلُنَا عَلَى ذَلِكَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَالَ: "كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُشَرِّكَانِهِ" فَلَمْ يَكُنْ ذَلِكَ عَلَى مَعْنَى تَهْوِيدِهِمَا إِيَّاهُ، وَلَا تَنْصِيرِهِمَا إِيَّاهُ تَهْوِيدًا وَتَنْصِيرًا يَسْتَأْنِفَانِهِ فِيهِ, وَلَكِنْ يَكُونُ كَذَلِكَ سَبَبٌ مِنْهُمَا يُوجِبُ ذَلِكَ فِيهِ فَمِثْلُ ذَلِكَ قَوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "فَيَشْتَرِيَهُ فَيُعْتِقَهُ" لَيْسَ عَلَى عَتَاقٍ يَسْتَأْنِفُهُ فِيهِ بَعْدَ شِرَائِهِ إِيَّاهُ, وَلَكِنَّ سَبَبَهُ مِنْهُ الَّذِي لَا يَجُوزُ مَعَهُ بَعْدَ مِلْكِهِ إِيَّاهُ بَقَاءُ مِلْكِهِ فِيهِ, وَاللّٰهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ.

(شرح مشکل الآثار:۳/۳۸۵)

اقوال المحدثین:

اصحاب ظواہر کا مسلک یہ ہے کہ باپ (والد) کو محض خرید لینے سے آزاد نہیں ہوں گے جب تک ان کو خریدنے کے بعد بیٹا آزاد نہ کردے، لہذا خریدنے کی وجہ سے آزادی کی ترتیب درست نہیں، اس لئے اس صورت میں "فَيُعْتِقَهُ" میں "ف" کو تعقیب کے لئے مانیں گے نا کہ سببیت کے لئے۔

قال العلاّمۃُ محمد القاری: ذهب بعض أهل الظواهر إلى أن الأب لا يعتق على ولده إذا تملكه وإلّا لم يصح ترتيب الإعتاق على الشراء يجعل الفاء فی فيعتقه للتعقيب لا

للسببية. (مرقاة المفاتيح: ۶/ ۵۱۰)

لیکن جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ باپ اپنے بیٹے کی محض ملکیت میں آجانے سے آزاد ہوجائے گا، صاحب مظہر فرماتے ہیں کہ ''فَيُعْتِقَهُ'' میں فاسبیت کے لئے ہے۔

والجمهور على أنه يعتق بمجرد التملك من غير أن ينشيء فيه عتقا......قال المظهر فعلى هذا الفاء فى فَيُعْتِقَهُ للسببية يعنى فَيُعْتِمَهُ بسبب شرائه ولا يحتاج إلى قوله أعتقتك بعد الشراء بل عتق بنفس الشراء. (مرقاة المفاتيح: ۶/ ۵۱۰)

باب: ۲۱۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَشْيِ فِي النَّعْلِ الْوَاحِدَةِ وَفِي الْخُفِّ الْوَاحِدِ

﴿ایک پیر میں چپل اور خف پہننے کی ممانعت﴾

۱۳۵۷ - حَدَّثَنَا يُونُسُ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ أَنَّ مَالِكًا أَخْبَرَهُ، عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا يَمْشِي أَحَدُكُمْ فِي نَعْلٍ وَاحِدٍ، لِيَنْعَلْهُمَا جَمِيعًا، أَوْ لِيَخْلَعْهُمَا جَمِيعًا". (شرح مشكل الآثار: ۳/ ۳۸۶ ورقم: ۱۳۵۷، صحيح مسلم: ۱۰۰۸، رقم: ۲۰۹۷، ورواه أبوداود: (۴۱۳۶) والبخارى: (۵۸۵۵) والترمذى: (۱۷۷۴) ورواه أحمد: ۳/ ۳۶۷، ورواه مالك فى المؤطا: ۲/ ۹۲۲)

خلاصة الحديث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی دنیا والوں کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعلی اخلاق وکردار کے جامع ہیں، جس کی کوئی مثال نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر موڑ پر

مسلمانوں کی تربیت کی ہے، جہاں احادیث میں اسلام کے بنیادی قوانین اور دیگر عبادات و معاملات کا طریقہ بیان کیا ہے، وہیں معاشرتی زندگی سے متعلق بھی ہدایات دی ہیں، حتی کہ کپڑے پہننے سے لیکر جوتا اور موزہ تک پہننے کا طریقہ بتلادیا ہے، چنانچہ حدیث الباب میں ان ہی باتوں کی طرف رہنمائی فرمائی ہے؛ کہ (تم تنہا ایک پیر میں جوتا یا موزہ پہن کر مت چلو، یا تو دونوں پیر میں پہن لو یا دونوں پیروں سے اتاردو)۔

تعارض:

حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنہا ایک پیر میں جوتا یا موزہ پہننے سے منع فرمایا ہے، جبکہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک ہی جوتا میں چلتے دیکھا، تو اس اعتبار سے دونوں حدیث میں تعارض واقع ہوا ہے:

فَقَالَ قَائِلٌ مِنْ أَهْلِ الْجَهْلِ بِالْآثَارِ: كَيْفَ تَقْبَلُونَ هَذَا عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنْتُمْ تَرْوُونَ عَنْهُ؟

۱۳۶۱ - فَذَكَرَ مَا قَدْ حَدَّثَنَا أَبُو أُمَيَّةَ، .... عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: ”رُبَّمَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِي فِي نَعْلٍ وَاحِدَةٍ“. (شرح مشکل الآثار: ۳۸۸/۳)

رفع تعارض:

دراصل یہاں تعارض ہونا ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ تعارض کے شرائط میں سے ہے کہ حدیث کے برخلاف کوئی صحیح حدیث ہو، جب کے حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت میں ”مِندَل“ نامی ایک ضعیف راوی ہیں، اس بنا پر حضرت عائشہ والی روایت حدیث الباب کے معارض نہیں ہوگی، لہذا حدیث الباب پر ہی عمل ہوگا۔

بصورت دیگر اگر حضرت عائشہؓ کی روایت "رُبَّمَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِي فِي نَعْلٍ وَاحِدَةٍ" کو معارض مان بھی لیا جائے تو اس کے برخلاف بہت سی صحیح احادیث ہیں جو حدیث الباب کی تائید کرتی ہیں، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ملاحظہ ہو:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْمَشْيِ فِي النَّعْلِ الْوَاحِدَةِ ,وَقَالَ: "إِنَّ الشَّيْطَانَ يَمْشِي بِالنَّعْلِ الْوَاحِدَةِ". (شرح مشکل الآثار:۳/۳۸۷)

اسی طرح حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "نَهَى أَنْ يَمْشِيَ الرَّجُلُ فِي النَّعْلِ الْوَاحِدَةِ". (شرح مشکل الآثار:۳/۳۸۷)

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذٰلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ: أَنَّ الِاخْتِلَافَ فِي مِثْلِ هٰذَا إِنَّمَا يَكُونُ بَعْدَ تَكَافُؤِ الْأَسَانِيدِ فِيهِ ,وَثُبُوتِ الرِّوَايَاتِ لَهُ، فَأَمَّا إِذَا كَانَ بِخِلَافِ ذٰلِكَ فَلَا يَكُونُ كَمَا ذَكَرْتَ ,وَبَعْضُ رُوَاةِ الْحَدِيثِ فِي هٰذِهِ الرِّوَايَةِ لَيْسَ مِمَّنْ يُحْتَجُّ بِهِ فِيهَا وَلَا مِمَّنْ يَجُوزُ أَنْ يُعَارَضَ بِمَا رَوَى مَا رَوَاهُ الَّذِي ذَكَرْتُهُ عَنْ عَائِشَةَ، فَإِنَّمَا هُوَ مِنْ حَدِيثِ مِنْدَلٍ وَلَيْسَ مِنْ أَهْلِ التَّثَبُّتِ مِمَّنْ ذَكَرْنَا قَبْلَهُ فِي الْفَصْلِ الْأَوَّلِ مِنْ هٰذَا الْبَابِ لَا سِيَّمَا ,وَإِنَّمَا رَوَى مَا ذَكَرْتَ عَنْ لَيْثِ بْنِ أَبِي سُلَيْمٍ وَهُوَ أَيْضًا وَإِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْفَضْلِ فَإِنَّ رِوَايَتَهُ لَيْسَتْ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْأَسَانِيدِ بِالْقَوِيَّةِ، وَالَّذِي ثَبَتَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يُخَالِفُهَا عَنْ جَابِرٍ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ هُوَ أَحْسَنُ مِنْ لِبَاسِ النَّاسِ ؛ لِأَنَّ مَنْ لَبِسَ نَعْلًا وَاحِدَةً، أَوْ خُفًّا وَاحِدًا كَانَ بِذٰلِكَ عِنْدَ النَّاسِ سَخِيفًا وَسَخِرُوا مِنْهُ، فَمِثْلُ هٰذَا لَوْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ نَهْيٌ وَجَبَ أَنْ يُنْتَهَى عَنْهُ ,وَاللّٰهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار:۳/۳۸۸-۳۸۹)

یعنی امام طحاویؒ نے یہاں تعارض اور اختلاف روایت کے اصول اور ضابطہ کو

نمایاں کیا ہے کہ دو احادیث کے معنی میں تعارض کا تصور اس وقت صحیح ہوسکتا ہے، جب کہ دونوں احادیث سند اور متن کے اعتبار سے یکساں ہوں، لیکن اگر معارض حدیث سند اور متن کے اعتبار سے پہلی حدیث کے مساوی نہیں ہے تو دونوں میں تعارض نہیں ہوگا، چنانچہ یہاں حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ''مندل'' نام کے ایک راوی ضعیف ہیں، اس لئے ان کی حدیث کو حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے معارض نہیں قرار دے سکتے۔

اقوال المحدثین:

(۱) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک پیر میں جوتا پہننے سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ یہ عزت و وقار کے خلاف ہے، شیطانی طور وطریق کی مشابہت ہے جیسا کہ بائیں ہاتھ سے کھانا، نیز چلنے میں دشواری ہوتی ہے، اعتدال وتوازن سے آگے بڑھنا ہے، اور بسا اوقات ٹھوکر کھانے کا سبب بنتا ہے۔

النهی لمخالفة الوقار ، مشابهة ذی الشیطان کالأکل بالشمال، المشقة فی المشي، والخروج من الإعتدال، فربما یصیر سببا للعثار. (فتح الباری: کتاب اللباس:قوله باب یبدأ بالنعل الیمنیٰ:۱۰/۳۱۰،رقم:۵۸۵۵)

(۲) ''بذل المجهود'' میں ہے کہ: ابن قتیبہ نے حدیث الباب اور حدیث عائشہؓ ''ربما یَمْشِي فِي نَعْلٍ وَاحِدَةٍ'' کے درمیان قلت و کثرت کے اعتبار سے تطبیق دی ہے۔

وجمع ابن قتیبة (ص:۱۰۲) بینه وبین حدیث عائشة رضی اله عنها "ربما مشِي فِي النَعْلِ الوَاحِدَةِ" بالقلة والکثرة. (حاشیة بذل المجهود:۱۲/۱۶۵)

نیز حافظ ابن حجرؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک جوتے میں چلنے سے منع فرمایا، تاکہ ایک پیر جوتے سے اونچا نہ ہو اور یہ ٹھوکر کا سبب بنے، اور ایسا کرنے

والے کوملامت کی جائے۔

وقال فی "النهاية" : إنما نهی عن المشي فی نعل واحد لئلا تكون إحدى الرجلين ارفع من الأخرى ويكون سبباً للعثار، ويعاب فاعله. (بذل المجهود: كتاب اللباس: باب فی الإنتعال: ۱۲/۱۶٦، رقم: ۴۱۳۶)

باب: ۲۱۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي اسْتِغْفَارِهِ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ لِلْمُحَلِّقِينَ مَرَّتَيْنِ وَلِلْمُقَصِّرِينَ مَرَّةً

﴿تقصیر کے مقابلہ میں حلق کی فضیلت﴾

۱۳٦۲- حَدَّثَنَا يُونُسُ، قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ، أَنَّ مَالِكًا، حَدَّثَهُ عَنْ نَافِعٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: " اللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِينَ " قَالُوا: وَالْمُقَصِّرِينَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: "اللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِينَ" قَالُوا: وَالْمُقَصِّرِينَ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ: "وَالْمُقَصِّرِينَ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۹۰، والبخاری: ح-۱۷۲۷، مسلم: ح-۱۳۰۱، ابوداود: ح-۱۹۷۹)

خلاصۃ الحدیث:

صحابۂ کرام وہ مقدس ہستیاں ہیں جو انبیاء کرامؑ کے بعد تمام انسانوں میں سب سے زیادہ تعظیم واحترام کے لائق ہیں، جنہوں نے اسلام کے آفاقی اور ابدی پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو ہر چیز پر ترجیح دینا ان کا شیوہ تھا، اسی بنا پر وہ جماعت ہر قول وعمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور آپ

کے حکم کو مقدم رکھتی تھیں، چاہے وہ قول وعمل عقل کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، مگر صلحِ حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو احرام سے نکلنے کے لئے حلق کا جب حکم دیا تو بعض صحابہؓ نے فوری طور پر اس حکم کی تعمیل نہیں کی، چوں کہ جب یہ بات ہوگئی کہ اس وقت بغیر دخول مکہ اور بغیر ادائے عمرہ کے واپس مدینہ جانا ہے، اور صحابہ کرام کا عزم عمرۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواب کی بنا پر ہوا تھا، جو ایک وحی تھی، اب بظاہر اس کے خلاف ہوتا ہوا دیکھا کہ بعض صحابہ کے دلوں میں خود یہ شکوک پیدا ہونے لگے کہ (معاذ اللہ) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب سچا نہ ہوا، اس لئے دو صحابہ نے حکم کی تعمیل میں تاخیر کی) دراصل ان کا یہ خیال تھا کہ قانون اور قواعد شریعت کے اعتبار سے یہ حلق کا موقع نہیں ہے، (حلق نہ کرنے والے صحابہ کم تعداد میں تھے، حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث میں ہے کہ وہ دو صحابی تھے۔ (شرح مشکل الآثار: ج:۳/۳۹۶)

جبکہ دیگر تمام صحابہ کرام نے عقل اور رائے کے خلاف امتثالِ امر کو ترجیح دی، جیسا کہ صحابہ کا یہی شیوہ تھا، اور حکم کی تعمیل پر پورے اترے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلق کرنے والے صحابہ پر تین مرتبہ رحمت ومغفرت کی دعا فرمائی؛ جبکہ قصر کرنے والے صحابہ پر ایک ہی مرتبہ، جیسا کہ حدیث الباب میں مذکور ہے۔

سوال:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اصحابِ حدیبیہ کے لئے حلق اور قصر دونوں کو مباح قرار دیا تھا اور صحابہ نے حکم کی تعمیل بھی کی، چنانچہ بعض صحابہ نے حلق کیا، بعض نے قصر، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلق کرنے والوں کو افضل کیوں قرار دیا اور حلق کرنے والوں کے لئے تین مرتبہ دعا کی اور قصر کرنے والوں کے لئے ایک مرتبہ؟

قَالَ قَائِلٌ: قَدْ أَبَاحَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي كِتَابِهِ الْحَلْقَ وَالتَّقْصِيرَ فِي الْإِحْرَامِ وَوَصَفَ

أَهْلَ الْحُدَيْبِيَةِ بِدُخُولِهِمُ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ عَلَيْهِ , وَوَعَدَهُمْ ذَلِكَ فَقَالَ: ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ﴾ , فَكَأَنَّ "الْمُحَلِّقِينَ" بِأَمْرِ اللهِ تَعَالَى حَلَقُوا "وَالْمُقَصِّرِينَ" بِأَمْرِ اللهِ قَصَّرُوا , فَمِنْ أَيْنَ فُضِّلَ الْمُحَلِّقُونَ فِي ذَلِكَ عَلَى الْمُقَصِّرِينَ؟ (شرح مشکل الآثار:۳۹۱/۳)

جواب:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں اس کا جواب موجود ہے کہ صحابہ نے آپ ﷺ سے پوچھا آپ نے حلق کرنے والوں کے ساتھ رحم کا زیادہ اظہار فرمایا اس کی وجہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ حلق کرنے والے صحابہ نے فوری طور پر حکم کی تعمیل کی، جبکہ حلق کرنا ان کے عقل کے خلاف عمل تھا اور ان پر شاق تھا، اس لئے اس کے مقابل قصر کرنے والے صحابہ حلق کرنے سے پیچھے ہٹے اور حکم کی تعمیل میں شک کیا، اور ان کا شک اس وجہ سے تھا کہ ابھی حلق کرنے کا موقع نہیں تھا، اس کا وقت تو عمرہ اور حج کے بعد ہے، اس لئے انہوں نے قصر کیا، حالانکہ ان کو اپنی عقل اور رائے کے مقابلہ میں آپ ﷺ کے حکم کی اتباع اور اقتداء کرنی چاہئے تھی، اس لئے امتثالِ امر اور اتباعِ رسول ﷺ کی وجہ سے حلق کرنے والے صحابہ کو افضل قرار دیا اور حلق کرنے والوں کے لئے تین مرتبہ دعا کی اور قصر کرنے والوں کے لئے ایک مرتبہ۔

قِيلَ لَهُ: لِمَعْنًى قَدْ رُوِيَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ فِيهِ، .... عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: حَلَقَ رِجَالٌ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ وَقَصَّرَ آخَرُونَ، ..... قَالُوا: فَمَا بَالُ الْمُحَلِّقِينَ ظَاهَرْتَ لَهُمْ بِالتَّرَحُّمِ؟ قَالَ: "إِنَّهُمْ لَمْ يَشُكُّوا" .....فَكَانَ فِيمَا رَوَيْنَا تَفْضِيلُ الْمُحَلِّقِينَ عَلَى الْمُقَصِّرِينَ ; لِأَنَّهُمْ لَمْ يَشُكُّوا، ...... فَكَانَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّهُ كَانَ فِي قُلُوبِهِمْ أَنَّهُمْ رَأَوْا رَسُولَ اللهِ صَلَّى

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَلَقَ فِي غَيْرِ مَوْضِعِ الْحَلْقِ الَّذِي كَانُوا يَعْلَمُونَ الْحَلْقَ فِيهِ وَيَقِفُونَ عَلَيْهِ مِنْ شَرِيعَتِهِ ، وَقَدْ كَانَ يَجِبُ عَلَيْهِمْ أَنْ يَكُونَ اقْتِدَاؤُهُمْ وَاتِّبَاعُهُمْ لَهُ فِيمَا رَأَوْهُ يَفْعَلُهُ أَوْثَقَ فِي قُلُوبِهِمْ مِمَّا تَقَدَّمَ عِلْمُهُمْ لَهُ مِنْهُ قَبْلَ ذَلِكَ ، وَكَانُوا بِذَلِكَ مُقَصِّرِينَ فِي الْوَاجِبِ لَهُ عَلَيْهِمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ذَلِكَ ، وَكَانَ الْحَالِقُونَ فَاعِلِينَ لِمَا يَجِبُ عَلَيْهِمْ مِنَ امْتِثَالِ فِعْلِهِ ، وَتَرْكِ التَّخَلُّفِ عَنِ الْقُدْوَةِ بِهِ فَفَضَلُوا بِذَلِكَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْ مِثْلِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۳/ ۳۹۱،۳۹۲)

اطاعتِ رسول اور امتثالِ امر میں سبقت کرنے والے دو صحابہ کرام کی مثالیں:

(۱) واقعۂ معراج کے موقع پر، رات کے مختصر وقت میں بیداری کی حالت میں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اور وہاں سے عرش الٰہی میں حضوری، پھر دوبارہ مکہ مکرمہ آنا، اتنے مختصر وقت میں کہ حضرت ام ہانی کے گھر کی کنڈی ہل رہی تھی جیسے جاتے وقت ہل رہی تھی، یہ تمام باتیں عقل کے پیمانے پر نہیں اتر رہی تھیں؛ لیکن اس واقعہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے حضرت ابوبکرؓ تھے، اسی سبقت کی وجہ سے وہ ''صدیق'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔

(۲) اسی طرح ایک اور واقعہ ہے کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعرابی سے اونٹ خریدا، لیکن خرید وفروخت ہوجانے کے باوجود منافقوں کے بھڑکانے کی وجہ سے اعرابی نے بیع کا انکار کردیا کہ میں نے بیچا ہی نہیں ہے، تو اس موقع پر حضرت خزیمہ بن ثابتؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محض صادق ہونے کی وجہ سے آپ کے حق میں گواہ دی، اور کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی تصدیق کروں، لیکن بدّو اعرابی سے اونٹ خریدنے کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ کی تصدیق نہ کروں؟ تو حضرت خزیمہؓ کے اس عمل کی وجہ سے

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو یہ شرف بخشا کہ تنہا حضرت خزیمہؓ کی گواہی دو شخص کی گواہی کے برابر قرار دیا، خلاصۂ کلام یہ کہ امام طحاویؒ ان مذکورہ مثال سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق میں سبقت کرنے کی وجہ سے جیسے دو صحابی فضیلت کے مستحق ہوئے اسی طرح مذکورہ حدیث الباب میں اطاعت رسول میں سبقت کرنے والے صحابہ (حلق کرنے والے) فضیلت کے مستحق ہوئے۔

وَلَكِنْ ؛ لِأَنَّ السَّبْقَ إِلَى الْمَعْرِفَةِ لِلْأَشْيَاءِ يُوجِبُ الْفَضِيلَةَ لِلسَّابِقِينَ إِلَيْهَا كَمَا وَجَبَ لِأَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ بِسَبْقِهِ النَّاسَ إِلَى تَصْدِيقِهِ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى إِتْيَانِهِ بَيْتَ الْمَقْدِسِ مِنْ مَكَّةَ وَرُجُوعِهِ مِنْهُ إِلَى مَنْزِلِهِ بِمَكَّةَ فِي تِلْكَ اللَّيْلَةِ حَتَّى سُمِّيَ بِذَلِكَ الصِّدِّيقَ، ......

وَكَمَا اسْتَحَقَّ خُزَيْمَةُ بْنُ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيُّ أَنْ جُعِلَتْ شَهَادَتُهُ شَهَادَةَ رَجُلَيْنِ لَمَّا شَهِدَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْأَعْرَابِيِّ أَنَّهُ بَايَعَهُ الْبَعِيرَ الَّذِي كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْتَاعَهُ مِنْهُ عِنْدَ جُحُودِ الْأَعْرَابِيِّ ذَلِكَ وَعِنْدَ قَوْلِهِ لَهُ: هَلُمَّ شَهِيدًا يَشْهَدُ لَكَ فَلَمَّا شَهِدَ لَهُ خُزَيْمَةُ بِمَا شَهِدَ لَهُ بِهِ قَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كَيْفَ شَهِدْتَ وَلَمْ تَكُنْ مَعَنَا؟" قَالَ: شَهِدْتُ بِتَصْدِيقِكَ، فَجَعَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذَلِكَ شَهَادَتَهُ بِشَهَادَةِ رَجُلَيْنِ....

وَلَكِنَّ خُزَيْمَةَ لَمَّا سَبَقَهُمْ إِلَى ذَلِكَ اسْتَحَقَّ الْفَضِيلَةَ عَلَيْهِمْ فِيهِ، فَمِثْلُ ذَلِكَ الْمُحَلِّقُونَ اسْتَحَقُّوا الْفَضِيلَةَ عَلَى الْمُقَصِّرِينَ بِسَبْقِهِمْ إِيَّاهُمْ إِلَى طَاعَةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۹۴)

باب: ۲۱۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمُفَصَّلِ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ؟

﴿قرآنِ کریم کی مفصل سورتوں کی نشان دہی﴾

۱۳۷۰ - حَدَّثَنَا أَبُو أُمَيَّةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْقَاسِمِ الْحَرَّانِيُّ ..... عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حَبِيبٍ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ السُّلَمِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ مَسْعُودٍ يَقُولُ: "أَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى رَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُفَصَّلَ بِمَكَّةَ فَكُنَّا حِجَجًا نَقْرَؤُهُ لَا يَنْزِلُ غَيْرُهُ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۹۷، ورواہ أحمد: ۴/۲۷۹، وذکرہ الهیثمی فی المجمع: ۷/۱۰۸-۱۰۹)

خلاصۃ الحدیث:

نماز دین اسلام کا ایک اہم بنیادی رکن ہے، نماز دین کا ستون ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، نماز قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے، مومنین کے لئے معراج ہے، نماز مومن اور کافر میں حد فاصل ہے، الغرض بدنی عبادات میں سب سے مہتم بالشان عبادت اگر ہے تو وہ نماز ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ نماز کی اصل روح قرآن مجید کی تلاوت ہے، جس کے ذریعہ مصلی کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اسی تلاوت قرآن کی وجہ سے قیام کو دیگر ارکان رکوع وسجدہ پر فوقیت اور اَولَوِیّت حاصل ہے، اس لئے نماز میں قرأتِ قرآن سنت کے مطابق کرنی چاہئے، اور سنت قرآت یہ ہے کہ نماز میں مفصل سورتوں کے اعتبار سے قرأت کی جائے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ فجر اور ظہر میں طوال مفصل (یعنی سورہ حجرات سے سورۂ بروج تک)، عصر

وعشاء میں اوساط مفصل (سورۂ بروج سے سورۂ لم یکن تک) اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل (سورۂ لم یکن سے اخیر تک) والی سورتوں کی قرأت کی جائے۔

لیکن یہاں امام طحاویؒ مذکورہ باب اور حدیث الباب کو پیش کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سورۂ حجرات مفصل سورتوں میں سے نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث الباب میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مفصل سورتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۂ حجرات کا مفصل سورتوں میں نہ ہونے کی دلیل:

اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ مفصل وہ سورتیں ہیں جن کا نزول مکہ میں ہوا ہو، لیکن سورۂ حجرات میں جو واقعات ہیں، ان کا تعلق مدینہ سے ہے، اس بنا پر یہ سورہ مدنی ہے، اور مفصل سورتوں میں سے نہیں ہے۔

(۱) ایک واقعہ یہ ہے کہ جب بنو تمیم کا وفد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو حضرت ابو بکرؓ نے مشورہ دیا کہ اس وفد کا امیر قعقع بن معبد بن زرارہ کو بنایا جائے، جب کے حضرت عمرؓ نے اقرع بن حابس کو امیر بنانے کا مشورہ دیا تھا، اور مشاورتی مجلس میں اختلاف کی وجہ سے آواز بلند ہوگئی تو اس وقت سورہ حجرات کی یہ آیت ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللهِ وَرَسُولِهِ﴾ [الحجرات: ۱] نازل ہوئی، اس آیت کے نزول کے بعد حضرت ثابت بن قیس بن شماس گھر میں بیٹھ گئے، چوں کے ان کی آواز بلند تھی، وہ سمجھے کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اہل جنت میں سے ہونے کی بشارت دی اور گھر سے باہر نکلنے کا حکم دیا، الغرض یہ واقعہ مدینہ میں پیش آیا تھا، جیسا کہ اس کو امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى أَنَّ سُورَةَ الْحُجُرَاتِ لَيْسَتْ مِنْهُ،

وَأَنَّهَا مَدَنِيَّةٌ ؛ لِأَنَّ فِيهَا نَهْيَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ النَّاسَ أَنْ يَرْفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَإِنَّمَا كَانَ ذَلِكَ فِي الْخَبَرِ الَّذِي ظَنَّ ثَابِتُ بْنُ قَيْسِ بْنِ شِمَاسٍ الْأَنْصَارِيُّ فِيهِ بِنَفْسِهِ مَا ظَنَّ حَتَّى جَلَسَ فِي بَيْتِهِ ، فَأَعْلَمَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا كَانَ سَبَبَ رُجُوعِهِ إِلَى مَجْلِسِهِ ؛ وَلِأَنَّ فِيهَا: ﴿لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللهِ وَرَسُولِهِ﴾ [الحجرات: ۱] وَإِنَّمَا كَانَ سَبَبُ نُزُولِ ذَلِكَ عَلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا كَانَ مِنْ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ مِنْ مَشُورَةِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَلَيْهِ بِتَوْلِيَةِ مَنْ أَشَارَ عَلَيْهِ بِتَوْلِيَتِهِ مِنَ الْأَقْرَعِ بْنِ حَابِسٍ وَمِنَ الْقَعْقَاعِ . (شرح مشکل الآثار: ۳/ ۳۹۷، ۳۹۸)

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنوالمصطلق کی طرف (جو مسلمان ہو چکے تھے) اپنے نمائندہ ولید بن عقبہ کو بھیجا، جب ان کے پاس نمائندۂ نبوی پہنچے تو ان کی تعظیم وتوقیر کے لئے آبادی سے باہر نکل آئے، چنانچہ ولید نے یہ سمجھا کہ یہ لوگ ان کے قتل کے درپے ہیں، تو ولید الٹے پاؤں واپس چلے آئے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آکر یہ اطلاع دی کہ یہ لوگ مرتد ہو گئے ہیں، زکوۃ ادا کرنے سے اعراض کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے جہاد کرنے کا ارادہ فرمالیا، ابھی تیاری کے مرحلے میں تھے کہ بنوالمصطلق کا وفد آیا اور یہ عرض کیا کہ آپ کے قاصد آرہے تھے ہم لوگ استقبال کے لئے نکلے تھے کہ ان کی خدمت میں زکوۃ پیش کریں گے، لیکن وہ یہ خیال کر کے واپس چلے گئے کہ ہم لوگ ان سے جنگ کے لئے نکلے ہیں؛ حالانکہ یہ غلط ہے، اسی موقع سے آیت ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللهِ وَرَسُولِهِ﴾ [الحجرات: ۱] نازل ہوئی۔

فَكَانَ سَبَبُ نُزُولِ ذَلِكَ فِي الَّذِي بَعَثَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُصَدِّقًا إِلَى قَوْمٍ فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ لِيُكْرِمُوهُ فَلَمَّا رَآهُمْ مُقْبِلِينَ نَحْوَهُ أَدْبَرَ هَارِبًا إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَهُ عَنْهُمْ بِخِلَافِ ذَلِكَ , وَجَاءُوا مِنْ بَعْدُ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فَأَخْبَرُوهُ بِحَقِيقَةِ أَمْرِهِمْ. (شرح مشکل الآثار: ۳۹۸/۳)

اسی طرح ایک اور آیت ﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات: ۹]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مذکورہ دلائل سے معلوم ہوا کہ سورۂ حجرات ان مفصلات میں سے نہیں ہے، اس لئے کہ سورۂ حجرات مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اور مفصل کا شمار ان سورتوں میں سے ہوتا ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہوں۔

وَإِذَا انْتَفَى أَنْ تَكُونَ الْحُجُرَاتُ مِنَ الْمُفَصَّلِ لِمَا قَدْ ذَكَرْنَا ; وَلِأَنَّ الْحُجُرَاتِ لَمْ تَكُنْ إِلَّا بِالْمَدِينَةِ كَانَ أَوَّلُهُ قَافٌ ثُمَّ نَظَرْنَا إِلَى مَا يَدُلُّ عَلَى ذَلِكَ سِوَى هَذَا الْحَدِيثِ. (شرح مشکل الآثار: ۳۹۹/۳)

مزید وضاحت:

امام طحاویؒ نے انے مسلک کی تائید وتوثیق کے لئے حضرت عثمان بن عبداللہ بن اوس کی حدیث پیش کی ہے جس میں ''وفد ثقیف کا مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آنے کا ذکر ہے کہ یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں لمبے عرصے تک رہے، اس وفد کے لوگوں نے صحابہ کرام سے استفسار کیا کہ تم قرآن کریم کتنے حصوں میں تقسیم کر کے پڑھتے ہو، صحابہ کرام نے جواب دیا کہ ہم لوگوں نے سات حصوں میں تقسیم کیا ہے (جن کو سات منزل کہتے ہیں) پہلی منزل میں تین سورتیں (سورہ بقرۂ، آل عمران، نساء) ہیں، دوسری منزل میں پانچ سورتیں (مائدہ ۔۔۔انعام، اعراف، انفال، براءۃ) اور تیسرے منزل میں سات سورتیں (سورۂ یونس، ہود، یوسف، رعد، ابراہیم، حجر، نمل، چوتھی منزل میں نوسورتیں (بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج، مؤمنون، نور، فرقان، پانچویں منزل میں گیارہ سورتیں (سورۂ شعراء، عنکبوت، روم، لقمان،

سجدہ، احزاب، سبا، فاطر، یٰسین، اور چھٹی منزل میں تیرہ (۱۳) سورتیں ہیں افات، ص، زمر، حٰم، محمد، الفتح، الحجرات اور آخری منزل میں مفصل سورتیں ہیں؛ لیکن مفصل سورتوں میں سورۂ حجرات کو شمار نہیں کیا ہے، اس لئے منزلوں کی تفصیل سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ سورہ حجرات مفصلات سے خارج ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ فَفِيمَا رَوَيْنَا مِنْ هَذِهِ الْآثَارِ تَحْقِيقُ أَمْرِ الْحُجُرَاتِ أَنَّهَا لَيْسَتْ مِنَ الْمُفَصَّلِ وَأَنَّ الْمُفَصَّلَ مَا بَعْدَهَا إِلَى آخِرِ الْقُرْآنِ. (شرح مشکل الآثار: ۴۰۲/۳)

سوال:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت زرؒ کی حدیث میں حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف میں سورۂ رحمٰن کو مفصلات کی پہلی سورہ قرار دیا ہے، اس اعتبار سے سورۂ حجرات بھی مفصل میں داخل نہیں ہوگی، بلکہ وہ اس سے خارج ہوگی۔

قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ عَنْ عَاصِمِ ابْنِ بَهْدَلَةَ عَنْ زِرٍّ قَالَ: "كَانَ أَوَّلُ مُفَصَّلِ ابْنِ مَسْعُودٍ الرَّحْمَنَ". (شرح مشکل الآثار: ۴۰۲/۳)

جواب:

حقیقت یہ ہے کہ اول سورۃ من المفصل کے سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے، دوسری طرف حضرت ابن مسعودؓ کی سورکی ترتیب مصحف عثمانی سے مختلف تھی، اس کی تائید صحیح بخاری کی حدیث سے ہوتی ہے، لیکن اس سے متضاد یا مقابل مصحف عثمانی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیوں کہ کوئی صحابی ہمہ وقت خدمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر نہیں رہتے تھے، اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر کوئی سورت یا آیت املا کروائی تو وہ غائب، حاضرین صحابہ سے نقل کرتے۔

اس صورت میں مصحف میں جو ان کی ذاتی بیاض کی حیثیت رکھتا تھا، ترتیب کا بدل جانا کوئی معنی نہیں رکھتا، نیز یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ صحابہ کے ذاتی مصاحف تھے، جو ایک دوسرے سے بہر حال ترتیب میں مختلف ہی تھے، لہذا اختلاف سور کا اعتراض اور اسے بطور دلیل پیش کرنا غیر محققانہ ہے۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن رقم الحدیث: ۴۹۹۳، ط: دار الفکر)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَهَذَا عِنْدَنَا وَاللهُ أَعْلَمُ إِنَّمَا جَاءَ لِاخْتِلَافِ تَأْلِيفِ السُّوَرِ عِنْدَ ابْنِ مَسْعُودٍ وَعِنْدَ غَيْرِهِ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِينَ تَوَلَّوْا كِتَابَةَ الْقُرْآنِ فِي عَهْدِ عُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَعَنْهُمْ، وَهُوَ التَّأْلِيفُ الَّذِي هُوَ الْحُجَّةُ وَقَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ كَانَ فِي تَأْلِيفِ ابْنِ مَسْعُودٍ بَعْدَ سُورَةِ الرَّحْمَنِ قَاف وَالذَّارِيَاتُ وَمَا سِوَاهُمَا مِنَ السُّوَرِ الَّتِي بَيْنَهَا وَبَيْنَ سُورَةِ الرَّحْمَنِ، وَتَكُونُ الْحُجُرَاتُ خَارِجَةً مِنْ ذَلِكَ رَاجِعَةً إِلَى مِثْلِ مَا هِيَ عَلَيْهِ مِنْ تَحْزِيبِ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِي قَدْ ذَكَرْنَا فِي حَدِيثِ أَوْسِ بْنِ حُذَيْفَةَ وَفِي حَدِيثِ وَكِيعٍ الَّذِي قَدْ رَوَيْنَاهُ فِي هَذَا الْبَابِ مِنْ أَحَادِيثِ أَوْسِ بْنِ حُذَيْفَةَ حَرْفٌ يَجِبُ أَنْ يُوقَفَ عَلَيْهِ، وَهُوَ قَوْلُهُ فِيهِ فَقُلْتُ: كَيْفَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَزِّبُ الْقُرْآنَ؟ فَفِي ذَلِكَ إِضَافَةُ تَحْزِيبِهِ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَفِي حَدِيثِ غَيْرِهِ مِمَّا رَجَعَ إِلَى حَدِيثِ أَوْسِ بْنِ حُذَيْفَةَ قَالَ أَوْسٌ: فَسَأَلْتُ أَصْحَابَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَيْفَ تُحَزِّبُونَ الْقُرْآنَ؟ فَأَضَافَ التَّحْزِيبَ إِلَيْهِمْ لَا إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَاللهُ أَعْلَمُ كَيْفَ الْحَقِيقَةُ فِي ذَلِكَ وَإِيَّاهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۳/۲۰۴)

اقوال المحدثین:

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی سورتوں کی موجودہ ترتیب وہی ہے جو عہد نبوی

میں تھی، ''حدیث اوس بن حذیفہ الثقفی'' سے یہ مستفاد ہوا کہ حزب مفصل میں راجح قول کے مطابق سورۂ ''ق'' کے شروع سے لے کر آخر قرآن تک ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ سورۃ الفاتحہ ثلث اول میں شمار نہیں کی گئی ہو، کیوں کہ جو اسے شمار کرتا ہے اس پر مفصل کی ابتدا سورۂ ''ق'' کے بجائے سورۂ ''الحجرات'' سے کرنا لازم آتا ہے، کہ وہ مفصل کی ابتداء بجائے ''ق'' کے ''الحجرات'' سے کرے، ائمہ کی ایک جماعت کا اس پر اتفاق ہے۔

قُلْتُ فَهَذَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ تَرْتِيبَ السُّوَرِ عَلَى مَا هُوَ فِي الْمُصْحَفِ الْآنَ كَانَ فِي عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَحْتَمِلُ أَنَّ الَّذِي كَانَ مُرَتَّبًا حِينَئِذٍ حِزْبُ الْمُفَصَّلِ خَاصَّةً بِخِلَافِ مَا عَدَاهُ فَيَحْتَمِلُ أَنْ يَكُونَ كَانَ فِيهِ تَقْدِيمٌ وَتَأْخِيرٌ كَمَا ثَبَتَ مِنْ حَدِيثِ حُذَيْفَةَ أَنَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ النِّسَاءَ بَعْدَ الْبَقَرَةِ قَبْلَ آلِ عُمْرَانَ وَيُسْتَفَادُ مِنْ هَذَا الْحَدِيثِ حَدِيثِ أَوْسٍ أَنَّ الرَّاجِحَ فِي الْمُفَصَّلِ أَنَّهُ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ ق إِلَى آخِرِ الْقُرْآنِ لَكِنَّهُ مَبْنِيٌّ عَلَى أَنَّ الْفَاتِحَةَ لَمْ تُعَدَّ فِي الثُّلُثِ الْأَوَّلِ فَإِنَّهُ يَلْزَمُ مِنْ عَدِّهَا أَنْ يَكُونَ أَوَّلُ الْمُفَصَّلِ مِنَ الْحُجُرَاتِ وَبِهِ جَزَمَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْأَئِمَّةِ وَقَدْ نَقَلْنَا الِاخْتِلَافَ فِي تَحْدِيدِهِ فِي بَابِ الْجَهْرِ بِالْقِرَاءَةِ فِي الْمَغْرِبِ مِنْ أَبْوَابِ صِفَةِ الصَّلَاةِ وَاللَّهُ أعلم. (فتح الباری: ۹/۶۰، رقم: ۴۹۹۶)

ملا علی قاریؒ رقم طراز ہیں:

علامہ میرکؒ نے ازہار سے نقل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے، کہ اول مفصل کے سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے (۱) ایک قول یہ ہے کہ مفصل سورتوں کی ابتداء سورۂ محمد سے ہوتی ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ مفصل کی پہلی سورت سورۃ الفتح ہے، (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ مفصل سورتوں کی ابتداء سورۃ الحجرات سے ہوتی ہے، اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔

قال میرك نقلا عن الأزهار: إختلف فی أول المفصل قيل: سورة محمد وقيل:

سورة الفتح، وقيل سورة الحجرات وهو الأشهر. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، كتاب الصلاة: ج:۲، ص:۵۷۷، رقم الحديث: ۸۵۳، دار الفكر بيروت، لبنان)

قرآن مجید کے آخری حصہ کو مفصل کہا جاتا ہے، یہی مشہور قول ہے، اور اسی پر عمل بھی ہے، مفصل کے معنی ہیں جدا ہونا، چوں کہ سورہ حجرات سے اخیر تک جو سورتیں ہیں وہ چھوٹی چھوٹی ہیں، اور درمیان میں بسم اللہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا (الگ الگ) ہیں، پھر ان مفصل سورتوں کی تین قسم کی گئی ہے، طوال، اوساط، قصار۔

سورۂ حجرات سے سورۂ بروج تک طوال، سورۂ بروج سے لم یکن تک کی سورتوں کو اوساط اور لم یکن سے اخیر تک جو صورتیں ہیں ان کو قصار مفصل کہا جاتا ہے۔ (مظاہر حق شرح مشکوۃ شریف: ج:۱، ص:۱۰۷، ادارہ اسلامیات، دیوبند، یو. پی)

باب: ۲۱۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا اخْتُلِفَ فِيهِ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فِي الْأَنْفَالِ وَبَرَاءَةَ وَهَلْ هُمَا سُورَتَانِ أَوْ سُورَةٌ وَاحِدَةٌ؟

سورۂ انفال اور براءت کے سلسلہ میں حضرت عثمان اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف

۱۳۷۴ - حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ سِنَانٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ حُمْرَانَ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَوْفٌ، عَنْ يَزِيدَ الْفَارِسِيِّ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قُلْتُ لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ مَا حَمَلَكُمْ عَلَى أَنْ عَمَدْتُمْ إِلَى الْأَنْفَالِ وَهِيَ مِنَ الْمَثَانِي وَإِلَى بَرَاءَةَ وَهِيَ مِنَ الْمِئِينَ فَقَرَنْتُمْ بَيْنَهُمَا، وَلَمْ تَكْتُبُوا بَيْنَهُمَا سَطْرًا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، وَوَضَعْتُمُوهَا فِي السَّبْعِ الطِّوَالِ فَمَا حَمَلَكُمْ عَلَى ذٰلِكَ؟ قَالَ: فَقَالَ عُثْمَانُ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَهُوَ يَنْزِلُ

عَلَيْهِ مِنَ السُّوَرِ ذَوَاتِ الْعَدَدِ فَكَانَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الشَّيْءُ دَخَلَ بَعْضُ مَنْ يَكْتُبُ لَهُ فَيَقُولُ: "ضَعُوا هَذَا فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا "..... (شرح مشکل الآثار: ۴۰۳/۳، ورواہ البخاری (۴۶۴۵) ورواہ مسلم (۳۰۳۱)

خلاصۃ الحدیث:

قرآن مجید وہ آسمانی لازوال کتاب ہے جو پوری انسانیت کیلئے دستور حیات ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے تدریجاً تیئس سال میں نازل فرمایا، جب بھی کوئی آیت کریمہ نازل ہوتی، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کاتبین کو بلاتے اور نازل شدہ آیت کریمہ لکھنے کا حکم فرماتے، اور یہ بھی رہنمائی فرماتے کہ یہ آیت فلاں فلاں جگہ فلاں فلاں سورت میں لکھنی ہے، اسی طرح جب سورت ختم ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھنے کا حکم فرماتے، جس سے ایک سورت کے ختم ہونے اور دوسری سورت کے شروع ہونے کا علم ہوجاتا، لیکن جب سورۂ برات لکھنے کا موقع آیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ تو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھنے کا حکم دیا، اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی وضاحت فرمائی، کہ یہ دونوں علاحدہ علاحدہ سورتیں ہیں یا دونوں ایک ہی سورت، اسی وجہ سے جب حضرت عثمان غنیؓ نے جمع قرآن کا عمل کیا تو دونوں کو ملادیا، اس احتمال سے کہ دونوں ایک ہی سورت ہیں، البتہ دونوں کے درمیان تھوڑی جگہ چھوڑ دی، تاکہ دونوں کے درمیان فرق ہوجائے کیوں کہ دونوں کے علاحدہ ہونے کا بھی احتمال تھا، اسی مضمون کو حدیث الباب میں واضح کیا گیا ہے۔

امام طحاویؒ نے حدیث الباب سے حضرت عثمانؓ کی رائے اخذ کرکے لکھا ہے کہ آپؓ کی رائے یہ تھی کہ دونوں ایک ہی سورت ہیں، لیکن حضرت ابن عباسؓ کی تحقیق یہ ہے کہ دونوں علیٰحدہ سورتیں ہیں، اس بات کی تائید حضرت اوس بن حذیفہؓ کی ایک روایت سے ہوتی ہے جو ماقبل کے باب میں گزر چکی ہے، اس سے دونوں سورتوں کے علیٰحدہ ہونے کا علم ہوتا ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ ظَنَّ عُثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّهُمَا سُورَةٌ وَاحِدَةٌ وَتَحْقِيقُ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُمَا سُورَتَانِ ، وَإِذَا كَانَ تَحْزِيبُ الْقُرْآنِ عَلَى مَا فِي حَدِيثِ أَوْسِ بْنِ حُذَيْفَةَ الَّذِي ذَكَرْنَاهُ فِي الْبَابِ الَّذِي قَبْلَ هَذَا الْبَابِ وَجَبَ أَنْ تَكُونَا سُورَتَيْنِ كَمَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ. (شرح مشکل الآثار:۳/۴۰۴)

سورۂ توبہ کے شروع میں ترک تسمیہ کی وجہ:

بسم اللہ اس وجہ سے نہیں لکھی گئی کہ سورۂ برات کا اول حصہ عذاب وغضب کے سلسلہ میں نازل ہوا ہے، اور بسم اللہ رحمت اور برکت کے قبیل سے ہے، اور رحمت اور غضب دونوں اضداد کے قبیل سے ہیں، دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں، لہذا بسم اللہ ترک کردی گئی، چنانچہ امام طحاویؒ لکھتے ہیں:

......إِنَّمَا كَانَ تَرْكُهُمْ لِكِتَابَتِهَا بَيْنَ الْأَنْفَالِ وَبَيْنَ بَرَاءَةَ؛ لِأَنَّ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ حُرُوفُ رَحْمَةٍ وَسُورَةُ بَرَاءَةَ لَيْسَتْ مِنْ هَذَا الْمَعْنَى الَّذِي مِنْ جِنْسِ مَا يُرَادُ بِهِ الرَّحْمَةُ ، وَإِنَّمَا هِيَ نَقْضُ عُهُودٍ، وَنِذَارَاتٌ، وَوَعِيدَاتٌ وَتَخْوِيفَاتٌ، وَإِبَانَةُ نِفَاقٍ مِمَّنْ نَافَقَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَاسْتَحَقَّ بِهِ مَا اسْتَحَقَّ مِنَ الْعَذَابِ ، وَالتَّخْلِيدِ فِي النَّارِ، فَلَمْ يَرَوْا مَعَ ذَلِكَ أَنْ يَكْتُبُوا فِي أَوَّلِهَا سَطْرًا: بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ... (شرح مشکل الآثار:۳/۴۱۰)

توجیہ پر رد اور اس کا جواب:

سابقہ توجیہ پر امام طحاویؒ نے رد کرتے ہوئے جواب دیا ہے کہ قرآن کریم میں دوسری بہت ساری سورتیں ہیں جن میں عذاب اور وعید کا تذکرہ ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے شروع میں بسم اللہ لکھی گئی ہے جیسے (سورۂ لہب) (پ:۳۰، سورۂ:۱۱۱) ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ﴾

اورسورۂ ہمزۃ: (پ:۳۰،سورت: ۱۰۴)﴿وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ حالانکہ سورۂ براءت میں تو بہت ساری آیتیں رحمت کی بھی ہیں اور یہ سورتیں تو مستقلاً عذاب و وعید کے باب میں نازل ہوئی ہیں، پھر بھی ان کے شروع میں بسم اللہ لکھی گئی، یہاں یہ توجیہ درست نہیں ہے۔

وَقَدْ دَخَلَ عَلَى أَهْلِ هَذِهِ الْمَقَالَةِ فِي مَقَالَتِهِمْ هَذِهِ أَنَّ فِي كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ سُورَتَيْنِ مِنْ سُوَرِ الْعَذَابِ قَدْ كُتِبَ فِي كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا سَطْرُ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ وَيْلٌ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ وَتَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ، فَكَانَ فِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ أَنَّ سُورَةَ الْعَذَابِ قَدْ يُكْتَبُ قَبْلَهَا: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ كَمَا يُكْتَبُ قَبْلَ سُورَةِ الرَّحْمَةِ.(شرح مشکل الآثار:۳/۴۱۱)

ترک تسمیہ پر دوسری توجیہ:

سورۂ براءت کے شروع حصہ میں مشرکین سے خطاب ہے،اور مشرکین رحمت کے مستحق نہیں ہیں اور نہ ہی مشرکین کے لئے نرم پہلو اختیار کرنا درست ہے، جب کہ وہ دشمنی اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے ہوں، اسی وجہ سے سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔

وَكَانَ آخَرُونَ يَقُولُونَ: إِنَّمَا تُرِكَ اكْتِتَابُ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ قَبْلَ سُورَةِ بَرَاءَةَ إِعْظَامًا لِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنْ خِطَابِ الْمُشْرِكِينَ بِهَا، .(شرح مشکل الآثار:۳/۴۱۱)

جب دونوں توجیہات کو رد کردیا گیا تو ہم حضرت عثمانؓ کے پہلے قول کی طرف رجوع کرینگے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوگیا اور سورۂ انفال و براءت کے ایک ہونے یا علیحدہ ہونے کی وضاحت نہیں فرمائی؛ اس وجہ سے دونوں سورتوں کے مضمون میں

مشابہت کی وجہ سے تھوڑی جگہ چھوڑ دی، تاکہ دونوں کے علیحدہ ہونے کا احتمال بھی باقی رہے۔

وَلَمَّا انْتَفَى هَذَانِ الْقَوْلَانِ الْآخَرَانِ وَلَمْ يَكُنْ فِي هَذَا الْبَابِ سِوَاهُمَا وَسِوَى الْقَوْلِ الْأَوَّلِ ثَبَتَ الْقَوْلُ الْأَوَّلُ، وَاللهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۱۲/۳)

اقوال المحدثین:

ابن عجلانؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سورۂ براءت سورۂ بقرہ کے قائم مقام ہے یا اس کے قریب قریب ہے اسی وجہ سے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہیں لکھی گئی۔

قال ابن عجلان: بلغني ان براءة كانت تعدل سورة البقرة او قربها، فلذلك لم تكتب البسملة. (عمدة القاری شرح صحیح البخاری: ۳۴۴/۱۸، مکتبة دار الکتب العلمیه، بیروت، لبنان)

اور علامہ عینیؒ نے اپنی کتاب ''عمدة القاری شرح صحیح البخاری'' میں ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں قرآن کو جمع کیا تو صحابہ کے مابین اختلاف ہوگیا، بعض نے کہا کہ سورۂ براءت اور انفال دونوں دو سورتیں ہیں، پھر دونوں کے درمیان تھوڑی جگہ چھوڑی گئی، تاکہ ان لوگوں کا قول بھی شامل ہو جائے جو یہ کہتے تھے کہ دونوں دو سورتیں ہیں، اسی بات کو حضرت خارجہ اور ابو عصمہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

فقيل لما كتب المصحف فى خلافة عثمان اختلفت الصحابة فقال بعضهم براءة والانفال سورة واحدة، فقال بعضهم هما سورتان، فترك بينهما فرجة لقول من لم يقل انهما سورة واحدة، به قال خارجة وابوعصمة وآخرون. (عمدة القاری شرح صحیح البخاری: ۳۴۴/۱۸، ط: بیروت، لبنان)

باب: ۲۱۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَتْرِ الْعَوْرَةِ

﴿اسلام میں ستر عورت کی اہمیت﴾

۱۳۸۱ - حَدَّثَنَا حُسَيْنُ بْنُ نَصْرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ يَزِيدَ بْنَ هَارُونَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا بَهْزُ بْنُ حَكِيمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، عَوْرَاتُنَا مَا نَأْتِي أَوْ مَا نَذَرُ؟ قَالَ: "احْفَظْ عَوْرَتَكَ إِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ أَوْ مِمَّا مَلَكَتْ يَمِينُكَ" قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِذَا كَانَ الْقَوْمُ بَعْضُهُمْ فِي بَعْضٍ قَالَ: "فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ لَا يَرَاهَا أَحَدٌ" قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِذَا كَانَ أَحَدُنَا خَالِيًا قَالَ: "فَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ يُسْتَحْيَا مِنْهُ مِنَ النَّاسِ". (شرح مشکل الآثار: ۳/۳۱۳، و سنن أبی داؤد: (۴۰۱۶)، وسنن الترمذی: (۲۷۶۹)، وسنن ابن ماجه: (۱۹۲۰)، ومسند أحمد: (۲۰۲۶)

خلاصۃ الحدیث:

عامۃً انسان سب سے زیادہ کامل اور خوبصورت مخلوق ہے، اس سے زیادہ کوئی خوبرو مخلوق دنیا میں نہیں، لیکن انسان کی زینت اور خوبصورتی اس کے لباس کی وجہ سے اور دوبالا ہوجاتی ہے، اس سے جہاں ستر عورت ہوتا ہے، وہیں اس کے حسن وجمال میں چار چاند لگ جاتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ کے احسانوں میں سے ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ اس نے بندوں کو پردہ کا حکم فرمایا ہے اور قرآن وحدیث میں متعدد مقام پر اس کی تاکید کی ہے اور اس کے فوائد کو بیان کیا ہے؛ چنانچہ پردہ عورت کی عزت وآبرو کا محافظ ہے، پردہ دلوں کی پاکیزگی اور طہارت کا ذریعہ ہے، لیکن یاد رہے کہ پردہ کا حکم صرف عورتوں کے ساتھ خاص نہیں؛ بلکہ مردوں کے لئے بھی ناف سے گھٹنے تک چھپانا لازم ہے، حتیٰ کہ تنہائی میں بھی ان اعضاء کو چھپانا ضروری ہے، جیسا

کہ حدیث الباب میں اس مسئلہ کو مزید واشگاف کیا گیا ہے۔

تعارض:

حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مردوں کو بیوی اور باندی کے سامنے ستر عورت کا حکم نہیں دیا ہے، جب کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل اس کے برحلاف ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے (عَنْ عَائِشَةَ، رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: "مَا رَأَيْتُ فَرْجَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطُّ") ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرمگاہ کو کبھی نہیں دیکھا، تو اس اعتبار سے حدیث الباب اور حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت میں تعارض ہوا!

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَحْظُرْ عَلَى الرِّجَالِ سَتْرَ عَوْرَاتِهِمْ مِنْ أَزْوَاجِهِمْ وَلَا مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ.

۱۳۸۳ - وَقَدْ حَدَّثَنَا بَكَّارُ بْنُ قُتَيْبَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُؤَمَّلُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: حَدَّثَنَا مَنْصُورُ بْنُ الْمُعْتَمِرِ، عَنْ مُوسَى قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَهُوَ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ يَزِيدَ الْأَنْصَارِيُّ ثُمَّ الْخَطْمِيُّ عَنْ مَوْلَاةٍ لِعَائِشَةَ عَنْ عَائِشَةَ، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: "مَا رَأَيْتُ فَرْجَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطُّ". (شرح مشکل الآثار:۴۱۴/۳)

دفع تعارض:

حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مردوں کو بیوی اور باندی کے سامنے بغیر پردہ کے رہنے کی اجازت دینا بر بنائے رخصت تھی، جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کا تعلق ہے تو یہ آپ کی عظمت شان اور حیاء کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کی وجہ سے تھا، اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی

ازواج مطہرات کے سامنے بھی پردہ کا خاص خیال رکھتے تھے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَكَانَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ مَا ذَكَرْنَاهُ عَنْهَا فِيهِ، وَذَلِكَ عِنْدَنَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنْ كَانَ فِي سُنَّتِهِ أَنَّ هَذَا غَيْرُ مَحْظُورٍ عَلَيْهِ تَرْكَهُ وَاسْتَعْمَلَ سُنَنَ نَفْسِهِ مِنْهُ، وَذَلِكَ لِمَا أَعْلَى اللّٰهُ مِنْ مَنْزِلَتِهِ وَرَفَعَ مِنْ قَدْرِهِ، وَجَعَلَ رُتْبَتَهُ الرُّتْبَةَ الْمُتَجَاوِزَةَ لِرُتَبِ سَائِرِ خَلْقِهِ سِوَاهُ... (شرح مشکل الآثار: ۴۱۵/۳)

اشکال:

حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت (میں نے آپ ﷺ کی شرمگاہ کو کبھی نہیں دیکھا) پر ایک شخص کا اشکال ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت کیسے قبول کی جاسکتی ہے؟ جب کہ اس کے برخلاف حضرت عائشہؓ ہی کی ایک روایت ہے جس سے آپ کا گھر میں بغیر کپڑے کے ہونا ثابت ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: "قَدِمَ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ الْمَدِينَةَ وَرَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَيْتِي، فَأَتَاهُ فَقَرَعَ عَلَيْهِ الْبَابَ، فَقَامَ إِلَيْهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرْيَانًا، وَاللّٰهِ مَا رَأَيْتُهُ عُرْيَانًا قَبْلَهُ فَقَبَّلَهُ وَاعْتَنَقَهُ". (شرح مشکل الآثار: ۴۱۵/۳)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ میرے حجرے میں تشریف فرما تھے کہ یکا یک زید بن حارثہ آئے اور انہوں نے دستک دی، تو آپ ﷺ بغیر کپڑے کے ہی ان کے پاس چلے گئے، آگے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں بخدا اس سے پہلے میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا۔

فَقَالَ قَائِلٌ: كَيْفَ تَقْبَلُونَ هَذَا عَنْ عَائِشَةَ وَأَنْتُمْ تَرْوُونَ وَعِنْدَكُمْ عَنْهَا مَا يُخَالِفُ ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۴۱۵/۳)

جواب:

امام طحاویؒ بڑے لطیف انداز میں مذکورہ اشکال کا جواب دے رہے ہیں، جس سے شاید ہی کوئی دقیقہ باقی رہے، فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کی ایک باندی کی روایت اور حضرت عروہ کی مذکورہ روایت کو ایک دوسرے کے خلاف سمجھا ہے، جب کہ حقیقتاً دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ حضرت عروہ کی روایت میں لفظ (عریاناً) ہے؛ لیکن ضروری نہیں کہ آپ مکمل بغیر کپڑے کے ہوں، جس میں ستر بھی ظاہر ہو بلکہ (عریاناً) کا اطلاق سترعورت کے علاوہ دیگر اعضاء کے ظہور پر بھی ہوتا ہے۔

دوسری توجیہ:

یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس تمام تر صفات حسنہ کو جامع ہے، جابجا قرآن کریم میں اس کی مدح سرائی کی گئی ہے، لہذا آپ ﷺ سے ایسے افعال کا صدور محال اور ناممکن ہے۔

فَكَانَ جَوَابُنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ أَنَّ حَدِيثَ عُرْوَةَ هَذَا عَنْ عَائِشَةَ غَيْرُ مُخَالِفٍ لِحَدِيثِ مَوْلَاتِهَا عَنْهَا الَّذِي ذَكَرْنَاهُ؛ لِأَنَّ الَّذِي فِي هَذَا إِخْبَارُهَا أَنَّهَا رَأَتْهُ عُرْيَانًا، وَقَدْ يَكُونُ ذَلِكَ مِنْهُ عُرْيًا لَيْسَ فِيهِ انْكِشَافُ عَوْرَةٍ وَأَطْلَقَتْ عَلَيْهِ فِيهِ الْعُرْيَ؛ لِأَنَّ أَكْثَرَ بَدَنِهِ كَانَ كَذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار:۳/۲۱۶)

باب: ۲۱۷

بَابُ طَلَاقِ الرِّجَالِ نِسَاءَهُمُ اللَّاتِي يُكْرِهُهُنَّ آبَاؤُهُمْ بِذَلِكَ، هَلْ ذَلِكَ مِمَّا عَلَيْهِمْ فِي بِرِّ آبَائِهِمْ أَمْ لَا؟

﴿والدین کے حکم پر اولاد کا اپنی بیوی کو طلاق دینا﴾

عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ السُّلَمِيِّ، قَالَ: إِنَّ رَجُلًا مِنَّا أَمَرَتْهُ أُمُّهُ أَنْ يَتَزَوَّجَ، فَلَمَّا تَزَوَّجَ أَمَرَتْهُ أَنْ يُفَارِقَهَا، فَارْتَحَلَ إِلَى أَبِي الدَّرْدَاءِ فَسَأَلَهُ عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ: مَا أَنَا بِالَّذِي آمُرُكَ أَنْ تُطَلِّقَ

، وَمَا أَنَا بِالَّذِي آمُرُكَ أَنْ تُمْسِكَ، سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "الْوَالِدَةُ أَوْسَطُ بَابِ الْجَنَّةِ فَاحْفَظْ ذٰلِكَ الْبَابَ أَوْ ضَيِّعْهُ" أَوْ كَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، الشَّكُّ مِنَ ابْنِ مَرْزُوقٍ. (شرح مشکل الآثار: ۴۱۷/۳، ح:۱۳۸۵)

خلاصۃ الحدیث:

یقیناً والدین انسان (اولاد) کے لئے دنیا میں آنے کے ذریعہ ہیں، ہمارا وجود والدین ہی کی وجہ سے ہے، اس لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے پہلے والدین کی اطاعت وفرماں برداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی تلقین کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ [اسرای:۲۳] (اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو)۔

الغرض آیت قرآنیہ اور حدیث الباب سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد اولاد کے حق میں والدین کا مقام سب سے برتر اور بلند ہے، لہذا ان کی اطاعت وفرماں برداری نہایت ضروری ہے، لیکن یہاں سوال یہ کہ کیا والدین کے ہر حکم کو بجالانا اولاد پر ضروری ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟

اس سلسلہ میں امام طحاویؒ نے حضرت ابودرداءؓ کی حدیث (رائے) کو اولاً پیش کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابودرداءؓ سے استفسار کیا کہ میری والدہ نے مجھے نکاح کا حکم دیا تو میں نے نکاح کیا، نکاح کے بعد پھر والدہ نے اس کو اپنے نکاح سے علاحدہ (طلاق) کرنے کا حکم دیا (ایسی صورت میں کیا کروں، طلاق دوں یا نہ دوں؟) حضرت ابودرداءؓ نے کہا کہ نہ میں تم کو طلاق دینے کا حکم دے سکتا ہوں اور نہ اپنے نکاح میں باقی رکھنے کا، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ والدہ جنت کا درمیانی دروازہ ہے، لہذا اس دروازہ کی حفاظت کریں، یا اس کو ضائع کریں۔

یہاں امام طحاویؒ نے حضرت ابو درداء کی رائے پیش کرنے کے بعد جو بات لکھی ہے وہ قابل غور ہے، کہ حضرت ابو درداءؓ نے مذکورہ مسئلہ کو کوئی قطعی جواب نہیں دیا کہ آیا وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے یا اپنے نکاح میں رکھے، اس لئے اس پہلو سے وضاحت ضروری ہے کہ آیا والدین کے حکم کی بجا آوری کب ضروری ہے، اور کب ضروری نہیں ہے؟

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَوَقَفْنَا بِذَلِكَ عَلَى أَنَّ أَبَا الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَشْكَلَ عَلَيْهِ الْجَوَابُ فِيمَا سُئِلَ عَنْهُ مِنْ هَذَا. فَكَانَ جَوَابُهُ فِي ذَلِكَ جَوَابًا لَمْ يُقْطَعْ فِيهِ شَيْءٌ مِنْ إِمْسَاكٍ، وَمِنْ فِرَاقٍ فَنَظَرْنَا هَلْ رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ فِيهِ حَقِيقَةُ الْوَاجِبِ فِي هَذَا الْمَعْنَى مَا هِيَ؟ (شرح مشکل الآثار: ۴۱۷/۳-۴۱۸)

چنانچہ اس کے تحت امام طحاویؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث کو ذکر کیا ہے جس سے مذکورہ مسئلہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

عَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: كَانَتْ عِنْدِي امْرَأَةٌ أُحِبُّهَا وَكَانَ أَبِي يَكْرَهُهَا فَأَمَرَنِي أَنْ أُطَلِّقَهَا، فَأَبَيْتُ فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "يَا عَبْدَ اللَّهِ طَلِّقِ امْرَأَتَكَ" فَطَلَّقْتُهَا. (شرح مشکل الآثار: ۴۱۸/۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی، میں اسے بہت پسند کرتا تھا، لیکن میرے والد اسے ناپسند کرتے تھے، اس لئے انہوں نے مجھے اس کو طلاق دینے کا حکم دیا، لیکن میں نے انکار کیا (یعنی میں نے طلاق نہیں دی) البتہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابن عمر! اپنی بیوی کو طلاق دیدو (یعنی اپنے والد کا کہنا مانو) اس لئے میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث سے یہ بات عیاں ہوئی کہ والد کا بیٹے پر یہ حق ہے کہ

جب والد کوئی حکم کرے تو وہ اس کو بجالائے، اور جب بیٹے پر والد کا یہ حق ہے تو والدہ کا بیٹے پر اس سے زیادہ اوجب اور الزم حق ہوگا، کیوں کہ بیٹے پر والد سے زیادہ والدہ کا حق ہے۔

فَكَانَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ مَا قَدْ دَلَّ أَنَّ مِنْ حَقِّ الْوَالِدِ فِي هَذَا عَلَى ابْنِهِ إِجَابَتَهُ أَبَاهُ إِلَى مَا يَسْأَلُهُ إِيَّاهُ مِنْ هَذَا, وَإِذَا كَانَ ذَلِكَ مِنْ حَقِّ الْوَالِدِ عَلَى وَلَدِهِ كَانَ مِنْ حَقِّ وَالِدَةٍ عَلَى وَلَدِهَا أَوْجَبَ, وَلِوَلَدِهَا أَلْزَمَ; لِأَنَّ حَقَّ الْوَالِدَةِ عَلَى الْوَلَدِ يَتَجَاوَزُ حَقَّ الْوَالِدِ عَلَيْهِ وَسَيَجِيءُ بِذَلِكَ مَنْصُوصًا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَوْضِعِهِ فِيمَا بَعْدُ مِنْ كِتَابِنَا هَذَا إِنْ شَاءَ اللَّهُ. (شرح مشکل الآثار: ۴۱۹/۳)

البتہ اخیر میں امام طحاویؒ نے اس امر کو واشگاف کردیا کہ گرچہ والد کی اطاعت بیٹے پر ضروری ہے؛ مگر جہاں والد کی اطاعت میں معصیت الٰہی لازم آئے وہاں اطاعت اور حکم بجالانا ضروری نہیں، ہاں! البتہ جہاں والد کی اطاعت میں اللہ کی نافرمانی لازم نہ آئے وہاں والد کی اطاعت ضروری ہے۔

چنانچہ امام طحاویؒ لکھتے ہیں:

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَالَّذِي يُؤْمَرُ بِهِ الْوَلَدُ فِي هَذَا غَيْرُ مُبِيحٍ لَهُ فِيهِ طَلَاقَ زَوْجَتِهِ فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي نَهَاهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ عَنْ طَلَاقِهَا فِيهِ, وَإِنَّمَا هُوَ طَلَاقُهُ إِيَّاهَا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي أَبَاحَ اللهُ الطَّلَاقَ فِيهِ لَا فِي ضِدِّهِ وَاللهَ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۴۱۸/۳)

اقوال المحدثین:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ رقم طراز ہیں کہ والدین کے حکم کی اطاعت اولاد پر ضروری ہے، بشرطیکہ اس میں شریعت کی مخالفت لازم نہ آئے۔

أن اطاعة الوالدين فيما لا يخالف الشرع واجبة. (الكوكب الدرى، ابواب الطلاق واللعان: ج:٣، ص:٢٢٨)

اسی طرح ملا علی قاریؒ نے فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "ولاتعقن والديك وان أمراك أن تخرج من اهلك ومالك" کے تحت لکھا ہے کہ جب تک گناہ کا موجب نہ ہو اس وقت تک والدین (دونوں یا ایک) کی اطلاع ضروری ہے، کسی کی نافرمانی درست نہیں، ہاں! اللہ کی نافرمانی کی صورت میں ان کی اطاعت ضروری نہیں۔

أى لاتخالفهما أو احدهما فيما لم يكن معصية إذ لا طاعة لمخلوق فى معصية الخالق. (مرقاة المفاتيح: ج:١، ص:٢٢٢، المكتبة التهانويه، بديوبند)